آنچ

(ایک دل گداز سماجی ناول)

رئیس احمد جعفری

مقبول اکیڈمی سرکلر روڈ۔ چوک انارکلی لاہور

1999ء

جملہ حقوق محفوظ ہیں

اہتمام

ڈاکٹر ظفر مقبول

مقبول اکیڈمی

۱۹۹۔ سرکلر روڈ۔ چوک انارکلی لاہور

قیمت 200 روپے

مطبع: خورشید مقبول پریس لاہور

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانہ کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

جعفری صاحب کے ناول ملک میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں، قدر دان، پروانہ وار ان پر گرتے ہیں اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتے ہیں۔

یہ ناول جسے شائع کرنے کا ہمیں موقع ملا ہے، جعفری صاحب کے ناولوں میں ایک خاص امتیاز کا حامل ہے، اس کا اتار چڑھاؤ اس کی زبان، اس کا بیان، اس کے کردار، اس کے واقعات ہر چیز میں ندرت اور دلکشی ہے، ایک باب ختم کرنے کے بعد دوسرا باب شروع کئے بغیر طبیعت نہیں مانتی یہاں تک کہ ایک ہی نشست میں سارا ناول ختم کئے بغیر قرار نہیں آتا۔

یہ ناول ہماری روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھتا ہے، اس کے کرداروں میں ہماری آپ کی زندگی جھلکتی ہے، اس کے واقعات وہی ہیں جو ہماری سوسائٹی کے روزمرہ کے واقعات ہیں، حقیقت یہ ہے کہ خیالی داستانوں میں وہ لطف نہیں جو خود ہماری زندگی ہر روز پیش کرتی رہتی ہے، یہ ناول ہماری روزمرہ کی زندگی کی داستان ہے پُر معنی بے انتہا دلچسپ، سبق آموز اور لرزہ خیز!

ناشر

قیدِ حیات و بندِ غم

"ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا

(۱)

شہر فیض پور کے قریب ایک خوبصورت سا قصبہ فیروز آباد، شیخ محسن علی یہاں کے رئیس اعظم تھے، لیکن بال بال قرض میں بندھا ہوا تھا، ساری زندگی اتنے عیش و نشاط میں بسر کر دی کہ اپنے پس ماندگان کے لئے جو پونجی چھوڑ گئے وہ تھی غربت اور عسرت و فلاکت،

محسن علی کا انتقال ہو گیا ——— موت سے کس کو رستگاری ہے،! لیکن شیخ صاحب بہت بعد از وقت مرے، ان کے سعادت مند بیٹوں کو بجا طور پر ان کی طویل زندگی سے شکایت تھی، اگر ۸۰ برس کے بجائے پچاس سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو جاتا تو ورثہ میں بھیک کی ٹھیکری نہ ملتی، روپیہ ملتا، باغ ملتے، زمین ملتی، جائیداد ملتی، مکان ملتے، دوکان ملتی، لیکن اسّی برس تک زندہ رہ کر انہوں نے، سارے گھر پر جھاڑو پھیر دی۔ حد یہ ہے کہ آنکھوں میں موتیا اتر آیا، پاؤں میں دم نہ رہا، ہاتھوں میں رعشہ آگیا، لیکن نہ ان کی تماش بینی میں فرق آیا، نہ مجلس آرائی میں، نہ داد و دہش میں، نہ فیاضی اور سخاوت میں، باغ کی فصل بکی، انہوں نے منّی جان کے ایک جان نواز تبسم پر ——— موتیا کی وجہ سے جب تبسم کو وہ چشمِ بینا کے بجائے صرف چشمِ تصور ہی سے دیکھ سکتے تھے ——— قربان کر دی، زمین کا مالیانہ آیا تو دیگیں چڑھ گئیں، پلاؤ پک رہا ہے، قورمہ گھوٹا جا رہا ہے، فیرنی تیار ہو رہی ہے

اور دوست احباب مکھیوں کی طرح بھنک رہے ہیں، جب تک روپیہ رہا دوستوں نے خوب خوب تر مال اُڑایا، جب ختم ہوا، تو وہ بھی کھسک گئے، حد یہ ہے کہ جب ضرورت ہوتی بے دھڑک مہاجن اور ساہوکار سے تمسک لکھ کر قرض لے لیتے، اور ذرا نہ سوچتے اصل کہاں سے دیں گے، اور سود کہاں سے ادا کیا جائے گا؟

جس دن شیخ محسن علی کا انتقال ہوا، فیروز آباد میں صفِ ماتم بچھ گئی، کون آنکھ تھی جو اس غم میں اشک بار نہ ہو؟ بہت سے غریب اور مفلس تھے جو اس در پر آئے تھے، جو مانگتے تھے پاتے تھے، اب کس سے مانگیں گے، کون دے گا؟ بہت سے بے فکرے تھے جنہیں وعدۂ فردا پر شیخ صاحب سے قرض وصول کر لینے میں کمال حاصل تھا، مگر یہ فردا کبھی امروز سے نہ بدلا، نہ شیخ صاحب نے تقاضہ کیا، نہ اُنہیں یاد آیا کہ قرض ادا کرنا ہے، کئی کسان اور کاشت کار ایسے تھے۔ جو دینے کے بجائے شیخ صاحب سے کچھ نہ کچھ آئندہ فصل کے وعدے پر وصول ہی کر لیتے تھے، اور سب سے بڑھ کر منّی جان کا سارا کنبہ تھا۔ جس کے تمام ضروریات کی کفالت شیخ صاحب اس طرح کرتے تھے کہ کیا مجال ہے، کبھی بڑے سے بڑے مطالبہ پر پیشانی شکن آلود بھی ہوئی ہو،

آج یہ سب رو رہے تھے، سچے دل سے رو رہے تھے، ان کا بہت بڑا سرمایہ ان سے چھن گیا تھا۔

ان رونے والوں میں شیخ صاحب کے فرزند دلبند و ارجمند امجد، احمد اور صمد بھی تھے ـــــ لیکن انہیں رونا اس پر نہیں آ رہا تھا کہ شیخ صاحب مرے کیوں؟ اس پر آ رہا تھا کہ اتنی دیر کر کے کیوں مرے؟

بھلا، امجد کے غم و غصہ کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے، باپ کی مرگِ ناگہاں کے انتظار میں زندگی کی پچپن بہاریں گزار دیں، لب گور پہنچ گئے، باپ کی لاش سامنے پڑی تھی، اور امجد کو افسوس ہو رہا تھا کہ کاش وہ مسلمان نہ ہوتا، تو آج دفن کرنے کے بجائے شیخ صاحب کی لاش پر تیل چھڑک کر

آگ لگا دیتا، بد نام بھی نہ ہوتا، اور دل کی بھڑاس بھی نکل جاتی۔

تقریباً یہی کیفیت احمد کی تھی، وہ بچاس کے پیٹے میں تھا، بوڑھے باپ کا بوڑھا بیٹا، اب زندگی میں باقی کیا رہ گیا تھا، ولولہ اور امنگ کا زمانہ ختم ہو چکا تھا، مُنّی جان کو دیکھ کر کیسے کیسے طوفان اس کے دل میں اٹھا کرتے تھے کہ جب ابا جان اس دنیا سے رخصت ہوں گے، تو ایسی ایسی نہ جانے کتنی مُنّی میرے قدموں پر آکر گرا کریں گی ـــــ لیکن اب، کیا اب بھی یہ ممکن تھا؟ اب تو لوگ بھی کہیں گے بوڑھے منہ مہاسے، لوگ چلے تماشے،

صمد کی عمر ۴۵ سال کی تھی، وہ بھی باپ کے مرنے سے کچھ زیادہ رنجیدہ نہ تھا، لیکن خوش بھی نہ تھا، شیخ صاحب اگر ابھی چند سال اور زندہ رہتے تو اُسے کوئی اعتراض نہ ہوتا، تشریف لے گئے تو مشیتِ الٰہی کے سامنے سر جھکا دینے کے سوا کیا چارہ تھا؟"

(۲)

شیخ صاحب کی تجہیز و تکفین کے بعد تینوں بھائی آکر، گھر کے بڑے کمرہ میں بیٹھ گئے، امجد ان سب میں زیادہ کاروباری تھا، اس نے دونوں بھائیوں کو مخاطب کیا،

"ہمیں آپس میں تصفیہ کر لینا چاہیئے!"

احمد گویا یہ بات سننے کا منتظر ہی تھا، اُس نے کہا۔

"اور ہم بیٹھے کس لئے ہیں؟"

پھر دونوں نے صمد کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا، گویا پُوچھ رہے تھے۔ تم کیوں خاموش ہو، صمد نے کہا۔

"اگر آپ دونوں کی یہی رائے ہے تو مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے؟ کر لیجئے تصفیہ!"

امجد نے جواب میں کہا۔

"سب سے پہلے ہمیں مالیت کا اندازہ کر لینا چاہیئے، یہ مکان جس میں ہم بیٹھے ہیں، چالیس ہزار کا ہے، دوسرا مکان جو اس سے چھوٹا ہے، اور کرایہ پر تھا، مگر اب خالی ہے، پندرہ ہزار روپے کا ہے، آم کے دونوں باغوں کی قیمت کسی طرح تیس ہزار سے کم نہیں، چار دکانیں ہیں، جن میں سے دو خالی ہیں، دو کرایہ پر اٹھی ہوئی ہیں، ان کی قیمت بیس ہزار ہونی چاہیئے۔

۔یہاں جو زمین ہے اس کی مالیت پچیس ہزار روپے ہے۔ رحمت پور میں جو زمین ہے، وہ پندرہ ہزار سے زیادہ کی نہیں! ___"
احمد نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔
"نہیں بھائی صاحب، وہ بھی کسی طرح پچیس ہزار سے کم نہیں!"
امجد کو غصہ آگیا!
"میں جھوٹ بول رہا ہوں۔"
احمد کیوں دبتا؟ اس نے بھائی کے الزامی سوال کو تسلیم کرلیا، اور ذرا اکڑ کر کہا۔
"لیکن میں سچ بول رہا ہوں!"
احمد کے یہ تیور دیکھ کر امجد نرم پڑ گیا، بولا۔
"اچھا! پچیس ہزار سہی ___ نقد روپیہ کتنا ہوگا؟"
احمد نے بے پروائی سے جواب دیا۔
"میں کیا جانوں، ابا میاں کے کمر بند سے کنجی آپ نے جھپٹی تھی، تجوری سامنے موجود ہے، کھول کر دیکھ لیجئے، ابھی معلوم ہو جائے گا!"
معقول تجویز تھی، امجد نے تجوری کھولی، تو تین ہزار روپے نقد برآمد ہوئے۔ امجد نے کہا۔
"تو اس کے معنی یہ ہیں، نقد اور املاک ملا کر ابا میاں نے ڈیڑھ لاکھ سے کچھ زیادہ ہی کا اثاثہ چھوڑا ہے!"
احمد کو اتنے کی بھی توقع نہیں تھی، اس نے خوش ہو کر کہا۔
"ہاں اور کیا؟"
صمد نے پوچھا،
"پھر اب اس کی تقسیم کس طرح کی جائے گی؟"
احمد نے لقمہ دیا۔
"لیکن تقسیم سے پہلے ایک سوال اور بھی تو طے کرنا ہے؟"
امجد چونک پڑا۔

"وہ کیا سوال ہے؟"

احمد نے بتایا۔

"خدا بخشے آبا میاں مقروض بھی تو تھے، ان کا قرض کس طرح ادا ہوگا؟ یہ مہاجن اور ساہوکار معاف کرنے والی آسامی تو ہیں نہیں ــــ!"

امجد سوچ میں پڑ گیا، پھر جیسے دُور کی کوڑی لاتے ہوئے کہا۔

"یہ کوئی مشکل سوال نہیں ہے، سب کچھ ہم برابر تقسیم کئے لیتے ہیں۔ کچھ ہم میں سے ہر ایک بہ حصّہ مساوی آبا میاں کے قرض کا ذمہ دار بن جائے۔"

امجد نے جرح کی۔

"یہ کیسے مان جائیں گے وہ لوگ ــــ؟"

امجد کو غصّہ آتے آتے رہ گیا۔

"کیوں نہیں مانیں گے، ارے بھئی ہم میں سے ایک قرض کی جو رقم اس کے حصّہ میں آئے گی، اس کا ایک نیا پرونوٹ لکھ کر مہاجن کو دے گا، اسے سود ملتا رہے گا۔ تو وہ اس پر کیوں ضد کرنے لگا کہ نہیں میں تو ابھی نقد لوں گا؟"

احمد یہ تجویز سُن کر پھڑک گیا۔

"بھائی صاحب بات تو بڑی معقول ہے، اس طرح ہمیں ذرا سنبھلنے کا موقع بھی مل جائے گا، آبا میاں، خدا بخشے اس طرح غارت کر گئے ہیں سب کچھ پنپنے میں کافی دیر لگ جائے گی۔"

امجد کو جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کا موقع مل گیا۔

خود زندگی بھر موج اُڑاتے رہے، ہمارے لئے یہ کھنڈر، اور یہ خراب خستہ زمین اور باغ چھوڑ گئے ہیں ــــ ہمارے دیکھتے دیکھتے کتنی چیزیں بک گئیں!"

احمد نے اضافہ معلومات کی غرض سے بتایا۔

"بک گئیں؟ ــــ صرف بکیں؟ اور جو کچھ منی جان کے ہتھے چڑھا۔

ذرا اس کا حساب تو لگا یئے!"

امجد نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"چھوڑو ان باتوں کو تکلیف ہوتی ہے اس ذکر سے! ـــــ ہاں تو یہ بتاؤ، ابا میاں پر قرض کتنا ہوگا ـــــ میرے خیال میں پانچ چھ ہزار تو ہوگا؟"

احمد نے کوئی جواب نہیں دیا مسکرانے لگا، امجد نے پوچھا۔

"مسکرا کیوں رہے ہو، اچھا تو ہزار دو ہزار ہوگا ـــــ یہ بھی مفت کا جرمانہ بھگتنا پڑا ہے، ہم لوگوں کو۔"

صمد نے کہا۔

اگر ہزار دو ہزار ہے تو پھر نقد دے کر معاملہ ختم کر دینا چاہیئے۔ کیوں نئے پرونوٹ لکھے جائیں، اور خواہ مخواہ ایک بوجھ سر پر لاد لیا جائے!"

احمد ہنسنے لگا۔

ابا میاں جو قرض چھوڑ گئے ہیں وہ نہ ہزار دو ہزار ہے۔ نہ پانچ چھ ہزار وہ ہے سود سمیت چالیس ہزار۔"

"چالیس ہزار؟" بے ساختہ امجد کے منہ سے نکلا۔

"چالیس ہزار!" صمد یہ الفاظ دہرا کر رہ گیا۔

پھر کمرہ پر سناٹا چھا گیا، باپ کے مرنے کا کسی کو غم نہیں، اگر کچھ تھا تو صمد کو، لیکن اس سانحہ نے صفِ ماتم بچھا دی، غضب خدا کا چالیس ہزار ـــــ اتنی بڑی رقم!"

امجد کے زرخیز دماغ نے ایک پہلو اس مسئلہ کو حل کرنے کا پیدا کیا۔

"اگر ہم انکار کر دیں؟"

احمد نے دریافت کیا۔

"کاہے سے انکار کر دیں؟"

امجد نے بتایا۔

"اس قرض سے اور کاہے سے ـــــ؟"

صمد نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

ہاں ہم یہ کر تو سکتے ہیں۔"
امجد اور احمد دونوں کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا صمد نے بات پوری کی۔
"لیکن مہاجن کھڑے کھڑے مکان، زمین، دکان، باغ سب کچھ نیلام کرا دے گا!"
امجد کو غصہ آگیا،
"مذاق ہے نیلام کرا دے گا؟ —— ہم کہہ دیں گے یہ جھوٹا ہے!"
"لیکن وہ ابا میاں کی تحریر پیش کر دے گا!"
"وہ جعلی ہے!"
"وہ گواہ بھی پیش کر دے گا۔"
"وہ جھوٹے ہیں، ہمارے دشمن اور بدخواہ ہیں!"
"لیکن گواہ تو میں بھی ہوں، احمد بھائی بھی، اور آپ بھی!"
"کیا ہم اپنے خلاف گواہی دینے کھڑے ہو جائیں گے؟"
"کم از کم میں جھوٹ تو نہیں بول سکتا، بات اگر پنچایت میں گئی یا عدالت میں پہنچی تو ضرور اقرار کر لوں گا۔
امجد پر اوس پڑ گئی، سارا جوش اور جذبہ کافور ہو گیا۔
"ہاں بھئی، جب گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے تو کوئی کیا کر سکتا ہے؟ میاں صمد جانتے ہو تم کون ہو؟"
صمد نے جواب نہ دیا، لیکن امجد کو دیکھنے لگا، امجد نے کہا۔
"پورس کے ہاتھی —— تم پورس کے ہاتھی ہو —— عقل کے دشمن چالیس ہزار روپے مفت کے ہیں جو ہم مہاجن کو دے دیں؟"
صمد نے نہایت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ کہا،
"لیکن مہاجن کے پاس بھی تو مفت کے نہیں تھے، جو وہ واپس نہ لے!"
امجد جل گیا،
"بھاڑ میں جاؤ —— خبر ہٹاؤ اس جھگڑے کو، اب یہ بتاؤ کہ جائداد کی تقسیم کس طرح ہو گی؟"

احمد نے ازراہِ سعادت مندی جواب دیا۔
"جس طرح آپ چاہیں ــــ بہرحال سب کو برابر حصّہ ملنا چاہیئے!"
امجد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
"ہم سب کے حصّہ میں تقریباً پچاس ہزار روپے کی مالیت آتی ہے۔
کیوں بھئی ٹھیک ہے نا؟"
احمد نے تائید کی،
"جی بالکل ٹھیک ہے!"
امجد نے تقسیم کا فارمولا پیش کر دیا۔
"یہ بڑا مکان جس میں ہم بیٹھے ہیں، مجھے تو نہیں چاہیئے، مَیں تو فیروز آباد میں رہتا بھی نہیں، ابّا میاں کی حرکتوں سے تنگ آ کر رحمت پور اپنی سسرال میں رہ رہا ہوں کئی سال سے!"
احمد نے کہا۔
"مجھے بھی نہیں چاہیئے، اتنا بڑا مکان لے کر میں کیا کروں گا، وہ دوسرا والا مکان مجھے دے دیجئے!"
امجد نے صمد کی طرف دیکھا،
"کیوں بھائی کیا رائے ہے؟"
اس نے کہا۔
"ٹھیک ہے، یہ بڑا مکان میں لے لوں گا، دوسرا والا احمد بھائی لے لیں گے!"
امجد نے اطمینان کا سانس لیا!
"چلو بھئی، مکانوں سے نجات ملی ــــ اب رہ گئیں دوکانیں، ان کا کیا ہوگا؟ اپنے بارے میں کہے دیتا ہوں، مجھے ایک دوکان بھی نہیں چاہیئے، میں رحمت پور تو انہیں لے نہیں جاؤں گا، تم دونوں کیوں نہ دو دو دوکانیں لے لو؟"
احمد اور صمد دونوں اس تجویز پر راضی ہو گئے۔

امجد نے حساب لگاتے ہوئے کہا۔

" اسی طرح تم دونوں کے پاس پچھتر ہزار روپیہ پہنچ گیا، پندرہ ہزار کا ایک باغ لے لو، تین ہزار نقد ہیں، میں اس میں سے بھی کچھ نہیں لیتا، تم ہی دونوں لے لو ـــــ حساب کتاب برابر!"

احمد نے ذرا بگڑے ہوئے لہجہ میں کہا۔

" واہ بھائی صاحب اچھا حساب کتاب برابر کیا آپ نے، ابھی آٹھ ہزار ہم دونوں کو اور چاہئیں!"

امجد کی تیوری پر بل پڑ گئے،

" بڑے بننے ہو!"

احمد نے جواب دیا،

" نہیں بھائی صاحب، بخشش سَو سَو، حساب جو جو!"

امجد نے درشت لہجہ میں کہا۔

" بہت اچھا جناب، آٹھ ہزار کا تمسک لکھوا لیجئے، زندہ ہوں، تو ادا کردوں گا جلد ہی، اب رہی رحمت پور اور فیروز آباد کی زمین اور دوسرا باغ، اس سے تم دونوں دستبرداری لکھ دو!"

احمد نے ایک متبادل تجویز پیش کی۔

" ایسا کیوں نہ کیجئے کہ دوسرا باغ بھی ہمیں دے دیجئے، اور سات آٹھ ہزار کا تمسک ہم سے لکھوا لیجئے!"

امجد کی آنکھوں میں خون اُتر آیا، اس کا بس چلتا تو اس وقت احمد کی گردن اڑا دیتا، لیکن موقع جنگ و پیکار کا نہیں، صلح و آشتی کا تھا، اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

احمد میاں، تم تو خواہ مخواہ بدظنی سے کام لیتے ہو، بڑا بھائی باپ کے برابر ہوتا ہے، اس طرح کی باتیں کرکے میرے دل کو صدمہ نہ پہنچاؤ، مجھ سے تمسک لکھوا لو، میں ایک ایک پائی ادا کردوں گا!"

احمد نے صمد کی طرف دیکھا۔

"کیا رائے ہے؟"

وہ بولا،

"بات بڑھانے سے کیا حاصل؟ تمسک لکھوا لیجئے!"

احمد راضی ہوگیا، لیکن ایک شرط کے ساتھ۔

"یہ ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار جو ہمیں ملے ہیں، میں اپنا حصّہ تمہیں دیتا ہوں۔ پورے تین ہزار تم لے لو۔"

"میں لے لوں؟ (حیرت کے ساتھ) یہ کیوں؟ اور آپ؟"

"سنو تو ـــــ یہ بڑا مکان تمہارے حصّہ میں آگیا، بھائی صاحب آٹھ ہزار کا تمسک دیں گے، وہ بھی تمہارا ـــــ سب مالیت کتنے کی ہوئی؟"

امجد نے فوراً حساب لگایا۔

"اکیاون ہزار!"

احمد نے پوچھا۔

"گویا ایک ہزار زیادہ!" ـــــ خیر کوئی حرج نہیں، اس رقم کا پرونوٹ لکھ دو، جب سہولت ہو دے دینا!"

صمد نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"لیکن بھائی صاحب میں تو اس طرح بہت خسارہ میں رہوں گا؟"

"کیوں بھائی خسارہ کیسا؟"

"یہ اتنا بڑا مکان میرے کس کام کا؟ اس کی مرمت کے لئے کم از کم پانچ ہزار چاہئیں، دو دکانیں آپ نے لے لیں، باغ بھی آپ نے لے لیا، میرے حصّہ میں کیا آیا؟ یہ عالی شان کھنڈر، یا بھائی صاحب (امجد) کا تمسک!"

"اور وہ تین ہزار نقد بھول گئے؟"

"تو بھی یہ تقسیم غلط ہے، میں اسے کیسے مان لوں؟"

"ویسے تو بڑے نیک اور سیدھے بنتے ہو، لیکن بے ایمانی کرتے میں بڑے چست ہو، جو بات طے ہو چکی اُسے پھر سے اُٹھانا کیا معنی؟"

امجد نے بھی احمد کی تائید کی۔

"ہاں صمد یہ ٹھیک نہیں تم مان چکے ہو کہ بڑا مکان تم لے لوگے، اس کے بعد تمہارے حصّہ میں دس ہزار رہ جاتے تھے، لیکن گیارہ ہزار مل گئے، آٹھ ہزار تمسک کے تین ہزار نقد۔"

احمد نے صمد کی پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے محبت سے کہا۔

"اچھا صمد ایک ہزار روپیہ جو تم پر باقی رہتا ہے، وہ میں نے معاف کیا۔"

امجد اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"واہ بھائی وہ، شاباش ——— صمد اب نہ کہنا کچھ!"

لیکن صمد نے کہا۔

"مجھے دوکان ضرور چاہیئے، خالی مکان لے کر کیا کروں گا؟"

احمد نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا بھائی ایک خالی دوکان تمہیں کرایہ پر دے دیں گے اور دوسروں سے بیس روپیہ ماہوار لیتے ہیں، تم سے پندرہ سہی!"

صمد خاموش ہوگیا۔ ———

مجلس برخاست ہوگئی ———!

(۳)

دوسرے روز گاؤں اس زبانی قرارداد کی تحریری تکمیل ہو گئی، جو کچھ جس کے حصہ میں آیا تھا۔ وہ باقاعدہ اس کا مالک بن گیا۔

سب سے زیادہ فائدہ میں امجد رہا، ایک بڑا باغ اور زمین کے دو زرخیز ٹکڑے فیروز آباد اور رحمت پور میں اس کے ہاتھ لگے، احمد بھی فائدے میں رہا، چاروں دوکانوں کا مالک بن گیا، ضرورت کے مطابق اچھا خاصا مکان بھی ہاتھ آ گیا، اور ایک باغ بھی قبضہ میں آ گیا۔

سچ پوچھئے تو گھاٹے میں صمد رہا، اس بیچارے کے حصہ میں اتنی بڑی حویلی کہ اُسے سنبھالنا اس کے بس سے باہر تھا، وسیع اور کشادہ دو منزلہ مکان، ساتھ میں، ایک خانہ باغ بھی، باغ کے اندر ایک بارہ دری بھی، اگر یہ مکان فیروز آباد جیسے قصبہ میں نہ ہوتا، کسی بڑے شہر میں ہوتا تو اس کی مالیت ڈیڑھ لاکھ سے کم نہ تھی لیکن فیروز آباد میں یہ پچیس ہزار کا بھی مہنگا تھا، مکان کے علاوہ تین ہزار روپے نقد آئے، اور آٹھ ہزار کا تمسک، وہ سمجھتا تھا، ردّی کاغذ سے زیادہ اس کی کوئی قیمت اور وقعت نہیں۔

امجد کاغذات کی تکمیل کرتے ہی رحمت پور واپس چلا گیا، احمد اپنے حصہ کے گھر میں منتقل ہو گیا، صمد وہیں رہا، جہاں بچپن سے رہتا چلا آ رہا تھا دونوں بھائیوں میں زیادہ نیک اپنے نفس، اور مرنجان مرنج یہی تھا، ورنہ

بڑے بھائی امجد کی خو یہ تھی کہ وقت پر گدھے کو باپ بنا لینے میں تامل نہ کرتا تھا۔ اور وقت نکل جانے کے بعد شبیر کو بلی سے زیادہ حیثیت نہیں دیتا تھا، خود غرضی اور مفاد پرستی میں احمد گو اس سے کم تھا۔ لیکن بہرحال ایک خاصا مقام رکھتا تھا، چنانچہ والد ماجد کے انتقال پُر ملال کے بعد جب تقسیم وراثت کا مسئلہ در پیش ہوا تو امجد اور احمد تو سب کچھ لے گئے، مگر بیچارے صمد کے حصہ میں کفِ افسوس، داغِ حسرت اور وعدہ فردا کے سوا کچھ نہ آیا۔

امجد کو لوگ زن مرید کہتے تھے، وہ تھا بھی اسی قماش کا آدمی، اس نے کبھی خدا کے سامنے بھی سر نہیں جھکایا، لیکن مریم (بیوی) کے سامنے کبھی سر اٹھا کر بات نہ کر سکا، صرف ایک لڑکا تھا، نسیم عمر ۲۲ سال کے لگ بھگ خوبصورت، طرحدار، تیز طرار علم سے نفور، جہالت سے چور شراب کا عادی جوئے کا رسیا، ریس کا شوقین، امجد نے بہت کوشش کی کہ لڑکا پڑھ لکھ جائے، لیکن مریم نے صرف یہی چاہا کہ وہ خوش رہے، اور موٹا تازہ ہو جائے، چنانچہ وہ موٹا تازہ بن گیا، خوش بھی رہنے لگا، مگر پڑھ نہ سکا، آدمی نہ بن سکا، اور اب چونکہ جوان ہو چکا تھا، اس لئے امجد صاحب بھی اس سے لچکتے تھے، اور مریم بھی خم کھاتی تھیں، اس کا ہر مطالبہ خواہ وہ کتنا ہی ناجائز اور نامعقول کیوں نہ ہو چار و ناچار ماں باپ کو پُورا کرنا پڑتا تھا، وہ تو کہئے مریم کی دہشت ایسی غالب تھی کہ کبھی اُلٹ کر احمد نے گھر کا حال نہیں پوچھا۔ ورنہ خود کشی کر لینے کے لئے کافی اسباب و دلائل پیدا ہو چکے تھے، مریم کا سارا زیور اور وہ کئی ہزار کا تھا، نسیم کی شراب، جوئے اور ریس کی نذر ہو چکا تھا، مریم خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی، شوہر سے شکایت تک نہ کر سکی، مریم ماں باپ کی اکلوتی لڑکی تھی، امجد صاحب خانہ داماد کی حیثیت سے رحمت پور آ بسے، اور مزے سے رہنے لگے۔ نسیم وہیں پروان چڑھا کبھی بھولے بھٹکے مہمان کی طرح ایک آدھ روز کو چچا یا دادا سے ملنے آ گیا تو آ گیا، ورنہ وہ اپنے حال میں ایسا مگن تھا کہ اُسے کہیں آنے جانے کی ضرورت نہ تھی،

احمد کی شادی فیروز آباد کے قریب ایک دوسرے قصبہ جمال پور میں ہوئی

تھی، بیوی، سلمٰی، ایک شریف اور گھریلو عورت تھی، لیکن صرف اپنے شوہر اور بیٹے کی حد تک، ورنہ دُنیا میں نہ اُسے کوئی پسند تھا، نہ کسی کی حاضر و غائب وہ اظہار رکھتی تھی، ہاں اس کا بیٹا فرخ مزاج کے اعتبار سے ماں اور باپ دونوں سے جُدا تھا، نہ وہ خود غرض اور مفاد پرست تھا۔ نہ بدمزاج اور بدراہ، اس کی عمر ۱۹ سال کی تھی، میٹرک پاس کر چکا تھا۔ ایف اے میں پڑھ رہا تھا، جمال پور فیروز آباد سے بڑا قصبہ تھا۔ بلکہ ایک چھوٹا سا شہر کہنا چاہیئے، یہیں کے کالج میں اس نے داخلہ لیا تھا۔ چونکہ ہر روز فیروز آباد سے جمال پور آنا آسان نہ تھا، لہذا یہیں نانی کے پاس رہتا تھا، چھٹی کے دن فیروز آباد میں گذارتا تھا، دونوں قصبوں کا درمیانی فاصلہ آٹھ دس میل تھا، کبھی سائیکل پر کبھی بس پر، حسب موقع آمد و رفت جاری رہتی، احمد کو نہ یہ فکر تھی کہ فرخ ضرور گریجویٹ بن کر خاندان کا نام روشن کرے، نہ اس کا اندیشہ تھا کہ کہیں جاہل اور نالائق رہ کر خاندان کی بدنامی کا موجب نہ بنے، اپنے باپ کی طویل زندگی سے وہ اتنا دل برداشتہ ہو چکا تھا کہ عملی طور پر اُسے اولاد سے کوئی سروکار نہ رہ گیا تھا، سلمٰی اُسے بہت چاہتی تھی، لیکن کھلاتی سونے کا لقمہ تھی، دیکھتی شیر کی آنکھ سے تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ نسیم کے برعکس فرخ کہیں زیادہ مہذب، متین، شائستہ اور نیک اطوار تھا۔

صمد بیچارہ ہر معاملہ میں پھسڈّی تھا!

شادی کے چند سال بعد بیوی کا انتقال ہو گیا، عذرا بڑی شوہر پرست، وفادار اور جاں نثار بیوی تھی، عذرا کے انتقال نے صمد کا دل بجھا دیا، حوصلہ، امنگ، ولولہ ہر چیز ختم ہو گئی، دوستوں نے، عزیزوں نے، باپ نے، بھائی نے، سب نے زور دیا کہ دوسری شادی کر لے، لیکن وہ زندگی میں عذرا کا اتنا وفادار نہ تھا، جتنا مرنے کے بعد وہ دوسری شادی کر کے وفا کے نام پر دھبہ لگانا نہیں چاہتا تھا۔

عذرا نے اس دُنیا سے رخصت ہوتے وقت ایک چھوٹی سی لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، رُکتی ہوئی سانس اور لرزتی ہوئی آواز سے کہا۔

میں اب مر رہی ہوں، لیکن دم غزالہ میں اٹکا ہوا ہے، یہ میری روح ہے، اسے کوئی دُکھ نہ پہنچے، ورنہ قبر میں بھی آرام نہ ملے گا۔

پھر اس کی آنکھوں میں آنسو بہنے لگے، ایک ہچکی لی اور اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔

عذرا مر گئی، صمد کا دل زندگی سے سیر ہوگیا، لیکن غزالہ کے لئے وہ زندہ تھا، غزالہ ویسے بھی بڑی پیاری اور خوب صورت لڑکی تھی، لیکن عذرا کی تنہا یادگار تھی، اس لئے صمد اسے دیوانہ وار چاہنے لگا تھا۔

غزالہ کی عمر ۱۶ سال کی تھی، اسی سال اس نے انٹرنس کا امتحان دیا تھا۔

(۴)

ایک سال گذر گیا!

ایک سال کی مدت کچھ زیادہ نہیں ہوتی، پلک جھپکتے میں گذر جاتی ہے۔ سال بھر پہلے کی باتیں ایسی معلوم ہوتی ہیں، جیسے ابھی گزری ہوں ——

لیکن واقعات کی دنیا میں اہم اور دور رس نتائج پیدا کرنے کے اعتبار سے ایک سال کی مدت کافی سے زیادہ ہوتی ہے۔

اس ایک سال میں امجد ایک متمول شخص بن گیا، رحمت پور اور فیروز آباد کی زمینوں کے علاوہ بھی اس نے آس پاس کے علاقہ میں کافی زمین خرید لی تھی، اب وہ ایک معمولی شخص نہیں تھا۔ رحمت پور کا سب سے بڑا زمیندار اور سر بر آوردہ شخص تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا اس کے گھر میں ہن برس رہا ہے، وہ مٹی میں ہاتھ لگاتا تو سونا بن جاتی، اس کی تجوری نوٹوں اور اشرفیوں سے بھری ہوئی تھی۔ مریم نے اپنے بھی بہت سے زیورات بنا لئے تھے، اور اپنی ہونے والی بہو کے لئے بھی نہ جانے کیا کیا خرید لیا تھا بینک میں بھی حساب تھا، اور اس کی میزان ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔

مریم کو اپنی خوش قسمتی پر رشک تھا، لیکن اس کا افسوس بھی تھا کہ یہ موسم بہار بڑھاپے میں آیا، جب پہننے اوڑھنے کے دن نہ رہے، امجد بھی اپنی خوش بختی پر نازاں تھا، اپنی ڈھکی چھپی بے پناہ صلاحیتوں کا علم اب اسے

ہُوا تھا، اگر افسوس تھا تو صرف اس بات کا کہ بڑھاپا تیزی سے غالب آتا جا رہا تھا، قویٰ جواب دیتے جا رہے تھے، اور یہ اُلّو کا پٹھا نسیم کیا مجال ہے جو ذرا بھی ہاتھ بٹاتا ہو۔

لیکن یہ امجد کی سادہ لوحی تھی، نسیم اُلّو کا پٹھا تو یقیناً تھا، لیکن اپنے فرض اور اپنے کام سے غافل نہیں تھا، باپ نے بے ایمانی، کنجوسی، دھوکے فریب سے، بہت سے لوگوں کی زمین اور جائیداد پر قبضہ کر لیا تھا، وہ علی الاعلان لوگوں کو روپیہ قرض دیتا تھا، اور ایک ایک کے دس دس وصول کرتا تھا، یہ دولت وہ بڑی احتیاط سے سمیٹ کر تجوری میں رکھ دیتا تھا، اور نسیم موقع پاکر ہاتھ صاف کرتا رہتا تھا، اس نے تجوری کی ایک اور چابی بنوالی تھی، جب امجد اپنے مقروض لوگوں سے سود و سود کا حساب کر رہا ہوتا تھا نسیم مریم کی نظر بچا کر اوپر پہنچتا، اور نوٹوں کی نچلی تہہ سے ایک بنڈل اڑا دیتا، کچھ اشرفیاں جیب میں رکھ لیتا، اب یہ اس کی قسمت تھی کہ یہ بنڈل پانچ پانچ کے نوٹوں کا ہے، یا دس دس کے یا سو سو کے، جو اشرفیاں اس نے جیب میں رکھی ہیں، وہ چند سو کی مالیت رکھتی ہیں یا چند ہزار کی؟ بہر حال اس رقم سے وہ دادِ عیش دیتا، جوا کھیلتا، شراب پیتا۔ ریس میں بازی لگاتا، کبھی ہارتا، کبھی جیتتا، ہارتا تو دل بہلانے کے لئے گلبدن کا بالا خانہ موجود تھا، اس کا گانا سنتا، ناچ دیکھتا، اس سے رومان لڑاتا، جتنا ہار کر آتا، اس سے زیادہ یہاں ہار دیتا، شراب کے دَور چلتے۔ اور گلبدن کے گلے میں بانہیں ڈال کر وہ یہ سمجھتا کہ آج کی سب سے بڑی نعمت میرے قبضہ میں ہے۔

اور اگر قسمت کا پانسہ موافق پڑتا، جیت جاتا، تو نوٹوں سے جیب بھر جاتی، پھر گلبدن کے علاوہ بھی کئی خدا کی بندیاں تھیں، جن کا دامن زر و جواہر سے بھر دیتا، کئی کئی دن گھر کا رُخ نہ کرتا، دن ہو یا رات، یا شراب پیتا یا کسی نازنین پری چہرہ سے راز و نیاز میں مصروف رہتا، مریم پریشان ہو جاتی روتے لگتی، امجد بدحواس ہو جاتا، اور اختلاج میں مبتلا ہو جاتا۔ لیکن نسیم کو نہ ماں کی فکر تھی، نہ باپ کی، وہ سب سے بے فکر، سب سے بے نیاز

سب سے بے پروا، زندگی کے مزے لوٹتا رہتا۔!

بار ہا امجد کے جی میں آیا کہ اس نالائق کو عاق کر دے ــــ اگر وہ جوان ہوتا تو ضرور نئی شادی کر کے ایک نئے بچّہ کا باپ بنتے ہی اُسے عاق کر دیتا، لیکن اب تو چھوٹی آنکھ کا دیدہ یہی بد بخت تھا ــــ عصائے پیری ــــ اگر اُسے عاق کر دے تو پھر جئے کیوں ؟ کس کے سہارے ؟

وہ بار بار نسیم کو پیار اور لاڈ سے سمجھاتا اور راہِ راست پر لانے کی کوشش کرتا، لیکن چکنے گھڑے پر پانی کی بوند کیا اثر کر سکتی ہے ؟

(۵)

ایک سال گذر گیا!

اس ایک سال کی مختصر اور طویل مدّت میں احمد کا خانہ خراب ہوگیا!

نہ جانے کس طرح وہ شراب کا عادی ہوگیا، اور تھوڑے ہی دنوں میں ایسا بلانوش بن گیا کہ شب و روز مئے ناب کے بحرِ بیکراں میں غوطے لگاتا رہتا نہ اُسے سلمیٰ سے کوئی واسطہ تھا، نہ فرخ سے، سلمیٰ روتی تھی وہ ہنستا تھا۔ فرخ بیمار پڑتا تھا تو وہ دوا کی شیشی اُلٹ کر قہقہے لگانے لگتا تھا۔

اس بادہ نوشی کا اثر اس کی صحت پر بہت بُرا پڑا۔ بدن پھول گیا ذیابیطس کی شکایت ہوگئی، دمہ کا مرض لاحق ہوگیا۔ پھیپھڑے جواب دینے لگے، جگر روٹھ گیا، معدہ غارت ہوگیا، مرگی کے دورے پڑنے لگے!

مریم نے رو رو کر خدا سے دُعائیں مانگیں کہ وہ سنبھل جائے، لیکن ہر دعا بد دعا بن کر ظاہر ہوئی، وہ سنبھلنے کے بجائے اور زیادہ بگڑتا گیا سلمیٰ نے صدقہ کیا۔ خیرات دی، نہ جانے کتنے بکرے قربان کو ڈالے، لیکن ان میں سے ایک چیز بھی آسمان تک نہ پہنچ سکی، احمد کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی!

ایک کمرہ میں مصلیٰ بچھائے، سلمیٰ نماز پڑھا کرتی، دعائیں کیا کرتی، اپنے خدا کے حضور میں گڑگڑایا کرتی، اور پاس کے دوسرے کمرہ سے لہراتی ہوئی آواز بگڑے ہوئے ترنم کے ساتھ آ کر اس کے پردہ گوش سے ٹکراتی۔ سہ

پینا بغیر اذن، یہ کب تھی مری مجال
در پردہ چشمِ یار کی شہ پاکے پی گیے
شہ پاکے پی گیا،
در پردہ چشمِ یار کی شہ پاکے پی گیا،
پی گیا!
پھر قہقہہ، پھر بوتل کھلنے اور کاک اُڑنے کا شور!
پھر بڑا سا گھونٹ حلق سے اُتارنے کی آواز ــــــ اور پھر وہی لہراتی ہوئی تان،
در پردہ چشمِ یار کی شہ پاکے پی گیا،
شہ پاکے پی گیا۔
پی گیا!

سلمیٰ، اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتی، بے تحاشا اس کی آنکھوں سے آنسو برسنے لگتے۔ ہچکیاں بندھ جاتیں، وہ سجدہ میں گر پڑتی ــــــ لیکن احمد اپنی دھن میں مست، گنگناتا رہتا، گاتا رہتا! پیتا رہتا! ــــــ پیتا رہتا!

کئی دفعہ ایسا ہوا کہ سلمیٰ نے اپنے مرنے کی دعائیں مانگیں، احمد کے مرنے کی دعائیں مانگیں، لیکن وہ بھی زندہ رہی، اور احمد بھی موت سے ہمکنار نہ ہوا، دونوں زندگی کی گاڑی کھینچے جا رہے تھے ــــــ! آہستہ آہستہ، گر گر کر، رُک رُک کر!

شراب خانہ خراب نے اس آباد اور پُربہار گھر کو غارت کر کے رکھ دیا تھا!

یہ گھر اب اس کا گھر نہیں تھا، امجد کے پاس تین ہزار میں رہن تھا، اب اس گھر کا ماہوار کرایہ تیس روپیہ دینا پڑتا تھا ــــــ لیکن کرایہ اور سود، دونوں اصل میں شامل ہو رہے تھے، اصل دودھ پی پی کر بڑھ رہی تھی۔

چاروں دوکانیں بھی بارہ ہزار میں امجد کے پاس گروی تھیں، ان کا کرایہ اب سلمیٰ کے بجائے مریم کے پاس جاتا تھا، سود کی ادائیگی کا کوئی سوال نہ تھا۔ وہ اصل میں شامل ہو رہا تھا، اور اصل زلفِ دراز کی طرح بڑھتی چلی جا رہی تھی!

لے دے کے صرف ایک باغ رہ گیا تھا، فصل پر اس سے دو ڈھائی ہزار مل جانے کی اُمید تھی۔ لیکن امجد میاں شکاری گدھ کی طرح اس کی تاک میں تھے کہ کب فصل کا روپیہ وصول ہو، اور وہ یہ ساری رقم اپنے سود میں وصول کرلیں۔

بیچارے کو اس بڑھاپے میں اس خراب موسم میں بار بار رحمت پور سے زحمت برداشت کر کے فیروز آباد آنا پڑتا تھا۔

فرخ جمال پور میں پڑھ رہا تھا، باپ کے حالات نے اس کو اتنا دل گرفتہ کردیا تھا کہ اب فیروز آباد کے تصوّر سے اُسے گھبراہٹ ہونے لگی تھی، لیکن فیروز آباد کو چھوڑا ابھی تو نہیں جاسکتا تھا، مرنا جینا تو بہرحال یہیں تھا، وطن کی محبّت کہیں دل سے نکل سکتی ہے؟

(۴)

ایک سال گذر گیا!

اس ایک سال کی مدت میں، صمد کا کاروبار ایسا چمکا کہ خود اُسے ایسی کامیابی کی اُمید نہ تھی،

احمد سے اس نے ایک، آبائی دوکان پندرہ روپیہ ماہوار کرایہ پہلے لی تھی، تین ہزار کے چھوٹے سے سرمایہ سے اس نے جنرل مرچنٹ کی حیثیت سے کام شروع کر دیا، آدمی محنتی تو تھا ہی، ایماندار بھی ثابت ہوا، نفع کم لیتا، مال اچھا لاتا، لوگوں سے جھوٹے وعدے نہ کرتا، بلیک مارکیٹ بھی نہ کرتا چوری کا مال مفت بھی نہ لیتا، شریف ناداروں کو قرض دے دیتا اور پھر تقاضا نہ کرتا، رفتہ رفتہ اس کی دوکان چمک اُٹھی، نفع ہوا، اور توقع سے کہیں زیادہ قریب ہی ایک خالی زمین پڑی تھی، وہ اس نے خرید لی، اور اس پر ایک نئی دوکان تعمیر کر لی، یہ دوکان پہلی دوکان کے مقابلہ میں وسیع اور کشادہ بھی تھی اور موقع کے لحاظ سے بھی اچھی تھی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنی تھی!

لوگ رشوت دے دے کر لائسنس حاصل کرتے ہیں، اس نے اپنی دیانت اور محنت سے ایسا رسوخ پیدا کر لیا کہ پہلی ہی مرتبہ پچاس ہزار کا لائسنس مل گیا وہ اگر چاہتا تو آسانی سے یہ لائسنس کسی دوسرے کے ہاتھ ایک لاکھ میں فروخت کر دیتا، ہلدی لگتی، نہ پھٹکری، رنگ چوکھا آتا، نہ محنت

نہ بک بک نہ جھک جھک اور ایک لاکھ روپیہ کا نفع بغیر ایک پیسہ لگائے مفت ملیں؟"

لیکن اس نے یہ نہ کیا، اپنا لائسنس خود استعمال کیا، غیر ممالک میں آرڈر دے کر مال منگایا، اور مناسب نفع رکھ کر اُسے فروخت کر دیا، اسطرح بے شک اسے اتنا نفع نہ ہُوا، جتنا روپیہ لگائے بغیر صرف لائسنس بیچ کر ہوتا لیکن پہلی صورت میں اُسے گاہک بھی ملتے، ہاں پریشان حالوں کی بد دعائیں ضرور ملتیں لیکن اب اس کے پاس قدر دان گاہکوں کی ایک فوج تھی۔ یہ لوگ کسی دوسری دوکان سے مال لینا گناہ سمجھتے تھے، انہیں یہ گوارا تھا کہ چند روز انتظار کر لیں، اور سودا نہ خریدیں، مگر یہ گوارا نہ تھا کہ سودا خرید لیں، مگر کسی اور دوکان سے۔

جس طرح جنگل کی آگ پھیلتی ہے، اسی طرح صمد کی شہرت، عزت، رفعت، دیانت اور شرافت کی روشنی پھیلنے لگی۔ بہت جلد وہ اپنے حلقہ میں قابلِ رشک پوزیشن کا مالک بن گیا، کوئی جھگڑا ہوتا تو لوگ اُسے ثالث بنا لیتے، اور جو فیصلہ وہ کر دیتا اسے بے چون و چرا قبول کر لیتے، جو لوگ بینک میں روپیہ رکھتے ہوئے گھبراتے، وہ بڑی سے بڑی رقمیں لاکر اس کے پاس امانت رکھ دیتے، اور اس کے اصرار کے باوجود رسید تک لینے کی چنداں ضرورت نہ محسوس کرتے، کیونکہ آج تک کبھی ایک پیسہ کا بھی بل نہ پڑا تھا۔ اب وہ فیروزآباد کے ایک مٹے ہوئے رئیس کا لڑکا نہیں تھا، بلکہ وہاں کا ایک کامیاب تاجر تھا۔ وہاں کے لوگوں کا لیڈر تھا، ہر مشکل میں وہ ان کے کام آتا، ہر دُکھ میں اُن کا ساتھ دیتا، کوئی وبا پھُوٹتی تو بے پروا ہو کر وہ روپیہ خرچ کرتا، اور غریبوں کے علاج کے سارے مصارف خود برداشت کرتا۔ شہر کے شریف لیکن نادار لوگ مدد کے طالب ہوتے، تو بے تامل ان کی مدد کرتا، اس انکسار سے گویا وہ مدد دے نہیں رہا ہے لے رہا ہے۔

اگر کوئی غم تھا تو صرف عذرا کا، اس کی یاد کسی طرح دل سے نہیں مٹتی تھی۔ لیکن اب اس غم کو غزالہ نے بڑی حد تک کم کر دیا تھا، اس کی عمر صرف سترہ سال کی تھی، اس چھوٹی سی عمر میں وہ انٹرنس کا امتحان پاس کر چکی تھی۔ ایف۔ اے میں

داخلہ بھی لے لیا تھا، باپ کا سارا حساب کتاب بھی رکھتی تھی، اور گھر کا سارا بوجھ وہ ننھی ننھا اُٹھائے ہوئے تھی۔ ہر کام مشین کی طرح ہوتا تھا، ٹھیک اپنے وقت پر صمد کو اس نے گھر کی فکر سے یکسر آزاد کر دیا تھا۔

صمد کو اس پر فخر تھا کہ غزالہ اس کی بیٹی ہے۔

(۷)

"ویران ہے میکدہ خم و ساغر اُداس ہیں!"

آخر وہ رندِ بلا نوش، زندگی کی تہمت سے آزاد ہو گیا!

احمد مر گیا!

اپنا نیا گھر بسائے ہوئے ابھی صرف دو سال ہوئے تھے!

اس دو سال کی مدت میں یہ گھر بسا بھی اور اُجڑ بھی گیا، اس میں بہار کی رونق بھی آئی، اور خزاں کی افسردگی بھی چھا گئی، زندگی کے شگوفے بھی پھوٹے اور اور موت کا سناٹا بھی طاری ہو گیا!

سلمیٰ نے کئی بار اپنے مولا سے، اپنے رب سے بلبلا کر دُعا مانگی تھی کہ یا اسے موت آجائے یا احمد کو وہ اس کی یہ حالت نہیں دیکھ سکتی تھی کیسی طرح بھی یہ ہولناک منظر اس سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

سلمیٰ کی دُعا قبول ہو گئی، وہ خود تو نہ مری، احمد مر گیا۔

اور اب وہ محسوس کر رہی تھی کہ اسے صرف اپنے ہی لئے موت کی دُعا مانگنی چاہیئے تھی، احمد کو زندہ رہنا چاہیئے تھا، اب کہ وہ مر چکا تھا، اسے اپنی زندگی بے مصرف نظر آرہی تھی ـــــ بے مصرف، اُداس اور افسردہ!

جب تک احمد زندہ تھا، ہر مصیبت سہی جا سکتی تھی، کوئی مصیبت بھی ناقابلِ برداشت نظر نہیں آتی تھی، لیکن اب اس کے مرنے کے بعد مصیبت

ہی مصیبت تھی، مایوسی کی تاریکی ہر طرف نظر آتی تھی، اُمید کی کرن کہیں نہیں دکھائی دیتی تھی، بلا سے وہ شرابی تھا، گھر پھونک تماشہ دیکھ رہا تھا، اپنے آپ کو مٹا رہا تھا، اپنی بیوی بچے کی طرف ذرا بھی ملتفت نہ تھا، لیکن اس کے دم سے ایک سہارا تو تھا ایک آس تو تھی ــــــ اب وہ سہارا بھی جاتا رہا۔ وہ آس بھی ٹوٹ گئی!

احمد کی وفات کے تیسرے دن امجد رحمت پور سے آگیا، وہ حسبِ معمول صمد کے ہاں ٹھہرا۔ جب بھی وہ فیروزہ آباد آتا تھا، صمد ہی کے ہاں ٹھہرتا تھا، یہاں اپنا سامان رکھ کر احمد کے ہاں پرسا دینے گیا، سلمیٰ اسے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، اسے ایسا محسوس ہوا، جیسے اس کا سہارا پھر واپس مل گیا، جیسے وہ ٹوٹی ہوئی آس پھر واپس آگئی، یہ آنسو اتنے غم کے نہیں تھے، جتنے اطمینان کے تھے، جس دن احمد مرا تھا وہ جی بھر کے روئی تھی، اور اس سے اس کے دل کا بوجھ ذرا ہلکا ہوگیا تھا، آج امجد کو دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ وہ اس دنیا میں اکیلی نہیں ہے۔ کوئی اس کا پشت پناہ اور فرخ کا سرپرست موجود ہے!

امجد نے رونے میں سلمیٰ کا مقابلہ شروع کر دیا، سلمیٰ کی آنکھ سے اگر لوٹا بھر آنسو گرے تو امجد نے کئی گھڑے آنسوؤں کے بہا دیئے۔ سلمیٰ سِسک سِسک کر رو رہی تھی، امجد چیخ چیخ کر رو رہا تھا، پاس پڑوس کی کئی عورتیں اس پیر مرد کا گریۂ بے اختیار دیکھنے کو جمع ہوگئی تھیں، امجد نے سلمیٰ کے سر پر ہاتھ پھیرا، اور اس طرح کہ گھر سے باہر تک آواز گئی، اس نے کہا۔

"یہ تو میری بیٹی ہے!"

پھر اس نے فرخ کو لپٹا لیا، اور ایک مرتبہ اور ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگا، اس نے اپنا گریبان پھاڑ ڈالا، بال نوچ لئے۔ ماتھا کوٹ ڈالا، وہ فرخ کو دیکھتا تھا، اور گلا پھاڑ پھاڑ کر روتا تھا، اس نے کہا۔

"میرے بچے دنیا کہتی ہے تو یتیم ہوگیا، لیکن غلط کہتی ہے ــــــ امجد کے دو بیٹے ہیں۔ نسیم اور فرخ، نسیم کم اور فرخ زیادہ!"

خوب اچھی طرح رو دھو کر وہ صمد کے گھر پہنچا، کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔

صمد اس کے انتظار میں بیٹھا تھا، صمد نے پوچھا۔
" بھائی صاحب، احمد بھائی کے ہاں ہو آئے آپ؟"
ایک مرتبہ پھر امجد کی آنکھوں سے آنسو برسنے لگے۔
"ہاں ہو آیا ـــــ موت بھی کتنی بے رحم ہے، میں زندہ ہوں اور احمد مر گیا!"
صمد نے اُسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔
"آپ ویسے ہی کمزور ہیں، اتنا غم نہ کیجئے!"
امجد نے سینہ پر گھونسہ مارتے ہوئے :
"کیا کہتے ہو صمد میاں، یہ غم تو اب جان کے ساتھ ہے، یہ غم تو دیکھ لینا میری جان لے کر رہے گا!" ـــــ ہائے کس دل سے قبول کروں کہ احمد مر گیا ہے، وہ میرا بھائی وہ میرا قوتِ بازو!"
یہ کہہ کر وہ آنسو پونچھتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا، صمد نے کہا۔
" بھائی صاحب کھانا تو کھا لیجئے، ٹھنڈا ہو رہا ہے!"
امجد نے جواب دیا۔
"نہیں بھائی میں نہیں کھاؤں گا، نہیں کھا سکوں گا، کھانے کو لختِ دل اور پینے کو خونِ جگر کافی ہے!"
صمد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔
"ایسا غضب نہ کیجئے، زیادہ نہیں دو چار لقمے کھا لیجئے۔"
صمد کے اصرار سے مجبور ہو کر امجد دستر خوان پر بیٹھ گیا، شروع میں تو دو چار لقمے اس نے بے دلی سے کھائے، پھر جو اس نے ہاتھ کی صفائی دکھائی ہے تو صمد حیران رہ گیا اور غزالہ کے لئے تو ہنسی کا ضبط کرنا دشوار ہو گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا، وہ بار بار اپنے دل کو تسلّی دیتی تھی کہ اس کی آنکھیں دھوکا دے رہی ہیں، بھلا یہ بات یقین کرنے والی تھی کہ جو شخص ابھی بچّوں کی طرح رو رہا تھا لختِ دل کھانے اور خونِ جگر پینے کا اعلان کر رہا تھا، وہ یک بیک لختِ دل اور خونِ جگر دیکھ کر پلاؤ، شامی کباب، شیرمال، قورمہ اور فیرنی پر اس طرح ٹوٹ پڑے گا

جیسے کئی دن کے فاقہ سے ہو؟

امجد شکم سیر ہوکر جب دسترخوان سے اٹھا' تو اس کی نظر غزالہ پر پڑ گئی' وہ اس کے چہرہ کا دزدیدہ تبسّم تو نہ دیکھ سکا، لیکن اس کی چھٹی حس نے بتادیا کہ یہ لڑکی میری بسیار خوری پر مجسم طنز بنی ہوئی ہے، اس نے غزالہ سے پوچھا۔

"بیٹی یہ کھانا تو نے پکایا تھا؟"

غزالہ نے سر جھکا کر عرض کیا،

"جی!"

امجد کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

کتنی لذت ہے ہماری بیٹی کے ہاتھ میں! —— خدا جانتا ہے ایسا مزیدار کھانا میں نے زندگی بھر نہیں کھایا، ہر لقمہ پر جی چاہتا تھا کہ اب بس کروں' پھر جی چاہتا تھا ایک لقمہ اور اسی کشمکش میں اتنا کھا گیا کہ اب بغیر چورن کے کام نہیں چلے گا، لیکن بیٹی شام کو خدا کے لئے تم نہ پکانا، ورنہ ضرور بدہضمی ہو جائے گی' مجھے۔"

غزالہ کو مسکرانے کا موقع مل گیا ——!

(۸)

فاتحہ سیوم سے فراغت کے دوسرے دن امجد نے صمد سے کہا۔
"سوچتا ہوں کل رحمت پور چلا جاؤں، کئی دن ہو گئے آئے ہوئے سارا کام چوپٹ ہو رہا ہو گا!"
صمد نے نیم رضامندی کے ساتھ جواب دیا۔
"چلے جائیے گا، ابھی جلدی کیا ہے؟"
امجد نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔
"نہیں بھئی، اب جانے دو، زندگی ہے تو پھر آئیں گے!"
صمد خاموش ہو گیا ذرا دیر کے بعد امجد نے پھر زبان کھولی۔
"ذرا سلمیٰ اور فرخ کو بلا لیتے، حساب فہمی ہو جائے تو اچھا ہے!"
صمد کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا، اس نے کہا۔
"بھائی صاحب آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"
امجد نے بڑی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ کہا۔
"میں چاہتا ہوں حساب فہمی ہو جائے تو اچھا ہے!"
"بھائی صاحب یہ تو درست ہے لیکن یہ کون سا موقع ہے حساب فہمی کا ——؟"
"کیوں؟ موقع کیوں نہیں ہے؟"
"ابھی احمد بھائی کو مرے ہوئے کتنے دن ہوئے ہیں جو آپ یہی کھاتہ کھول

کر بیٹھ گئے۔ کتنا صدمہ ہوگا سلمیٰ اور فرخ کو!"

"اس میں صدمہ کی کیا بات ہے؟ —— کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ اپنا روپیہ ڈوب جانے دوں؟"

"نہیں یہ مطلب کیوں ہوتا؟ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خود ڈوب جاتے ہیں۔ مگر اپنی ایک پائی بھی نہیں ڈوبنے دیتے ——!"

"صمد تمہاری یہ باتیں دل شکن ہیں، ان پر مجھے غصہ آجانا چاہیئے تھا۔ لیکن حیرت ہے کیوں نہیں آیا؟ شاید اس لئے کہ میں تمہیں بہت زیادہ چاہتا ہوں، صرف میں ہی نہیں، مریم کی زبان پر بھی ہر وقت بھیا بھیا کا کلمہ رہتا ہے۔ اور وہ نسیم جو نہ باپ کی پروا کرتا ہے، نہ ماں کی، نہ بادشاہ کو خاطر میں لاتا ہے، نہ وزیر کو۔ اگر کسی پر جان دیتا ہے تو اپنے چچا پر یعنی تم پر۔ نہ جانے تمہیں کون سا جادو آتا ہے، لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ میری محبت تمہیں بدتمیز بنا دے، اور تم میرے منہ پر مجھے گالیاں دینے لگو۔ نالائقی کی بھی ایک حد ہوتی ہے!"

"(شرمندہ ہوکر) بھائی صاحب آپ میرا مطلب غلط سمجھے، میں نے کچھ آپ کو تھوڑے کہا تھا، میں نے تو ایک عام بات کہی تھی، آپ نے خواہ مخواہ اپنے اوپر چسپاں کر لی —— روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ!"

"خیر" اگر یہ بات تھی تو میں معاف کرتا ہوں، میرا دل صاف ہوگیا لیکن آئندہ ذرا سوچ سمجھ کر الفاظ منہ سے نکالا کرو، دشمن کے خنجر سے بھی، مجھے وہ تکلیف نہیں پہنچ سکتی، جو بعض اوقات تمہارے تلخ الفاظ سے پہنچ جاتی ہے!"

"بہت بہتر، آئندہ احتیاط رکھوں گا، ایک مرتبہ پھر میں اپنے ناشائستہ الفاظ پر معذرت کرتا ہوں!"

"بار بار شرمندگی کا اعتراف کر کے مجھے شرمندہ نہ کرو، کاش میں اپنا دل چیر کر تمہیں دکھا سکتا کہ نسیم سے زیادہ تم سے محبت کرتا ہوں۔ میری محبت کو ٹھکرا کر تم مجھے زندگی سے بیزار کر دیتے ہو، زندہ رہتے ہوئے مجھے شرم آنے لگتی ہے!"

"بھائی صاحب اب بھول جائیے یہ ذکر نہ کیجئے!"

" اچھا بھئی اب یہ ذکر نہیں کروں گا' ـــــ لیکن سلمیٰ اور فرخ کو بلوا لو میں جانے سے پہلے معاملہ صاف کر لینا چاہتا ہوں "

" بھائی صاحب ابھی بلواتا ہوں' لیکن سلمیٰ اور فرخ کے پاس ہے کیا جو ہم لے لیں گے۔

" تم ان کی وکالت کیوں کرتے ہو؟ میں چالوں اور وہ جائیں' بہرحال مجھے اپنے مرحوم بھائی کا خیال تم سے کم نہیں ہے' سلمیٰ اور فرخ میرے جگر کے ٹکڑے ہیں' میں ان پر ظلم نہیں کر سکتا!"

صمد نے ملازم کو حکم دیا کہ سلمیٰ اور فرخ کو بلا لائے!

(۹)

امجد بیٹھا حقہ پی رہا تھا، صمد نے سگریٹ سلگایا تھا۔ غزالہ ایک گوشہ میں بیٹھی آج کا تازہ اخبار دیکھ رہی تھی کہ سلمیٰ آئی، فرخ بھی اس کے ساتھ تھا۔
سلمیٰ کو دیکھ کر غزالہ اُٹھ کھڑی ہوئی، اس نے ادب سے جُھک کر سلام کیا، سلمیٰ نے اسے گلے سے لگالیا، اور دعائیں دیتی ہوئی امجد کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔

"بھائی صاحب آپ نے مجھے اور فرخ کو یاد کیا تھا۔
امجد نے حقہ کا ایک کش لگاتے ہوئے کہا۔
"ہاں بیٹی! میں نے بلایا تھا، آؤ ــــ بیٹھ جاؤ کھڑی کیوں ہو۔ بیٹا فرخ تم بھی بیٹھ جاؤ!"
سلمیٰ اور فرخ، سامنے پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے،
امجد نے پھر حقہ کا ایک کش لگایا اور فرخ سے مخاطب ہوئے۔
"بیٹے، تم اب کس درجہ میں ہو؟"
اس نے ادب سے جُھک کر کہا،
"بی اے میں اس سال داخلہ لیا ہے ــــ!"
امجد کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا،
"بی اے میں؟ ــــ ماشاءاللہ، ماشاءاللہ ہمارے خاندان میں تم پہلے

شخص ہو، جو گزبجو بیٹ ہو رہا ہے لیکن بیٹے اگر بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟"

"جی ارشاد ــــ فرمائیے!"

"تمہیں مستقبل سے زیادہ حال کی فکر کرنی چاہیئے!"

"جی؟"

"تمہارا باپ مر چکا، ماں بیوہ ہو چکی، اگر تم نے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا تو کالج کے مصارف کہاں سے ادا ہوں گے؟ گھر کا خرچ کس طرح چلے گا؟"

"اس کا میں نے بندوبست کر لیا ہے؟"

"بندوبست کر لیا ہے؟ ــــ واہ بھئی واہ، تمہاری حوصلہ مندی دیکھ کر جی خوش ہو گیا ــــ کیا بندوبست کیا ہے بیٹے؟"

"پرنسپل صاحب نے فیس معاف کر دی ہے، ان کی عنایت سے پچاس روپیہ ماہوار کے دو ٹیوشن بھی مل گئے ہیں!"

"ماشاء اللہ، ماشاء اللہ!"

"یہ رقم اماں کے لئے بہت کافی ہے، میں تو چاہتا تھا کہ وہ جمالپور چلی چلیں، لیکن وہ کہتی ہیں جس گھر میں دلہن بن کر آئی تھی وہاں سے اب مر کر ہی نکلوں گی!"

"(یادیدۂ پُرنم) تم نہیں جانتے، وفادار اور شوہر پرست بیویاں ایسی ہی ہوتی ہیں ــــ لیکن سلمیٰ بیٹی ضد سے کیا فائدہ جمال پور چلی جاؤ گی تو خرچ کم ہوگا، بیٹا تمہاری نظروں کے سامنے رہے گا، اور تعلیم حاصل کرے گا!"

"بھائی صاحب یہ تو ٹھیک ہے لیکن اس گھر سے یہاں کے در و دیوار سے یہاں کے چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ سے کچھ ایسی تلخ اور شیریں یادگاریں وابستہ ہیں کہ اُسے میں نہیں چھوڑ سکتی، فرخ کی فیس معاف ہی ہو چکی ہے، اپنی نانی کے پاس کھاتا ہے میرے لئے پچاس روپے بہت ہیں!"

"ٹھیک ہے پھر واقعی تمہیں یہیں رہنا چاہیئے۔"

دیکھا صمد میاں سلمیٰ کو خدا کی قسم یہ اس قابل ہے کہ اس کے پاؤں دھو دھو کے پیئے جائیں، یہ سر کسی کے سامنے نہیں جھکا، لیکن آج عقیدت کا بوجھ اُسے جھکائے دے رہا ہے!"

"واقعی بھائی صاحب، سلمیٰ بھابی کا صبر و ضبط اور شرافت نفس دیکھ کر میں تو عش عش کر اٹھتا ہوں۔"

"بے شک، بے شک، ایسی بہو ہمارے خاندان کے لئے باعث فخر ہے۔ تو سلمیٰ بیٹی تم یہیں فیروز آباد میں رہو، یہاں صمد میاں بھی ہیں، وہ بھی ہر طرح تمہاری خدمت اور دیکھ بھال کرتے رہیں گے، بڑھاپے کے سبب میرے لئے سفر کرنا بہت تکلیف دہ ہے، لیکن تمہاری محبت مجھے بھی کھینچ لایا کرے گی، اکثر آنا ہوتا ——— اور ہاں کبھی کوئی تکلیف ہو، ضرورت ہو، تو ذرا بھی جھجک سے کام نہ لینا، فوراً مجھے لکھنا!"

"بھائی صاحب آپ کے اور صمد بھیا کے سوا دنیا میں میرا ہے کون؟ فرخ تو ابھی پڑھ ہی رہا ہے!"

"ہاں بھئی تو میں اور صمد کسی خدمت سے باہر کب ہیں؟"

"مجھے یقین ہے!"

"لیکن مجھے اس وقت یقین آئے گا، جب تم واقعی کسی خدمت کا موقع دو گی!"

"آپ کے یہ الفاظ میرے لئے بہت بڑا سہارا ہیں!"

"لیکن میں اپنے الفاظ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بے قرار ہوں بیٹی غزالہ، سلمیٰ اور فرخ کو ذرا چائے تو پلاؤ، شاباش ہماری بیٹی کتنی اطاعت مند ہے، دیکھو وہ چلی بھی گئی!"

(۱۰)

نہ یہ چائے پینے کا وقت تھا، نہ سلمٰی کا جی چاہ رہا تھا، اس نے چاہا کہ غزالہ کو منع کرے، لیکن وہ تو گویا منتظر ہی بیٹھی تھی، ادھر امجد کے منہ سے یہ الفاظ نکلے، ادھر وہ روانہ ہو گئی۔

غزالہ کے جانے کے بعد امجد نے ایک بہت لمبا سانس لیا، پھر چہرے پر غم و اندوہ کی کیفیت طاری کرتے ہوئے کہا۔

"غزالہ کو دیکھ لیتا ہوں تو جان ہار اور جوانا مرگ عذرا یاد آ جاتی ہے!"

پھر کچھ سوچتے لگے گردن جھکا کر، اس کے بعد فرمایا۔

"ہاں ــــ کیا زمانہ تھا، عذرا کی باتیں یاد آتی ہیں، تو کلیجہ پر سانپ لوٹتے لگتا ہے۔ وہ جنت کی مخلوق تھی، اس خاکی دنیا میں اس کا کیا جی لگتا، وہیں چلی گئی، ہم سب کو اپنے غم میں تڑپتا اور بلکتا چھوڑ کر ــــ لیکن سلمٰی تم نے کبھی غور کیا، غزالہ ہو بہو عذرا کی تصویر ہے؟"

"جی، بالکل عذرا کا نمونہ، ذرا جو فرق ہو!"

"وہی آنکھیں وہی بال، وہی صورت، وہی رنگ، وہی طور طریقے، بعض وقت تو شبہ ہونے لگتا ہے، کہیں عذرا نے غزالہ کا روپ تو نہیں بھر لیا ہے!"

اتنے میں غزالہ خادمہ کے سر پر چائے کی ٹرے اٹھوائے ہوئے برآمد ہوئی۔ ٹرے سامنے میز پر رکھ دی گئی۔

امجد نے خوش ہو کر کہا۔

"کیا کہنا ہے ہماری غزالہ بیٹی کا، کیسا لپ جھپ کام کرتی ہے۔ جیو۔ بیٹی جیو، خوش رہو، پھولو، پھلو!"

غزالہ مسکراتی ہوئی چائے بنانے لگی، سب کے سامنے ایک ایک پیالی رکھ دی، چائے کے ساتھ کیک اور پیسٹری بھی تھی، امجد نے کریم رول کا آدھا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"بھلا چائے کے ساتھ ان چیزوں کی کیا ضرورت تھی" ـــــ تو صمد میاں میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو کھاؤ، لے بیٹی سلمٰی تو بھی ذرا منہ جھٹال لے، ارے میاں فرخ تم تو ابھی نوجوان ہو، تکلف کیسا بڑھاؤ ہاتھ، خبردار جو کیک، یا پیسٹری میں سے کچھ بھی باقی رہا!

غزالہ نے چپکے سے کہا۔

"آپ موجود ہیں تو واقعی کچھ نہ باقی رہے گا!"

یہ بات غزالہ نے بہت آہستہ سے کہی تھی، فرخ پاس بیٹھا تھا اس نے سن لی اور بے اختیارانہ مسکرانے لگا، امجد نے کریم رول سے فراغت کے بعد حاضرین پر نظر ڈالی تو غزالہ کے ہونٹ ہلتے اور فرخ کو مسکراتے دیکھ لیا تو اس طرح جیسے کوئی بہت بڑی چوری پکڑ لی ہو۔ غزالہ سے فرمایا۔

"بیٹی بُری بات!"

غزالہ سمجھ نہ سکی کہ اس ارشاد کا مدعا کیا ہے، وہ حیرت سے نظر اٹھا کر امجد کو دیکھنے لگی، امجد نے کہا۔

"لڑکیاں لڑکوں سے اس طرح چپکے چپکے باتیں نہیں کرتیں، بُری بات بیٹی، بُری بات، فرخ میاں تم تو ماشاءاللہ سمجھ دار ہو!"

فرخ اور غزالہ پر گھڑوں پانی پڑ گیا، صمد کا چہرہ تمتما اٹھا، غزالہ ناگواری کے ساتھ کمرہ سے باہر چلی گئی، فرخ نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا۔ لیکن کہہ نہ سکا، صمد حیران تھا کہ یک بیک بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ لیکن اس وقت اس موضوع کو چھیڑنا اس نے مناسب نہ سمجھا۔

امجد کی اس بات سے سلمیٰ کو بہت تکلیف ہوئی - اس کا جی چاہا وہ بھی اُٹھ کر چلی جائے، لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش ہو رہی کہ بوڑھے آدمی ہیں ان سے اُلجھنا بیکار ہے، پھر بھی اتنا تو اس نے کہہ ہی دیا -

"عزالہ تو بالکل چُپ بیٹھی تھی، وہ کچھ کہتی اور میں نہ سنتی؟ ——خیر یہ تو بتائیے آپ نے مجھے یاد کیوں فرمایا ہے !"

---

(۱۱)

چائے کا دَور قریب قریب ختم ہو چکا تھا، امجد نے سلمیٰ کی بات سُن کر آخری گھونٹ پیا۔ اور پیالی ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

" بات تو کچھ نہیں، کل میں رحمت پور واپس جا رہا ہوں، سوچا تم سے ایک مرتبہ اور مل لوں، فرخ کو پیار کر لوں!"

سلمیٰ نے پھر کچھ نہ پوچھا، خاموش ہو رہی، ممنون نظروں سے انہیں دیکھا۔ اور آنکھیں جھکا لیں۔

ذرا دیر کے بعد امجد نے پھر لب کشائی کی۔

" بیٹی بات یہ ہے کہ دو کانوں اور باغ پر احمد نے وقتاً فوقتاً جو روپیہ قرض لیا تھا، اس کے زرِ اصل اور نفع (سود) کا حساب کیا جائے، تو حساب کتاب برابر ہی نکلے گا (جیب سے کاغذ نکالتے ہوئے) یہ میں نے مسودہ لکھ لیا ہے، اسے پڑھ لو، اور دستبرداری لکھ دو!"

سلمیٰ نے کچھ کہنا چاہا۔

" لیکن بھائی صاحب "

امجد نے بات پوری نہ کرنے دی،

" دستبرداری نہ لکھنے میں ایک نقصان یہ ہے کہ رقم اور بڑھتی جائے گی!"

سلمیٰ کو کاغذ پر دستخط کرنے میں تامل تھا، اس نے کہا۔

"بھائی جان، اگر آپ زرِ اصل لے لیں، اور نفع چھوڑ دیں، تو شاید میں کہیں سے انتظام کر لوں!"

امجد نے جواب دیا:

"بیٹی ویسے تو جو کچھ میرے پاس ہے وہ ہے کس کا؟ کیا تمہارا اور فرخ کا نہیں ہے؟ ضرورت ہے! ——— لیکن حساب کتاب کا معاملہ صاف ہی رہنا چاہیئے، نفع اگر چھوڑ دوں، اور زرِ اصل پر اکتفا کروں تو یہ ہزاروں روپیہ کا گھاٹا کیسے برداشت کر لوں؟ ——— یہ نہیں ہو سکتا، میری یہ بات تمہیں ماننی ہی پڑے گی، مجھ سے زیادہ تمہارا اس میں فائدہ ہے!"

سلمیٰ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، وہ پھر رحم کی اپیل کرنے والی تھی کہ فرخ نے معاملہ ختم کر دیا، اس نے سلمیٰ کے ہاتھ سے کاغذ لیا اور اس پر دستخط کر دیئے پھر سلمیٰ سے کہا۔

"دستخط کر دیجئے۔ اگر خدا مہربان ہوگا تو ایسے ایسے کئی باغ، اور ایسی ایسی بہت سی دوکانوں کی آپ مالک بن جائیں گی!"

اب سلمیٰ نے بحث بے نتیجہ دیکھی اور دستخط کر دیئے، امجد نے کاغذ موڑ کر جیب میں رکھتے ہوئے فرخ کی پیٹھ ٹھونکی۔

"شاباش با حوصلہ نوجوانوں کو ایسا ہی ہونا چاہیئے ——— سنتی ہو سلمیٰ بیٹی، میرا اس وقت کا طرزِ عمل تمہیں ناگوار ہوگا، لیکن ایک وقت آئے گا کہ تم مجھے دعا دو گی، میں نفع کیا، زرِ اصل بھی چھوڑ سکتا ہوں کہو تو ابھی چھوڑ دوں لیکن اس طرح فرخ نکما ہو جائے گا، اس کی خود اعتمادی رخصت ہو جائے گی، وہ دوسروں سے رحم و کرم کی بھیک مانگے گا۔ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی طاقت سے محروم ہو جائے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ ایسا ہو، اسی لئے بے مروت بن کر میں نے اس وقت یہ دستبرداری لکھائی ہے۔ اب فرخ محسوس کرے گا اس کے پاس کچھ نہیں ہے، کوئی جائیداد نہیں، املاک نہیں، باغ نہیں دوکان اور نقد نہیں، اسے کنواں کھودنا ہے، اور پانی پینا ہے، اس طرح اس میں جذبۂ کار پیدا ہوگا، استقلال پیدا ہوگا، خود اعتمادی پیدا ہوگی، وہ کچھ بن جائے گا ———

اور جب وہ بن جائے گا تو وعدہ کرتا ہوں کہ یہ کاغذ، یہ دستبرداری کا کاغذ پھاڑ کر پھینک دوں گا، تمہارا باغ تمہیں مبارک، تمہاری دو کانیں پھر تمہارے قبضہ میں ہوں گی!"

سلمیٰ نے ان باتوں کا کوئی جواب نہ دیا۔

ذرا دیر توقف کرکے امجد نے کہا۔

"بیٹے فرخ ابھی تمہارا ایک امتحان اور باقی ہے!"

فرخ سوالیہ نظروں سے امجد کی طرف دیکھنے لگا۔ امجد نے پھر جیب میں ہاتھ ڈالا، اور ایک کاغذ نکالتے ہوئے کہا۔

" احمد نے مرنے سے چھ مہینہ پہلے اس مکان پر مجھ سے سات ہزار روپے قرض لئے تھے، پانچ سو اس سے پہلے کے چلے آرہے تھے، پانچ سو نفع سمجھ لو یہ آٹھ ہزار ہوئے، یہ مکان جب احمد کے قبضہ میں آیا تھا، تب اس کی قیمت پندرہ ہزار کی تھی، لیکن پھر کبھی اس کی مرمت تک نہ ہوئی، اب اس کی مالیت زیادہ سے زیادہ دس ہزار کی ہوگی (جیب سے دو ہزار کے نوٹ نکال کر میز پر رکھتے ہوئے) یہ دو ہزار لے لو، اور مکان سے دستبردار ہو جاؤ، سلمیٰ اگر اس میں رہتے پر بضد ہیں تو مجھے اعتراض نہیں، تمہیں اپنے ٹیوشن میں سے پچیس روپے ماہوار مجھے بطور کرایہ دینا پڑیں گے، ورنہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر وہ فیروز آباد ہی میں رہنا چاہتی ہیں، تو صمد کے ہاں اٹھ آئیں، میں کوئی دوسرا کرایہ دار تلاش کرلوں گا اور اسے چالیس روپے ماہوار سے کم پر نہیں دوں گا!"

فرخ نے جواب دیا۔

"اگر آپ نے مسودہ لکھ لیا ہو تو لایئے دستخط کردوں گا۔"

سلمیٰ چیخ پڑی۔

"مکان بھی؟"

اور وہ رونے لگی۔

امجد نے روپے جیب میں رکھ لئے۔

"سوچ لو، میں جبر نہیں کرتا ــــــ!"

فرخ نے قلم ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"سوچنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں آپ کی تجویز منظور کرتا ہوں!"

صمد اب تک خاموش تھا، اب وہ بولا، اس نے فرخ سے کہا۔

"ٹھہرو!"

پھر امجد سے کہا۔

تقسیم جائیداد کے وقت آپ نے آٹھ ہزار روپے کا تمسک مجھے لکھ کر دیا ہے۔

امجد نے اقرار میں گردن ہلائی۔

"ہاں دیا تھا!"

صمد نے کہا۔

"وہ تمسک لے لیجئے اور احمد بھائی کا پرونوٹ مجھے دے دیجئے۔"

امجد نے ایک نظر صمد پر ڈالی، پھر کہا۔

"ہاں یہ ہو سکتا ہے!"

صمد نے تمسک دے دیا، امجد نے پرونوٹ، پھر دونوں نے تمسک اور پرونوٹ کو چاک کر کے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔

(۱۲)

سلمیٰ اور فرخ اپنے غم خانہ میں واپس آ گئے، امجد اور صمد بیٹھے رہ گئے
تھوڑی دیر کے بعد امجد بولا۔
"جاؤں ذرا بازار ہو آؤں، صبح تڑکے روانہ ہونا ہے، پھر وقت نہیں ملے گا۔
مریم، اور نسیم میاں کی کچھ فرمائشیں خریدنا ہیں!"
صمد نے اجازت دے دی،
"ضرور تشریف لے جایئے ـــــ لیکن بھائی صاحب آپ کے طرزِ عمل
سے مجھے تکلیف پہنچی، سلمیٰ بھابی اور فرخ کے ساتھ یہ برتاؤ نہ کرنا چاہیئے تھا!"
امجد جاتے جاتے بیٹھ گیا، اس نے کہا۔
"مجھے خوشی ہے کہ تم نے دل کی بات چھپائی نہیں ظاہر کردی!"
"میری یہ عادت ہی نہیں ہے!"
"میں جانتا ہوں، میں جانتا ہوں!" ـــــ تمہیں میرے طرزِ عمل سے
تکلیف پہنچی اور مجھے تمہارے رویہ نے باغ باغ کردیا، تم میرا مطلب
نہ سمجھتے ہوئے بھی اسی راہ پر چلے جس پر میں چلانا چاہتا تھا!"
(حیرت سے) بھائی صاحب آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"
"(ہنستے ہوئے) مطلب فرخ میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔ وہ تو
میرے سخت رویہ سے حاصل ہو گیا، لیکن سلمیٰ بہرحال عورت ہے، وہ رونے

لگی۔ فرخ۔ بہر حال ابھی لڑکا ہے اس کے چہرے پر مایوسی کے آثار نمایاں ہو گئے، یہ دیکھ کر میں سخت پریشان ہوا، اگر بڑھا ہوا قدم پیچھے ہٹاتا ہوں، تو فائدہ کے بجائے نقصان پہنچے گا، فرخ نکما اور مجہول ہو کر رہ جائے گا۔ سلمیٰ مفت توری کو اپنا حق سمجھنے لگے گی ـــــ میاں صمد سمجھ رہے ہو، میں کیا جھک مار رہا ہوں!"

"جی ـــــ فرماتے جائیے!"

"(مسکراتے ہوئے) گویا تم نے یہ تسلیم کر لیا کہ میں جھک مار رہا ہوں۔ اچھا بھئی یہی سہی ہم اس میں بھی خوش ہیں!"

"بھائی صاحب میرا یہ مطلب تو نہ تھا جو آپ ـــــ!"

"(ہنستے ہوئے) ارے بھائی جانتا ہوں کہ تمہارا یہ مطلب نہ تھا اب میں اتنا بھی نہ جانوں گا، بالکل ہی مجھے گاؤدی سمجھ لیا ہے؟ میں نے تو یونہی ہنسی میں ایک بات کہہ دی تھی۔"

"جی ـــــ تو آپ کیا فرما رہے تھے؟"

"ارے میاں فرماؤں گا کیا، ہاں تو یہ کہہ رہا تھا کہ میں اس وقت جب میں یہ غلط فیصلہ کرنے والا تھا کہ سلمیٰ اور فرخ کو سارا قرض معاف کر دوں۔ تم آگے بڑھے اور تم نے آٹھ ہزار کا میرا تمسک واپس کر کے اور اس طرح احمد کا قرض ادا کر کے گرتی ہوئی عمارت کو تھام لیا!"

"لیکن اس میں آپ کو مصلحت کیا نظر آ رہی ہے، میرے پیشِ نظر تو کوئی مصلحت نہ تھی، سوا جذبہ ہمدردی کے! ـــــ سلمیٰ بھابی کے آنسو دیکھ کر میرا دل تڑپ گیا!"

"جانتا ہوں تم کتنے رقیق القلب ہو، چیونٹی بھی اگر تمہارے پاؤں تلے کچل جائے تو ساری رات سو نہ سکو گے، آج سے نہیں بچپن سے تمہارا یہی حال ہے، اکثر سوچا کرتا ہوں، ہمارے گھر میں صمد نام کا فرشتہ کیسے پیدا ہو گیا میرا مطلب آ رہا ہے نا سمجھ میں۔"

"جی سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں!"

"بس تو پھر سمجھ جاؤ گے ـــــ ہاں تو تمہارے اس طرزِ عمل نے گرتی ہوئی

عمارت کو تھام لیا ——— کیا سمجھے؟"

"کچھ نہیں!"

"(ہنستے ہوئے) بہت سے شاعر بڑا اچھا شعر کہہ جاتے ہیں، لیکن اس کا مطلب خود ان کی سمجھ سے بالاتر ہوتا ہے، تم نے ایک بڑی اونچی، اور مبنی بر مصلحت بات کی، لیکن اس کے دُور رس نتیجہ تک تمہاری نظر نہ جا سکی۔

"جی ہاں مجھے اس کا اعتراف ہے!"

"وہ دُور رس نتیجہ کیا ہے؟ ——— میں بتاؤں؟ بتادوں؟"

"ضرور ارشاد فرمایئے!"

"وہ یہ تھا کہ خلا پُورا ہوگیا، میری سختی سے جو خلا پیدا ہُوا تھا، وہ تمہاری فیاضی سے پورا ہوگیا، تربیت ہوتی، اسی طرح ہے کہ ماں اگر اولاد پہ سختی کرے تو باپ نرمی سے پیش آتا ہے، باپ اگر درشت مزاج ہو تو ماں مہربان ہوتی ہے، میری سختی اور درشتی کی تم نے تلافی کردی، سلمیٰ کا ٹوٹا ہوا دل جُڑ گیا، فرخ کے مایوس چہرے پر امید کی رونق آگئی سلمیٰ اور فرخ کی یہ کیفیت دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہوتی ہے، اس کا اندازہ تم نہیں کر سکتے!"

"واقعی اس کا اندازہ کرنا میرے لئے مشکل ہے!"

"ہاں میاں کر لو چوٹ ہمارے اوپر، اب اتنے بھی ہم بے وقوف نہیں، کہ اس بھرپور طنز کو محسوس نہ کر سکیں، لیکن میرے عزیز، میرے بھائی میرا ضمیر مطمئن ہے!"

"میرا خیال ہے آپ کا ضمیر آج سے نہیں ہمیشہ سے مطمئن ہے۔ آج ہی نہیں، ہمیشہ مطمئن رہے گا!"

پھر وہی تعریض!"

"یہ جرأت آپ ہی نے مجھے دلائی ہے، ابھی تو آپ میری تعریف کر رہے تھے کہ میں دل کی بات چھپاتا نہیں ظاہر کر دیتا ہوں!"

ہاں بھئی میں نے تعریف کی تھی، اب بھی کرتا ہوں، اور ہمیشہ کرتا رہونگا۔ لیکن اس کے معنی یہ تو نہیں ہیں کہ زور سے میرے گال پر ایک طمانچہ جڑ دو۔

میں پوچھوں بھیّا یہ کیا؟ اور تم جواب دو، دل کی بات ہاتھ پر آگئی، اس طرح تو تم مجھے زندہ درگور کردو گے!"

"بھائی صاحب ایسا تو نہیں ہے، بھلا میں ایسی گستاخی کر سکتا ہوں؟"

"اچھا بھئی میری غلط فہمی ہوگی، سٹھیا گیا ہوں، مریم کا بھی یہی خیال ہے اس نیاز مند قدیم کے لئے!"

"بھائی صاحب ایسا نہ کیجئے، وہ تو آپ کا بڑا ادب کرتی ہیں؟"

"(ہنستے ہوئے) ادب کرتی ہیں، ہاں بھائی جھوٹ نہیں بھولوں گا بے شک میرا ادب کرتی ہیں لیکن جانتے ہو کب تک؟"

"کب تک؟ یعنی اس کی بھی کوئی حد اور کوئی وقت مقرر ہے؟"

"اور کیا، جب تک تمہارا ذکر درمیان میں نہ آئے!"

"(حیران ہوکر) میرے ذکر کا اس سے کیا تعلق؟"

"بہت گہرا تعلق ہے برخوردار ——— (ٹھنڈی سانس لے کر) میں اگر نسیم کو کند چھری سے ذبح کردوں تو بھی وہ اللہ کی بندی اُف نہیں کرے گی۔ لیکن اگر تمہیں کچھ کہہ دوں تو خون اُتر آئے گا اس کی آنکھوں میں!"

"کیا آپ مجھے کچھ کہتے ہیں ——— ؟"

"ہاں بھئی کیوں نہیں کہتا؟ کہتا ہوں اور ڈنکے کی چوٹ کہوں گا کیا تم میری زبان بند کرلو گے؟ ابھی پچھلی عید کا واقعہ ہے، مریم نے سویوں کا زردہ پکایا، ظالم کے ہاتھ میں وہ لذت ہے کہ کیا کہوں؟ مجھ قسمت کے مارے نے کہیں تعریف کردی، فرمانے لگیں ایک آہ سرد کے ساتھ بھیّا کو یعنی صمد میاں کو سویوں کا زردہ بہت پسند ہے، انہیں کس طرح بھیجوں؟ میں نے یونہی مذاق میں کہہ دیا، بذریعہ رجسٹری پارسل کردو، ارے صاحب بارود میں جیسے کسی نے آگ لگادی ہو، میرے سامنے سے وہ لذیذ طشتری اُٹھا کر جو پھینکی ہے تو وہ اڑن طشتری بن گئی، فرمانے لگیں، تم تو اس سے جلتے ہو!" ——— سُنا صمد میاں میں تم سے جلتا ہوں ——— ہاہاہا ———!"

(۱۳)

دوسرے روز امجد نے رحمت پورہ کی راہ لی، کل صبح سے اب تک غزالہ سامنے نہیں آئی تھی، امجد کی موجودگی میں تو صمد زیادہ محسوس نہ کر سکا لیکن اس کے جانے کے بعد اس نے سوچا کیا بات ہے جو غزالہ نظر نہیں آتی؟ وہ سیدھا اس کے کمرہ میں پہنچا، اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ غزالہ کی آنکھیں روتے روتے سوج گئی ہیں، اور آنسو ہیں کہ مسلسل بہے جا رہے ہیں، اضطراب کے عالم میں صمد اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا، شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

" بیٹی رو کیوں رہی ہو؟ "

وہ اور زیادہ رونے لگی، صمد نے پوچھا۔

" نہیں بتاؤ گی؟ کیا میرے رونے کا تماشہ بھی دیکھنا چاہتی ہو؟ "

غزالہ نے جلدی سے آنسو پونچھ لئے، بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

" لیجئے، اب نہیں روتی! "

صمد نے کہا۔

" جھوٹ مت بولو تم اب بھی رو رہی ہو، میں اس کا سبب معلوم کرنا چاہتا ہوں! "

اس نے ایک مرتبہ پھر آنسو پونچھے، اور بسورتی ہوئی بولی۔

" آج اماں اگر زندہ ہوتیں تو میری ایسی ذلت نہ ہوتی! "

"ذلّت؟" ـــــ کس نے تمہاری ذلّت کی میری روح؟"

"کیا آپ نے چچا جان کے الفاظ نہیں سنے تھے؟"

"اوہ ـــــ ہاں تم تو چلی آئیں، لیکن سلمٰی بھابی نے اسی وقت ان کی غلط فہمی رفع کر دی تھی!"

"(غصّہ سے) انہیں اس طرح کی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا حق کیا تھا؟ انہوں نے مجھے سمجھا کیا تھا؟"

"بیٹے، بوڑھے آدمی ہیں، اور بزرگوں کی بات کا بُرا نہیں مانا کرتے!"

"ابا جان، میری حالت کیا ہو رہی ہے، میں اُسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی، بھرے مجمع میں اس طرح ذلیل اور رکیک پیرایہ میں مجھ پر تہمت دھرنا کوئی اچھی بات تھی؟ کیا بزرگ ایسے ہی ہوا کرتے ہیں؟"

"لیکن بیٹی ـــــ!"

"آپ بیٹھے تھے، سلمٰی بچی موجود تھیں، فرخ بھائی تشریف رکھتے تھے، ان سب کے سامنے کس اطمینان سے ایسی سنگین بات کہہ دی، جیسے سوچ سوچ کر میں گڑی جا رہی ہوں ـــــ کئی مرتبہ خدا سے دُعا کر چکی ہوں کہ مجھے موت دے دے!"

"ارے ارے بیٹی کچھ دیوانی ہو گئی ہو، اتنی معمولی سی بات پر اتنا صدمہ؟"

"یہ معمولی سی بات ہے؟"

"نہ ہو گی ـــــ تم جانتی ہو میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں، تم پر کتنا اعتماد کرتا ہوں، کیا میں اتنا بے وقوف اور سادہ لوح تھا کہ سلمٰی بھابی اگر تردید نہ کرتیں تو یقین کر لیتا؟ وہ بھی اگر بھائی صاحب کی تائید کرتیں تو بھی یقین نہ کرتا، میں جانتا ہوں اپنی بیٹی کو، اپنی عزالہ کو! ـــــ چلو تمہیں گھما کر لائیں!"

عزالہ باپ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی، صمد نے کہا۔

"امجد بھائی نے تمہارا دل تو کیا توڑا، سچ پوچھو تو سلمٰی بھابی، اور فرخ کو کہیں کا نہ رکھا، اس بیوہ عورت اور یتیم لڑکے سے سب کچھ چھین لیا غضب

خدا کا، سگی بھاوج، سگا بھتیجا اور اس سے زرا صل کے علاوہ ایک ایک پائی بڑی سے بڑی شرح سود سے بھی زیادہ منافع کے نام سے وصول کر لی اور ان بیچاروں نے اُف تک نہ کی، چلو سلمیٰ بھابی کے یہاں ہا رکھ آئیں!"

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلئے آپا جان!"

---

(۱۴)

صمد اور غزالہ، سلمٰی کے ہاں پہنچے، وہ باورچی خانہ میں بیٹھی کھانا پکا رہی تھی، فرخ باہر صحن میں باورچی خانہ کے دروازہ کے پاس ہی کرسی ڈالے بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا، صمد کو آتا دیکھ کر اس نے چپکے سے ماں سے کہا۔

"چچا میاں آرہے ہیں!"

سلمٰی نے پتیلی ویسے ہی چولھے پر چھوڑ دی، اور دوپٹہ سنبھالتی ہوئی باہر آگئی، صمد سے اس نے کہا۔

"آؤ بھیا!"

پھر غزالہ کو دیکھ کر اس کی طرف لپکی،

"میری بچی بھی آئی ہے!"

پھر وہ ان دونوں کو لے کر بیٹھنے کے کمرہ میں آگئی، فرخ بھی ساتھ ساتھ آیا۔ سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے، پھر یکایک جیسے سلمٰی کو کچھ یاد آگیا، وہ "ابھی آئی" کہہ کر باہر چلی گئی اور ذرا دیر میں چائے تیار کر کے لے آئی، غزالہ نے کہا۔

"آپ نو خواہ مخواہ تکلیف کرتی ہیں، ہم ابھی پی کر آئے ہیں!"

صمد نے کہا،

"بھابی یہ جھوٹ بولتی ہے، اس نے کل سے ایک لقمہ بھی نہیں توڑا بالکل فاقہ سے ہے!"

سلمٰی نے گھبراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"کیوں خیریت تو ہے؟ کچھ طبیعت نادرست ہے میری بچّی کی؟"

صمد نے جواب دیا۔

"جی ہاں ـــــ بہت زیادہ!"

سلمٰی نے پوچھا۔

"آخر کیا بات ہے کچھ کہو بھی تو بھیّا!"

صمد نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ بھائی صاحب سے بہت خفا ہے، کل سے نہ کمرہ سے باہر نکلی ہے، نہ کھانا کھایا ہے، نہ ناشتہ کیا ہے، اتنی حساس لڑکی ہے کہ خدا کی پناہ میں تو سمجھاتے سمجھاتے عاجز آگیا، پھر یہاں لے آیا کہ آپ سے ذرا زیادہ مانوس ہے، جی بہل جائے گا اس کا!"

"بڑا اچھا کیا ـــــ اور بھیّا سچ پوچھو تو بھائی صاحب نے بڑی ناجائز اور ناروا بات کی تھی، فرخ کو بھی بہت صدمہ ہے!"

صمد نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یک نہ شد دو شد، ہم تو غزالہ ہی کے لئے پریشان ہو رہے تھے، یہ حضرت بھی اٹّواٹی کھٹواٹی لے کر پڑ گئے ـــــ بھائی صاحب کا تو دماغ چلا ہوا ہے، ان کی باتوں کا بُرا ماننا کیا!"

سلمٰی کہنے لگی،

"ہاں دیکھنے میں تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، لیکن لین دین میں تو بڑے بڑے ہوشیاروں کے کان کاٹتے ہیں۔"

صمد ہنسنے لگا، سلمٰی نے آنکھوں آنکھوں میں فرخ سے کچھ کہا، وہ جھپک کر اٹھا اور تیزی سے باہر چلا گیا، سلمٰی نے چائے بنانی چاہی، مگر کیتلی اس کے ہاتھ سے غزالہ نے لے لی،

"آپ رہنے دیجئے، میں بناؤں گی!"

سلمٰی نے محبت بھری نظروں سے غزالہ کو دیکھا، اور کیتلی اسے تھما دی،

اس نے چار پیالیاں بنائیں، ایک صمد کو دے دی، ایک سلمٰی کے سامنے رکھ لی، ایک اپنے سامنے بڑھالی، پھر پوچھا۔

" فرح بھائی کہاں چلے گئے، کیا وہ چائے نہیں پئیں گے ؟"

سلمٰی نے اپنی پیالی سے ایک گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

" ابھی آتا ہے، پی لے گا، تم تو پیو!"

غزالہ کی حلق سے پہلا گھونٹ اُترا ہوگا، کہ فرح ہاتھ میں ایک دونا لئے ہوئے نمودار ہوا، گرما گرم، تازہ بہ تازہ جلیبیاں دونے سے نکال کر اس نے پلیٹ میں رکھ دیں، اور غزالہ کی طرف بڑھادیں، غزالہ نے سلمٰی سے کہا۔

" یہ لیجئے ــــــ بھلا اس کی کیا ضرورت تھی!"

سلمٰی نے کہا۔

" غضب خدا کا تو کل سے فاقہ ہے، اور یوں بحث کئے جا رہی ہے ؟ــــ کھالے بیٹی، ذرا کلیجہ ٹھہر جائے گا، پھر میں ابھی لپ جھپ کھانا تیار کئے دیتی ہوں ــــ!"

" نہیں چچی جان، اب اتنی ساری جلیبیوں کے بعد کھانا کس پیٹ میں کھاؤں گی، کھانے کی تکلیف ہرگز نہ کیجئے۔"

سلمٰی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

" جیسے میں تیرا حکم مان ہی تو لوں گی!"

صمد نے مداخلت کی،

" ہاں بھابی، ہم کھانا کھا کر جائیں گے، لیکن شرط یہ ہے کہ تکلف نہ ہو بس بالکل سادہ سا کھانا چاہیئے!"

سلمٰی نے کہا۔

" بھیّا یہاں دال روٹی کے سوا اور ملے گا کیا ؟"

غزالہ بولی۔

" لیکن اس میں گوشت اور شیرمال سے زیادہ مزا ہوگا!"

" اچھا لڑکی تو اپنا کام کر، جلیبیاں ٹھنڈی ہو جائیں گی، تو سارا مزہ جاتا رہیگا۔"

صمد نے پھر مداخلت کی۔

"یوں کہئے کہ کرکرا ہو جائے گا!"

سلمیٰ کے ہونٹوں پر سوگوار سا تبسم نمودار ہوا۔

"ہاں اور کیا!"

غزالہ نے جلیبی کی پلیٹ فرخ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپ بھی تو کھایئے فرخ بھائی!"

فرخ نے کہا۔

"تم کھاؤ، میں کھا چکا ہوں!"

بے ساختہ غزالہ کے منہ سے نکلا،

"کیا راستہ میں کھاتے ہوئے آئے تھے؟"

فرخ جھینپ سا گیا، سلمیٰ مسکرانے لگی، صمد نے ایک قہقہہ لگایا۔

"چوری پکڑی گئی، فرخ میاں تمہاری ـــــ سچ کہنا کتنی کھائی تھیں!"

سلمیٰ اُٹھ کھڑی ہوئی اور فرخ سے کچھ اشارہ کرتی گئی، اس کے جاتے کے ذرا دیر بعد فرخ اُٹھ گیا، فرخ کے جانے کے بعد سلمیٰ آکر بیٹھ گئی اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ کوئی پندرہ منٹ میں فرخ واپس آگیا۔ سلمیٰ اس کے آنے کے بعد کوئی دو منٹ بیٹھی ہو گی کہ پھر چلی گئی۔ سلمیٰ کے جانے کے بعد صمد نے فرخ سے پوچھا۔

"تو بی اے میں پڑھ رہے ہو تم؟"

"جی ہاں!"

"آرٹ یا سائنس؟"

"آرٹ!"

"بی اے کے بعد کیا ارادہ ہے؟"

"چچا میاں یہ تو حالات پر منحصر ہے!"

"لیکن حالات خود ہی پیدا کئے جاتے ہیں، تم وہی بنو گے جو بننا چاہو گے۔ حالات تو تمہارے تابع ہیں!"

"بجا ارشاد ہوا ـــــ میرا ارادہ تو سپیریر سروس کے امتحانی مقابلہ میں بیٹھنے کا ہے!"

"ضرور بیٹھو، خدا نے چاہا تو کامیاب ہو گے، حوصلہ بلند رکھنے کی ضرورت ہے!" ؎

ہمت بلند دار کہ پیش خدا و خلق باشد بقدر ہمت تو اعتبار تو!

دُعا کیجئے، خدا میرے ارادوں میں کامیابی عطا فرمائے!"

"ہاں بیٹے ہم دُعا کرتے ہیں تم کوشش کرو، یہ دونوں چیزیں جب مل جاتی ہیں!" تو بیڑا پار ہو جاتا ہے۔

"بے شک!"

"اب جمال پور کب جانے کا ارادہ ہے ـــــ!"

"ابھی ایک مہینہ کی چھٹی باقی ہے، اگلے مہینہ کی دس تاریخ تک جاؤں گا، اس عرصہ میں ذرا ماں کی طبیعت بہل جائے گی، ہر وقت رویا کرتی ہیں!"

(آہِ سرد کے ساتھ) ہاں بیٹے، سلمیٰ بھابی پر تو غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ بڑی باحوصلہ خاتون ہیں، کس استقلال کے ساتھ یہ مصائب جھیل رہی ہیں!

اتنے میں سلمیٰ آئی، اُس نے دروازہ پر کھڑے کہا۔

"آؤ کھانا تیار ہے!"

سب لوگ دوسرے کمرہ میں پہنچے؛ یہاں ایک میز پر کھانا لگا ہوا تھا۔ دھوئی ماش کی بھریری دال، ڈیڑھ گردوں کے آٹھ تلے ہوئے ٹکڑے، آلو کا بھرتا، مٹر قیمہ، گرم گرم پھلکے، سادہ چاول، رو کا تھوڑا سا حلوہ!

صمد نے میز پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بھابی اگر سادہ کھانا یہ ہے تو پُرتکلف کھانا کیسا ہونا ہے؟"

سلمیٰ نے کہا۔

"بھیا کیوں بناتے ہو؟ دال تو میں پکا رہی تھی، آدھ پاؤ قیمہ بھون دیا۔ غزالہ گردے شوق سے کھاتی ہے، دو گردے اس کے لئے منگا کر تل دیئے۔ اللہ اللہ خیر صلا ـــــ فرخ میاں، گردے صرف غزالہ کے ہیں، تم قیمہ سے

شوق کرو!"

فرح کا بڑھا ہوا ہاتھ رُک گیا، غزالہ نے گردے کے تین ٹکڑے فرح کی پلیٹ میں رکھ دیئے۔

"کھایئے فرح بھائی ——— واہ چچی جان اتنے سارے میں کیسے کھالوں گی؟"

---

(۱۵)

کھانے کے بعد صمد نے سلمیٰ سے کہا۔
" بھابی میری ایک تجویز ہے، اگر آپ منظور کرلیں!"
سلمیٰ کو امجد سے جتنی بے اعتباری تھی، صمد پہ اتنا ہی بھروسہ تھا، کہنے لگی۔
" بھیا ایسا ہوسکتا ہے کہ تم کوئی بات کہو، اور میں اسے نہ مانوں؟"
صمد نے کہا،
" تو پھر میری تجویز ہے، آپ یہ گھر چھوڑ دیں!"
سلمیٰ کا دل دھڑکنے لگا۔ صمد پہ اُسے جو اعتماد تھا متزلزل ہونے لگا۔ کیا یہ بھی دوسرا امجد ثابت ہوگا؟ امجد کو میری طرف سے آٹھ ہزار دے کر، یہ اس مکان پر دانت لگائے بیٹھا ہے، اس نے بڑی حسرت سے پوچھا۔
" بھیا یہ گھر چھوڑ دوں؟"
صمد نے بے تامل جواب دیا۔
" میری رائے یہی ہے!"
" پھر رہوں گی کہاں؟"
" کیا میرا گھر آپ کا گھر نہیں ہے؟ ــــ اتنا بڑا سا گھر، بس ہوں یا غزالہ یا چند نوکر، نوکرانیاں، یہ وسیع اور کشادہ گھر مکینوں کے بغیر بھائیں بھائیں

کرتا رہتا ہے، غزالہ بھی تنہا پڑے پڑے اُکتا جاتی ہے، میں تو دن بھر دوکان پر رہتا ہوں، آپ آجائیں گی تو اس کا جی بہلے گا۔ آپ کو ایک ساتھی مل جائے گا، پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ہانڈی چولہے کے جھنجھٹ سے آپ بچ جائیں گی۔!"

پھر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ الگ بات ہے کہ آپ غزالہ کے لیے بھی کُر دے، اور میرے لیے کبھی حلوا بنا لیا کریں!"

سلمیٰ کا دل ناتواں ان باتوں سے بھر گیا، وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو ملامت کرنے لگی کہ اس نے صمد جیسے پاک نہاد اور شریف شخص کے بارے میں ایسے اندیشہ ہائے دروازہ سے کام لیا، یکایک اُس کے کانوں میں صمد کی آواز آئی وہ کہہ رہا تھا۔

"غزالہ کو میں نے حتی الامکان بڑی اچھی تربیت دی ہے، وہ بڑی نیک اور پیاری لڑکی ہے، پکانا ریندھنا اور سینا پرونا بھی میں نے کئی کئی عورتوں کو رکھ کر اسے سکھلایا ہے، اور ماشاءاللہ ان سب چیزوں میں وہ برق ہو گئی ہے ـــــ لیکن اس کی سب سے بڑی ٹریجڈی آپ جانتی ہیں کیا ہے؟"

"بتاؤ بھتیا، میں تو نہیں جانتی!"

صمد نے گلوگیر آواز سے کہا،

"میری بچی، غزالہ کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ اسے محبت کرنے والا باپ تو مل گیا، لیکن جان چھڑکنے والی ماں نہ مل سکی، عذرا کا جب انتقال ہوا تو اس کی عمر مشکل سے دس سال کی ہوگی، اب ماشاءاللہ جوان ہے، وہ دن ہے اور آج کا دن، غزالہ کو ماں کی مامتا نہ میسر آسکی!"

اب صمد کی آنکھیں پرنم ہو چکی تھیں، اُس نے رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ آپ آجائیں گی تو یہ کمی بھی پوری ہو جائے گی، میں غزالہ کو ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن وہ بجھی بجھی سی رہتی ہے۔ آپ سے وہ دل کی بات کہہ سکے گی، آپ کو نخرے دکھا سکے گی، آپ کے سامنے

مچل سکے گی، آپ سے اپنی بات منوا سکے گی۔ لیکن میرے سامنے تو وہ سر جھکائے بیٹھی رہتی ہے، میں کچھ پوچھتا ہوں تو جواب دے دیتی ہے، ورنہ پھر خاموش، آپ آجائیں گی تو وہ بلبل کی طرح چہکنے لگے گی ـــــ کیوں بیٹی!"

غزالہ کی آنکھیں بھی اس عرصہ میں پُر نم ہو چکی تھیں۔ لیکن اپنی کیفیت پر وہ غالب آگئی، اس نے بچوں کی طرح مچلتے ہوئے کہا۔

"چچی اماں آپ کو ہمارے ہاں آنا ہی پڑے گا ـــــ میری چچی اماں!"

سلمیٰ نے جواب دیا۔

"بیٹی میں تجھ پر قربان، تیرے لئے ضرورت ہو تو اپنی جان بھی دے سکتی ہوں!"

فرخ اب تک خاموش بیٹھا تھا، اب اس نے زبان کھولی۔

"وہ تو معلوم ہے، لیکن اصل سوال کا جواب بھی تو دیجئے!"

سلمیٰ ہنسنے لگی، اس نے صمد سے کہا۔

"دیکھتے ہو اس لڑکے کو؟ بہن کے لئے مجھ سے لڑنے مرنے کو آمادہ ہے۔!"

غزالہ نے پھر چھیڑا،

"تو چچی اماں بتایئے، پھر کب آرہی ہیں آپ!"

سلمیٰ نے جواب دیا۔

"جب کہو بیٹی! ـــــ مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، تو میری آنکھوں کا نور ہی تو ہے!"

غزالہ شرما کر مسکرانے لگی۔

سلمیٰ نے صمد سے پوچھا۔

"لیکن بھیا اس گھر کا کیا ہوگا؟"

صمد نے جواب دیا۔

"اسے کرایہ پر اُٹھا دیجئے گا، تیس چالیس روپے ماہوار تو کرایہ آہی جائے گا!"

فرخ نے بھی اس تجویز کی تائید کی۔

"جی ہاں یہ بڑی معقول تجویز ہے!"
صمد نے فرخ سے کہا۔
"بیٹے، اب میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں!"
وہ سراپا گوش ہو بیٹھا، اس نے کہا۔
"فرمائیے!"
صمد نے کہا۔
"میری رائے ہے جو ٹیوشن تمہیں ملے ہیں وہ چھوڑ دو!"
فرخ نے کہا۔
"لیکن ——!"
لیکن صمد نے بات پوری نہ ہونے دی، وہ بولا۔
"جو وقت تم دوسروں کو پڑھانے میں صرف کرو گے، وہ خود پڑھنے میں صرف کرو، یہ بالکل نامناسب ہے کہ تم خود بھی اپنے امتحان کے لئے اتنی محنت کرو، اور پھر آرام کرنے کے بجائے دوسروں کو پڑھانے اور رٹانے کے سلسلہ میں اپنا دماغ کھپاؤ اور قیمتی وقت ضائع کرو۔"
سلمیٰ کہنے لگی۔
"یہ تو میں بھی کئی مرتبہ کہہ چکی ہوں، اس لڑکے سے، مگر اسے تو کمانے کی ہوس ہے!"
صمد نے کہا۔
"یہ جذبہ مبارک ہے، میں اس کی قدر کرتا ہوں، لیکن بیٹے کمانے کے لئے ساری عمر پڑی ہے، کماتے رہنا یہ زمانہ تو پڑھنے کا ہے پڑھو!"
فرخ نے بتایا۔
"چچا جان، یہ تو صحیح ہے لیکن صورت حال یہ ہے کہ کھانا نانی کے ہاں کھاتا ہوں، ان پر یہ بوجھ ڈالتے شرم آتی ہے، لیکن مجبور ہوں، ان بیچاری کی خود ہی حالت کون سی اچھی ہے۔"
سلمیٰ بول پڑی۔

"ہاں اور کیا مولی، آپ اپنے پتّوں سے بھاری ہے!"
فرخ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔
"کالج کی فیس پرنسپل صاحب نے ازراہِ عنایت معاف کردی ہے اس لئے کہ وہ میری محنت سے بہت خوش ہیں، دوسرے لڑکوں کے سامنے مجھے بطورِ مثال کے پیش کرتے ہیں۔"
صمد کے منہ سے نکلا۔
"خدا نظرِ بد سے بچائے!"
فرخ نے کہا۔
"لیکن کتابیں خریدنا پڑتی ہیں، کاپیاں، کاغذ، قلم و دوات، یونین کی فیس، کپڑوں کی دھلائی، ان سب کی مجموعی میزان پچاس کے لگ بھگ بن جاتی ہے، بڑی مشکل سے پندرہ روپے بچا کر اس میں سے اماں کو دے سکوں گا!"
صمد یہ ساری تفصیلات بڑے غور اور توجہ سے سنتا رہا، پھر وہ گویا ہوا۔
"مجھے ان مصارف سے انکار نہیں میں نے جب یہ تجویز تمہارے سامنے رکھی تھی کہ ٹیوشن ترک کردو، اس وقت فیصلہ کرلیا تھا کہ تمہارے سارے مصارف میں برداشت کروں گا، خواہ پچاس روپے ہوں، یا سو روپے، یا اس سے بھی زائد —— رہیں سلمٰی بھابی تو ان کے لئے تمہیں فکرمند ہونے، یا انہیں کچھ بھیجنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، ہاں میں مر جاؤں تو بے شک ان کی خدمت کا فریضہ صرف تم ہی پر واجب ہوگا!"
سلمٰی یہ الفاظ سن کر دہل گئی، اس نے کہا۔
"بھیّا خدا تمہیں قیامت تک زندہ رکھے، ایسی باتیں کیوں کرتے ہو۔!"
صمد اٹھ کھڑا ہوا اور جاتے جاتے کہہ گیا۔
"کل صبح میرے آدمی آجائیں گے، آپ سامان تیار رکھئے گا!"
سلمٰی خاموش ہوکر اس کا منہ تکنے لگی، صمد نے کہا۔
"بھلا میری زندگی میں یہ کس طرح ممکن ہے کہ آپ اور فرخ اپنے آپ

کو بے سہارا محسوس کریں۔ فرخ میرے لئے وہی ہے جو غزالہ، میری کوئی بڑی بہن ہوتی تو صرف آپ ہوتیں!"

سلمیٰ کی آنکھوں میں گریۂ تشکر لہریں لینے لگا، صمد واپس آگیا۔

دَورِ آرزو

آج اُن کی نظر میں کچھ ہم نے
سب کی نظریں بچا کے دیکھ لیا

(۱)

غزالہ نے سلمیٰ کو ہاتھوں ہاتھ لیا، ایسے دلی جوش و خروش سے اس نے اپنی چچی کا خیر مقدم کیا، جیسے اس گھر میں عید آگئی ہو، سلمیٰ کی رائے صمد کے متعلق بڑی اچھی تھی، عذرا مرحومہ سے بھی اس کی شرافت اور نیکی کے سبب اُسے لگاؤ تھا، غزالہ بچپن میں بالکل چینی کی گڑیا معلوم ہوتی تھی، اسی وقت سے وہ اسے چاہنے لگی تھی، یہ چاہت، یہ لحاظ، یہ خیال، دُور کا تھا، سلمیٰ کو ان لوگوں کے ساتھ رہنے کا بہت کم اتفاق ہوا تھا، محسن علی جب تک زندہ رہے، تینوں بھائی ایک دوسرے سے کٹے کٹے تھے، اپنی پریشانی میں گم، اپنے حال میں مست، ایک دوسرے سے بے خبر، پھر ان کے انتقال کے بعد جب بٹوارہ ہوا تو تفرقہ مستقل ہوگیا، رحمت پور میں امجد کا ڈیرا پہلے ہی سے تھا، اب وہ وہاں کے مستقل مکین بن گئے، احمد اپنے حصہ کے مکان میں اٹھ آیا، اور صمد آبائی مکان میں اقامت گزیں ہوگیا، احمد اور صمد ایک شہر میں رہتے تھے، لیکن ہفتوں دونوں کی ملاقات نہ ہوتی، اور اگر کبھی بھولے بھٹکے ہو بھی جاتی تو یوں ہی سرسری طور پر اور شاید اس

کٹے کٹے اور الگ الگ رہتے میں ایک طرح کی جھجک بھی حائل تھی۔

وہ جھجک کیا تھی؟

امجد نے اپنا حصہ پورے سے بھی زیادہ لے لیا، سب سے زیادہ فائدہ میں امجد رہا تھا، جس نے زرخیز زمین اور باغ پر قبضہ کر لیا تھا، پھر احمد کا نمبر تھا، مکان کے علاوہ چار دوکانیں، اور ایک باغ، لیکن صمد کے حصہ میں مکان اور آٹھ ہزار روپے کے جبری تمسک کے سوا کچھ نہ آیا، صمد نے یہ تقسیم قبول تو کر لی، لیکن بھائیوں کی طرف سے اس کا دل میلا ہو گیا، امجد کو اس کی پروا نہ تھی، اور پھر ظاہر داری کے فن میں اسے وہ ملکہ تھا کہ جب چاہے دشمن کو بھی دوست بنا سکتا تھا، احمد کو آزادی ملنے کے بعد نہ جانے کس طرح شراب کی لت پڑ گئی، اور شراب کے پیالہ میں اُس نے اپنی ساری پونجی غرق کر دی، نہ امجد کو اس کی پروا تھی نہ صمد کو کچھ ایسا زیادہ خیال تھا۔

پھر احمد کے انتقال کے بعد امجد نے جس طرح سر سہلا سہلا کر بھیجہ کھایا، دوکانوں اور باغ پر قبضہ کر لیا۔ اس سے سلمیٰ پر حقیقت منکشف ہو گئی کہ اس دنیا میں اصل چیز روپیہ ہے، رشتہ، ناطہ سب بعد کی چیزیں ہیں، لیکن مایوسی کی اس تاریکی میں صمد کا وہ روپ ظاہر ہوا۔ جو اس کی چشم ظاہر سے ہمیشہ پنہاں رہا تھا۔

صمد خود سلمیٰ کے گھر آیا، محبت بھری باتیں ہوئیں اس سے پہلے وہ آٹھ ہزار روپے گرہ سے دے کر، امجد کے دستِ ہوس سے اس کے گھر کو بچا چکا تھا، اب اس نے فرخ کے سارے تعلیمی مصارف اپنے ذمہ لے لئے، اور اپنے گھر کے دروازے ستم رسیدہ بھتیجے اور بد بخت بھابی کے لئے کھول دیئے۔

اس گھر میں سلمیٰ کو وہ آرام ملا جو زندگی بھر نہ ملا تھا، نوکر ہر وقت ہاتھ باندھے ارشاد کے منتظر رہتے، شام کو دوکان سے واپس آکر اور صبح کو وہاں جاتے وقت صمد ضرور اس کے کمرہ میں آتا، دل داری و تسلی کی باتیں کرتا، اور چلا جاتا۔

اور غزالہ تو واقعی اس طرح اس کی خدمت کر رہی تھی، جیسے ایک سعادتمند بیٹی ماں کی کرتی ہے۔

احمد کے بعد سلمیٰ کا جی زندگی سے بیزار ہو گیا تھا، لیکن یہاں آکر یہاں کی محبت دیکھ کر، اس گھر کے مکینوں اور مالکوں کی وضع و شرافت دیکھ کر اب پھر زندگی میں ایک آسودگی سی محسوس کرنے لگی تھی، عزالہ کو دیکھ لیتی تو دل خوشی سے بلیوں اُچھلنے لگتا، صمد آجاتا تو ہر فکر بھول جاتی، ماں کی اس تبدیلی سے فرخ بھی بہت خوش تھا!

---

(۲)

فرخ نے بھی غزالہ کو اب تک دُور ہی سے دیکھا تھا، کوئی شبہ نہیں وہ غزالہ میں شروع سے ایک طرح کی کشش سی محسوس کرتا تھا لیکن اس کے گھر میں آنے کے بعد، محبت کرنے لگا، قریب سے غزالہ کو دیکھنے کے بعد سچ تو یہ ہے کہ وہ اس سے محبت کرنے پر مجبور ہوگیا، غزالہ کے سبھاؤ جھلملاہٹ شرافت، خلوص، مروّت، لحاظ، پاکیزہ نگاہیں، خوش اطواری، تہذیب، سلیقہ، متانت، شوخی، دلبری، سادہ لوحی، معصومیت، ذہانت، خاموشی، بذلہ سنجی، سنجیدگی، حاضر جوابی کے ایسے جلوے دیکھے کہ وہ اس سے محبت کرنے پر مجبور ہوگیا، اس کا خیال تھا سانپ اور بچھو بھی اگر اس کا جلوۂ صد رنگ دیکھ لیں تو اپنے تئیں اس سے محبت کرنے پر مجبور پائیں گے، اس کی کسی بات سے نفرت نہیں کی جا سکتی، اس کی ہر بات دعوتِ محبّت ہے

محبّت ہوس نہیں، اس میں کچھ اس بلا کا وقار تھا کہ ہوس کی نگاہیں اس کے چہرہ کی طرف اُٹھ ہی نہیں سکتی تھیں، ہاں خلوص اور بے لوث محبّت کی نگاہیں اسے بار بار دیکھ سکتی تھیں۔

لیکن محبت بہرحال محبت ہے، کتنی ہی خلوص اور صداقت پر مبنی ہو، نہ اس کا اظہار آسان ہوتا ہے، نہ اس کا مطالبہ، عاشق کے دل میں ایک انجانا خطرہ ہر وقت دھڑکتا رہتا ہے۔ ایک نامعلوم سی جھجک ہمہ وقت مبتلائے

اضطراب رکھتی ہے، وہ دل کی بات زبان پر لانا چاہتا ہے۔ لیکن زبان ساتھ نہیں دیتی، وہ دل کھول کر سامنے رکھ دینا چاہتا ہے۔ لیکن دل اپنے دروازے خود بند کر لیتا ہے، اور اپنی کیفیت ظاہر نہیں ہونے دیتا۔

اور اس محبت کے راستہ میں اگر فرق مراتب کا سنگِ گراں حائل ہو تو معاملہ اور زیادہ نازک ہو جاتا ہے!

فرخ اور غزالہ کے درمیان فرق مراتب کا سنگ گراں حائل تھا!

غزالہ ایک دولتمند، فارغ البال اور آسودہ حال باپ کی بیٹی تھی۔ جسے سب کچھ میسر تھا، جس کی ہر خواہش اس لئے تھی، کہ پوری ہو، جس کے پاس نہ کپڑوں کی کمی تھی، نہ زیورات کی۔

فرخ کے باپ نے مرتے مرتے اول تو چھوڑا ہی کیا، اور جو کچھ تھا بھی اسے غارت کر دیا، ماں کے پاس اشک و آہ، دعائے سحر گاہی اور نالۂ شب کے سوا کوئی پونجی نہ تھی، پہلے وہ نانا کے گھر میں پل رہا تھا، اب چچا نے رحم کھا کر اس کے تعلیمی مصارف اور اس کی ماں کے ذاتی مصارف اپنے ذمہ لے لئے تھے۔

ایسا شخص ایسی لڑکی سے کس طرح محبت کر سکتا تھا؟ محبت اختیاری چیز نہیں سوال یہ ہے، ایسی ان مل، بے جوڑ، غیر متوازن اور غیر مساوی محبت پروان کس طرح چڑھ سکتی تھی؟ ــــــ کسی طرح نہیں، یہی وجہ تھی کہ صمد کے گھر آنے کے بعد گو اسے بہت سے فکروں سے چھٹکارا مل گیا تھا، لیکن اس نئی مصیبت نے اس کے دل کی دنیا تہ و بالا کر دی تھی!

غزالہ اس سے بہت اچھی طرح ملتی تھی، اس کی راحت و آرام کا خیال رکھتی تھی، اس سے دل خوش کن باتیں کرتی تھی، اس کے لطیفے سنتی تھی۔ اپنے لطیفے سناتی تھی، لیکن نہ جانے کیا بات تھی، اس التفات فراواں کے

باوجود اس کا دل بجھا بجھا سا رہتا تھا، ؎

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے! دل ہوا ہے چراغ مفلس کا!

وہ خود بھی مفلس تھا، اس کا دل بھی مفلس تھا اور اس کے گھر کا چراغ بھی مفلس تھا۔ ایسے افلاس زدہ گھر میں غزالہ کی پیشوائی کس طرح کی جا سکتی تھی،

ایک روز وہ ماں کے پاس بیٹھا تھا کہ عزالہ خوش خوش دوڑتی ہوئی کمرہ میں آگئی، فرخ کو دیکھ کر ایک دم ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی۔ پھر کہنے لگی۔

"ارے آپ تو یہاں ہیں!"

فرخ نے کہا۔

"ہاں عزالہ میں تو بڑی دیر سے یہاں بیٹھا ہوں!"

عزالہ نے اس کی طرف سے نظر ہٹا کر سلمٰی سے کہا۔

"چچی اماں میں ذرا شاپنگ کو جا رہی ہوں، کئی چیزیں خریدنا ہیں، ابا کو تو ان چیزوں کی تمیز ہی نہیں، ہمیشہ خراب سی چیزیں لے آتے ہیں۔ پھر واپس کرنے سے انکار کر دیتے ہیں، اب میں خود ہی اپنی چیزیں لاتی ہوں۔"

سلمٰی نے محبت بھرے لہجہ میں کہا۔

"اچھا کرتی ہو بیٹی، اپنی چیز آپ ہی لاتے خوب بنتی ہے!"

وہ کہنے لگی۔

"دیکھئے پچھلے دنوں ابا یہ سینڈل اٹھا لائے ——— بھلا میں اسے پہن سکتی ہوں، بڑی سوکھ رہی ہے!"

سلمٰی ہنسنے لگی۔

"اچھا تو جاؤ خود اپنی مرضی اور پسند کی سینڈل اور دوسری جو چیزیں لانا ہوں لے آؤ!"

وہ ذرا رکتی ہوئی بولی۔

"تو فرخ بھائی سے کہہ دیجئے، میرے ساتھ چلے چلیں!"

فرخ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، اگر بے تکلفی نہ ہوتا تو شاید وہ بھاگ کھڑا ہوتا قبل اس کے کہ سلمٰی کوئی جواب دے، اس نے چاہا کہ خود ہی کسی طرح ٹال دے، اس نے کچھ کہنا چاہا، مگر اس کی جنبش لب دیکھ کر عزالہ بولی۔

"چچی اماں، فرخ بھائی بہانہ کر کے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں!"

فرخ سٹ پٹا گیا، اس نے ہمت کر کے کہا

"پیچھا چھڑانے کا کیا سوال ہے، چلو جہاں چلنا ہو!"

وہ کہنے لگی۔

"آپ تھک تو نہیں جائیں گے!"

پھر کھلکھلا کر ہنس دی، اور سلمیٰ سے کہنے لگی۔

"چچی اماں، فرخ بھائی کہیں آتے جاتے کیوں نہیں؟ —— نہ سیر کو جائیں نہ تفریح کو، نہ سینما دیکھیں، نہ کسی اور دلچسپی میں حصہ لیں، بس ہر وقت یا کتاب پڑھ رہے ہیں یا آپ کے پاس بیٹھے سر جوڑے باتیں کر رہے ہیں، اسی طرح تو لوگوں کی طبیعت خراب ہوتی ہے!"

ایک ہی سانس میں اتنی ساری باتیں کرنے کے بعد اس نے پھر سلمیٰ سے شکایت کی۔

"دیکھ لیجئے، آپ نے اجازت دے دی میں اتنی دیر سے انتظار میں کھڑی ہوں تو بھی فرخ بھائی اٹھنے کا نام نہیں لیتے —— ؟ (براہ راست مخاطب ہو کر) آخر آپ کب تیار ہوں گے؟"

فرخ نے جواب دیا،

"چلو —— مجھے کیا تیار ہونا ہے!"

عزالہ کو پھر ہنسی آگئی "تو کیا آپ یونہی چلیں گے؟"

فرخ نے پوچھا۔

"اور کس طرح چلنا چاہیئے؟"

وہ بولی۔

"شیو کیجئے، کپڑے بدلئے اور آدمی بن کر چلئے، اس طرح اوٹ پٹانگ بن کر چلنے سے کیا فائدہ؟" —— اٹھئے نا بہت دیر ہو رہی ہے!"

فرخ اس فرمائش کے سامنے سر جھکا دینے پر مجبور ہو گیا، اس نے جلدی جلدی شیو کیا، لباس تبدیل کیا، اور تیار ہو کر آگیا۔

"چلو بھئی چلیں؟"

عزالہ نے ایک نظر، فرخ کے سراپا پر ڈالی، پھر بڑی معصومیت اور سادگی کے ساتھ سلمیٰ سے کہا۔

"دیکھئے چچی اماں، فرخ بھائی کتنے اچھے لگ رہے ہیں!"
سلمیٰ سٹ پٹا گئی، فرخ گھبرا گیا، غزالہ نے باہر جانے کے لئے چلتے ہوئے کہا۔
"آئیے فرخ بھائی!" ــــــ فرخ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

---

(۳)

غزالہ جو چاہتی تھی کر گزرتی تھی، لیکن اس کے اقدام و عمل میں کچھ اس بلا کی سادگی اور اس غضب کی معصومیت ہوتی تھی کہ بظاہر جو باتیں قابلِ اعتراض سمجھی جا سکتی ہیں، ان کا صدور جب غزالہ سے ہوتا تھا تو کسی کے دل میں خیال بھی نہیں گزرتا تھا کہ اس کا کوئی دوسرا مفہوم بھی لیا جا سکتا ہے۔

صمد بیٹھا ہو، سلمیٰ موجود ہو، کوئی ہو، وہ نہایت اطمینان اور بے پروائی سے کبھی فرخ کو اپنے کمرہ میں بلا کر ریڈیو کا فرمائشی پروگرام سنانے لگتی، کبھی اس کے کمرہ میں جا کر اس سے کسی داستان کی فرمائش کر دیتی تھی، ایسے موقعوں پر فرخ کی حالت دیدنی ہوتی تھی۔ وہ سٹ پٹا جاتا تھا، لیکن غزالہ اس کی اس کیفیت کو محسوس بھی نہیں کرتی تھی۔

ایک روز سلمیٰ اور فرخ کی موجودگی میں اس نے دھڑ سے صمد سے کہہ دیا۔

"ابا جی فرخ بھائی کو جمال پور نہ جانے دیجئے، روک لیجئے!"

صمد اس عجیب و غریب فرمائش پر اپنی حیرت ضبط نہ کر سکا،

"کیوں بیٹی؟"

وہ کہنے لگی،

"ہمارا جی گھبرائے گا، فرخ بھائی بہت اچھے لگتے ہیں ہمیں!"

صمد گم صم غزالہ کو دیکھنے لگا، وہ کہہ رہی تھی۔

"بے چارے خاموش، بے زبان، جو کام چاہو لے لو، جہاں بھیج دو، جدھر جی چاہے اپنے ساتھ لے جاؤ، کیا مجال جو کبھی انکار کر دیں!"

صمد نے ایک قہقہہ لگایا۔

"ہاں بیٹی فرخ بڑا اچھا لڑکا ہے، مجھے بھی بہت پسند ہے، لیکن ہمیں اپنی آسائش سے زیادہ اس کے مستقبل کا خیال رکھنا چاہیئے!"

"تو کیا وہ یہاں نہیں پڑھ سکتے؟"

"نہیں بیٹی، یہاں اتنا اچھا انتظام نہیں ہے!"

"آپ تو یہاں کے لیڈر ہیں، سب کی مشکلیں آسان کرتے رہتے ہیں، فرخ بھائی کے لئے کوئی بندوبست نہیں کر سکتے!"

"اچھا اچھا، ہو جائے گا، کوئی نہ کوئی بندوبست، لیکن بیٹی ہتھیلی پر سرسوں نہیں اُگا کرتی —— ہاں میاں فرخ کب جا رہے ہو تم؟ —— مطلب یہ کہ کتنے دن کی چھٹی باقی ہے تمہاری!"

فرخ نے جواب دیا۔

"ابھی دس دن اور باقی ہیں!"

صمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"غزالہ جب شاپنگ کے لئے جاتی ہے، تو اکثر تمہیں ساتھ لے جاتی ہے، آؤ آج ہمارے ساتھ چلو!"

فرخ کو کیا عذر ہو سکتا تھا، وہ ساتھ ہو لیا، صمد اسے لے کر ایک مشہور دوکان پر لے گیا، یہاں اس کی ناپ کے کئی بیش قیمت سوٹ خریدے، پھر ایک اور دوکان پر گئے، وہاں سے تین جوڑے جوتے اس کے لئے مول لئے۔ پھر شفیع ٹیلر ماسٹر کے ہاں لے گیا، اس سے تاکید کی کہ لڑکے کا ناپ لے لو، ایک ہفتہ کے اندر بارہ جوڑے کپڑے تیار کر دو، اور چار شیروانیاں، شفیع نے قمیص پاجامے اور شیروانی کے لئے کپڑوں کے بہت سے نمونے رکھ دیئے، صمد نے فرخ سے کہا۔

"تم پسند کر لو!"

اس نے کہا۔
"میری پسند وہی ہے جو آپ کو پسند آجائے!"
صمد نے خود ہی مختلف تھانوں سے قمیض اور شیروانی کا کپڑا پسند کیا، تنقیع نے کپڑے پھاڑ کر اپنے اسسٹنٹ کو دے دیئے اور وعدہ کر لیا۔
"اگلے جمعہ کو انشاء اللہ مل جائیں گے!"
پھر صمد تو اپنی دوکان پر چلا گیا اور فرخ کو گھر بھیج دیا، فرخ میاں لدے پھندے پہنچے غزالہ اب تک سلمیٰ کے پاس بیٹھی اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھی فرخ کو دیکھ کر کہنے لگی۔
"آج تو بہت کچھ آپ خرید لائے ہیں ہمیں بھی دکھایئے!"
فرخ نے بنڈل کھول کر سامنے رکھ دیئے اور مسکرایا۔
"ملاحظہ کیجئے!"
غزالہ سوٹ دیکھ کر پھڑک گئی۔
"بڑے اچھے ہیں ـــــ بہت عمدہ ـــــ دیکھئے، چچی جان!"
سلمیٰ نے شوق کی نظروں سے دیکھا، اور بولی۔
"ہاں بیٹا بہت اچھے ہیں!"
فرخ نے ماں کو بتایا۔
"چچا میاں نے، ان سوٹوں کے علاوہ بھی کئی جوڑے کپڑوں اور کئی شیروانیوں کا آرڈر دے دیا ہے!" ـــــ آخر اتنے سارے کپڑوں کا میں کیا کرونگا؟ ان سے کہتے ہوئے تو مجھے حجاب آتا ہے، آپ انہیں سمجھایئے میری ذات پر اتنی فضول خرچی نہ کریں!"
سلمیٰ نے انکار کر دیا۔
"نہیں بھائی، میں صمد سے کچھ نہیں کہہ سکتی، اُسے صدمہ ہوگا، وہ سمجھے گا ہم اس سے مغائرت کرتے ہیں، ایسا ہی ہے تو تم خود کیوں نہیں کہتے؟"
فرخ نے لاجواب ہوتے ہوئے کہا۔
"میرا کچھ کہنا بد تمیزی میں داخل ہے!"

سلمیٰ نے جواب دیا۔
"اور میرا کچھ بولنا احسان فراموشی ہے!"
فرخ نے ایک آہ سرد کے ساتھ کہا۔
"چچا میاں کے احسان سے ہم زندگی بھر سبکدوش نہیں ہو سکتے، خود غرضی اور مفاد پرستی کی اس دُنیا میں ان کا وجود ایک مینارہ نور ہے، میں فخر سے پھولا نہیں سماتا، جب سوچتا ہوں وہ میرے چچا ہیں!"
عزالہ ہنستے ہنستے دوہری ہوگئی، کہنے لگی۔
"چچی اماں آپ نے فرخ بھائی کی چالاکی دیکھی، ابا جان کے گن اس لئے گائے جارہے ہیں کہ کہیں میں ان سے آج کی ساری باتوں کا کچا چٹھا نہ کہہ دوں!"
سلمیٰ نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولی۔
"نہیں اس سے کچھ نہ کہنا، یہ لڑکا تو پاگل ہے، ہمیشہ سدا کا نازک مزاج اور حساس ہے، اسے بہت صدمہ ہوگا!"

---

(۴)

جمعہ کا روز تھا، عزالہ حسبِ معمول سلمیٰ کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی، اتنے میں فرخ آیا، اس نے ماں سے کہا۔

"نماز کو دیر ہو رہی ہے، یہ قمیض مسک گئی ہے ذرا اسے رفو کر دیتیں!"

عزالہ نے قمیض فرخ کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

"بجائے اس کے کہ ماں کی خدمت کریں، اُن سے اُلٹا اپنا کام لیتے ہیں، ویسے تو بڑی دھوم ہے آپ کی سعادتمندی کی، اگر مجھ سے کہہ دیتے تو کیا ہو جاتا؟"

فرخ نے جواب تو کچھ نہ دیا، حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ قمیض لے کر اپنے کمرہ میں چلی گئی، سلمیٰ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"حیران کیا ہو رہے ہو دل کی بڑی اچھی لڑکی ہے، میں تو کہتی ہوں لاکھوں میں ایک ہے، اگر اس گھر میں میرا آنا نہ ہوتا، تو اتنی پیاری اور اتنی اچھی لڑکی سے محروم رہ جاتی، وہ مجھے اتنا ہی چاہتی ہے، جتنا ایک لڑکی اپنی ماں کو چاہ سکتی ہے!"

فرخ نے ذرا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو ہر وقت جلی کٹی سناتی رہتی ہے!"

"اس کی جلی کٹی باتوں میں بھی خلوص ہے، محبت ہے!"

"آپ کو پسند آجائے کوئی، بس پھر اس سے اچھا دنیا میں کوئی نہیں!"
"لیکن میں پسند اس کو کرتی ہوں جو واقعی اچھا ہوتا ہے!"
یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ غزالہ قمیض لے کر آگئی، اُس نے سلمیٰ کو دکھاتے ہوئے کہا۔
"کمال کر دیا بھئی!"
غزالہ ہنسنے لگی،
"میں آپ کے بکس سے یہ دوسری قمیض نکال کر لائی ہوں، ایک کونے میں اس طرح مڑی تڑی پڑی تھی، جیسے گودڑا، اس پر تو نظر گئی نہیں پھٹی ہوئی اور مسکی ہوئی قمیض اُٹھا لائے ــــــ اور وہ آپ کے کپڑے جو تنقیع ٹیلر ماسٹر کی فیکٹری میں سل رہے تھے، ان کا کیا ہوا۔"
فرخ نے جواب دیا۔
"آج کا وعدہ ہے، شام کو جاؤں گا لے آؤں گا ــــــ لیکن سوال یہ ہے کہ جناب کو میرے صندوق کی تلاشی لینے کا حق تھا؟"
اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔
"تھا، اسی لئے تو ایسی جرأت ہوئی!"
فرخ لاجواب ہو گیا، پھر اس نے سوال کیا۔
"لیکن تمہیں یہ خیال کیسے گذرا کہ اس میں کوئی دوسری قمیض ہو گی۔؟"
غزالہ نے جواب دیا۔
"نہ جانے کیوں؟ ــــــ لیکن دیکھ لیجئے، میرا خیال کتنا صحیح نکلا؟"
فرخ نے کہا۔
"اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں تمہاری ولایت کا قائل ہو جانا چاہیئے؟"
وہ کہنے لگی،
"جی شکریہ ــــــ اب جائیے ورنہ میں پیش گوئی شروع کر دونگی!"
فرخ نے ہنستے ہوئے کہا۔
"پیشین گوئی کا نمونہ دیکھ لیں، پھر جائیں گے!"

غزالہ نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔
"جب آپ مسجد پہنچیں گے تو نماز ہو چکی ہوگی!"
فرخ ہنسنے لگا۔
"یہ تو واقعی پوری ہوتی نظر آتی ہے ـــــ اچھا میں چلا!"
اور وہ تیز تیز قدم رکھتا باہر چلا گیا۔

(۵)

آج فرخ جمال پور جارہا تھا، کالج کی تعطیل ختم ہو چکی تھی۔ سلمیٰ اس کا سامان سفر تیار کر رہی تھی، غزالہ سلمیٰ کا ہاتھ بٹا رہی تھی، فرخ نہایت احتیاط کے ساتھ وہ سوٹ اور کپڑے تہ کر رہا تھا، جو صمد نے اس کے لئے بنوائے تھے، سلمیٰ جب سامان درست کر چکی تو اس نے کہا۔

"لو بھئی تمہارا سامان تیار ہو گیا، اب خدا کا نام لے کر سدھارو!"

فرخ کا نہ جانے کیوں جی چاہ رہا تھا کہ کوئی اُسے روک لے، کم از کم ایک دن کے لئے، آج کے بجائے اگر کل چلا جاؤں گا تو کون سی قیامت آجائے گی؟" اس نے کہا۔

"لیکن اماں میرے تو سر میں درد ہو رہا ہے اس وقت!"

سلمیٰ گھبرا گئی۔ غزالہ مسکرانے لگی۔

"تو فرخ بھائی ایسا کیجئے، کل چلے جائیے گا، ایک دن کی غیر حاضری سہی!"

فرخ کی دلی آرزو پوری ہوتی نظر آ رہی تھی، لیکن اتنی آسانی سے اس فرمائش کے سامنے سر جھکا دینا بھی مناسب نہ تھا، کچھ تحریک سلمیٰ کی طرف سے بھی ہونی چاہیئے۔ اس نے سر کھجاتے ہوئے سلمیٰ سے کہا۔

"اماں جی سُن رہی ہیں آپ غزالہ کی باتیں؟"

سلمیٰ نے بھی غزالہ کی تائید ہی کی کہنے لگی،

"سر درد کر رہا ہے، تو کل ہی چلے جانا پھر!"
فرخ نے اپنے آپ کو کرسی پر ڈال دیا۔
"جیسا کہئے ـــــ لیکن کل نہ روکئے گا، کل مجھے پہنچ ہی جانا چاہیئے، کالج میں ـــــ!"
غزالہ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔
"لیکن یہ وعدہ آپ کو کرنا ہوگا کہ کل سر میں درد نہیں ہونے پائے گا کسی طرح!"
پھر اس نے شوخ نظروں سے فرخ کو دیکھا اور ہنسنے لگی، فرخ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو، اس نے ذرا تند لہجہ میں کہا۔
"تو کیا میں بہانہ کر رہا ہوں!"
سلمٰی نے ڈانٹا۔
"واہ رے لڑکے آج کاٹنے کیوں دوڑ رہا ہے تو؟ بہانہ کرے گا تو اپنے لئے نہ کرے گا تو اپنے لئے، اس سے غزالہ کو کیا سروکار؟"
غزالہ نے چچی سے فریاد کرتے ہوئے بھولا سا منہ بنا کر کہا۔
"آپ دیکھ لیجئے، مَیں کچھ کہوں گی تو کہیں گے تم لڑتی ہو!"
فرخ کو ہنسی آگئی،
"خدا سے ڈرو غزالہ میں نے کب تمہیں لڑاکا کہا۔
وہ سوکھے منہ سے بولی۔
"نہ کہا ہوگا، شاید میں نے خواب دیکھا ہوگا!"
سلمٰی کو غصہ آگیا۔
"دیکھو فرخ میں یہ باتیں پسند نہیں کرتی، آخر تم غزالہ سے کیوں اُلجھے جا رہے ہو؟ ـــــ پھر مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا!"
فرخ نے کوئی جواب نہیں دیا، تیز تیز قدم رکھتا باہر چلا گیا، اس کے جانے کے بعد غزالہ نے کہا۔
"مَیں تو مذاق کر رہی تھی، چچی اماں، فرخ کو چھیڑنے میں مزا آتا ہے، آپ نے دیکھا نہیں کتنی جلدی تن بھن ہو جاتے ہیں؟ خواہ مخواہ ڈانٹ دیا آپ

نے ؟"

سلمیٰ مسکرانے لگی۔

"میں کیا جانوں تم مذاق کر رہی تھیں، ویسے دو تین دن سے میں دیکھ رہی ہوں، کچھ مزاج چڑ چڑا ہو گیا ہے اس کا!"

غزالہ نے اس مرض کی تشخیص اس طرح کی۔

"جی ہاں سفر سوار ہے نا سر پر ——!"

سلمیٰ بولی،

"لیکن بیٹی پہلی مرتبہ تو سفر پر نہیں جا رہا ہے؟ بہت دنوں سے جبلپور میں پڑھ رہا ہے ہمیشہ خوش خوش وہاں سے آتا تھا، خوش خوش جاتا تھا۔ اس مرتبہ تو ایسا محسوس ہو رہا ہے، جیسے وہ نہ جانے کے بہانے تلاش کر رہا ہے!"

"یہ کیسے جانا آپ نے؟"

"سر میں درد تو اس وقت ہو رہا تھا، رات مجھ سے کہہ رہا تھا، ابھی میرا جانے کو جی نہیں چاہتا!"

"جی لگ گیا ہوگا یہاں!"

"ہاں ٹھیک ہے لگ گیا ہوگا۔ لیکن پڑھائی تو جی لگنے نہ لگنے کی پابند نہیں ہے، پڑھ لکھ لیں، پھر جہاں جی چاہیں رہیں!"

"جی اور کیا، پھر تو —— وادی یہ ہماری ہے وہ صحرا بھی ہمارا!"

اس مصرعہ کی شان نزول سلمیٰ کی سمجھ نہ آئی، وہ حیرت سے غزالہ کو دیکھنے لگی۔ اور وہ آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر اس گفتگو سے بالکل بے پروا اپنے لمبے لمبے بال ٹھیک کرنے لگی۔ بال ٹھیک کرتی جاتی تھی اور گنگناتی جاتی تھی، سلمیٰ اس لاابالی پن کی ادا سے واقف تھی۔ ادھر سے توجہ ہٹا کر وہ اپنے کام میں لگ گئی۔

دوسرے روز جب صبح فرخ جانے لگا تو غزالہ کے کمرہ کی طرف سے اس کا گذر ہوا وہ دروازہ ہی پر کھڑی تھی۔ پوچھا۔

"فرخ بھائی جا رہے ہیں آپ؟"

وہ بولا۔

"ہاں بھئی غزالہ جا رہا ہوں!"
غزالہ مسکرانے لگی،
"ذرا سر پر ہاتھ رکھ کر ٹٹول لیجئے، کہیں درد تو نہیں ہو رہا ہے؟"
فرخ نے جل کر جواب دیا۔
"ہوتا ہوگا تو بھی جاؤں گا!"
غزالہ دفعتہً سنجیدہ بن گئی، اس نے پوچھا۔
"اب کب آئیں گے آپ؟"
فرخ اس تعبیر پر حیران رہ گیا، اس نے ایک نظر غزالہ پر ڈالی اور کہا۔
"پندرہ دن کے بعد — ممکن ہے اس سے پہلے!"
اور وہ چل پڑا، غزالہ کی آواز اس کے کان میں آئی۔
"نہیں پہلے!"
"نیچے اتر کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو غزالہ کھڑکی میں کھڑی تھی نظریں ملتے ہی وہ پیچھے ہٹ گئی۔

(۶)

فرح کو جمال پور گئے دوسرا دن تھا کہ رحمت پور سے امجد میاں اپنے فرزند ارجمند نسیم صاحب کے ساتھ تشریف لائے، یہ دیکھ کر کہ سلمیٰ اب یہاں اُٹھ آئی ہے، امجد بہت جز بز ہوا، غریب کے سلام کا جواب بھی صرف گردن کے اشارہ سے دیا۔ رہے نسیم صاحب تو وہ اپنی سطح سے اس قدر نیچے کیسے اتر سکتے تھے کہ سلمیٰ کو سلام کر لیتے، غزالہ سلمیٰ کے پاس بیٹھی یہ منظر دیکھ رہی تھی، اسے امجد اور نسیم کی یہ حرکت سخت ناپسند ہوئی، لیکن ناپسندیدگی کا اظہار کم از کم الفاظ کے ذریعہ تو ممکن نہ تھا، ہاں اگر کوئی قیافہ شناس ہوتا تو ضرور محسوس کر لیتا۔ اس وقت وہ سخت پیچ و تاب کے عالم میں ہے۔

امجد نے سلمیٰ کو یکسر نظر انداز کر کے غزالہ سے پوچھا۔

"صمد میاں تو دوکان پر تشریف لے گئے ہوں گے؟"

وہ رکھائی سے بولی۔

"جی وہیں گئے ہیں۔!"

امجد اپنا سامان سفر کھولنے میں لگ گیا، نسیم نے غزالہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"کہو بھئی غزالہ اچھی تو ہو؟"

وہ سادگی سے بولی۔

"خدا کا شکر ہے اچھی ہوں ـــــ آپ اپنی کہئے!"
نسیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"ٹھیک ہے سب کچھ، ـــــ لیکن تم تو کافی بڑی ہوگئیں!"
اسی سادگی کے ساتھ غزالہ نے کہا۔
"ہاں بڑی تو ہوگئی ہوں، لیکن آپ سے زیادہ نہیں!"
نسیم نے چشم حیرت سے غزالہ کو دیکھا۔
"کیا کہہ رہی ہو تم؟ ـــــ میں بھی تمہیں بڑا نظر آرہا ہوں (ہنستے ہوئے) بھئی میں تو پہلے ہی سے بڑا ہوں!"
غزالہ نے جواب دیا۔
"اب بہت بڑے ہو گئے ہیں آپ!"
"وہ کیسے؟ ـــــ یہ بھی لگے ہاتھوں بتاتی چلو!"
"اس سے بڑھ کر بڑاپن کیا ہوگا کہ اپنے بزرگوں کو سلام تک نہیں کرتے؟"
"(تیوری چڑھاکر) کس بزرگ کو میں نے سلام نہیں کیا؟"
"(سلمیٰ کی طرف اشارہ کرکے) یہ بیٹھی تو ہیں آپ کے سامنے رشتہ میں بھی آپ سے بڑی ہیں اور عمر میں بھی!"
اس اعتراض پر نسیم سٹ پٹا گیا، وہ کہنے لگا،
"بڑی باریک بین ہوگئی ہو تم تو!" لیکن تمہیں ان باتوں سے کیا سروکار؟"
"کوئی سروکار نہیں، نہ ان باتوں سے، نہ آپ سے، یوں ہی ایک بات دل میں آئی کہہ دی!"
"ضرور تمہیں کسی نے میرے خلاف بھڑکایا ہے، لیکن ایسے لوگوں کا (سلمیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے) منہ توڑنا اور سر جوڑنا مجھے آتا ہے!"
غزالہ نے طنز کیا۔
"بڑے بہادر ہیں آپ، خدا نظر بد سے بچائے!"
نسیم نے اکڑتے ہوئے کہا۔
"اور کیا نہیں بھی؟ ـــــ غزالہ تمہارے روکھے طرز عمل اور گستاخانہ باتوں سے مجھے بہت غصہ آیا، مجھ میں ایک کمزوری ہے۔ میں اپنا غصہ ضبط

نہیں کر سکتا، لیکن آج پہلی مرتبہ ضبط کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پا رہا ہوں۔"
غزالہ ان باتوں کی بھلا کب عادی تھی، اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔
"آپ نے میرے روکھے طرزِ عمل کی شکایت کی ہے، جو صحیح نہیں، میں آپ سے اسی طرح پیش آئی، جس طرح پہلے ملا کرتی تھی، رہی میری گستاخانہ باتوں کی شکایت، تو یہ الفاظ میں نے صرف اس لئے برداشت کر لئے، کہ آپ مہمان ہیں، آئندہ زبان سنبھال کر بات کیجئے گا اور اپنے غصّہ کے بارے میں آپ نے جو کچھ فرمایا ہے، اسے میں ذرا اہمیت نہیں دیتی، غصّہ ضبط کر کے آپ نے عقلمندی کا ثبوت دیا ہے، نہ ضبط کرتے تو پشیمان ہونا پڑتا۔!"
یہ کہہ کر اس نے خشمگیں نظروں سے نسیم کو دیکھا اور اپنے کمرہ میں واپس جانے لگی، وہ جا رہی تھی کہ امجد میاں اپنا سامان ٹھیک ٹھاک کر کے تشریف لاتے نظر آئے، دُور ہی سے انہوں نے چیخ کر کہا۔
"میری لاڈلی بیٹی غزالہ، تو یہاں تھی، اور میں نے کونہ کونہ چھان مارا تیری تلاش میں (ماتھے پر ہاتھ رکھ کر) تو بہ، یہ بڑھاپا بھی ایک آفت ہے، یاد ہی نہیں، تم اور نسیم یہاں ہو؟"
غزالہ ٹھٹک کر دروازہ میں کھڑی ہو گئی۔
"جی ہاں تایا جی میں یہیں تھی۔"

امجد نے کہا۔
"بیٹی جانتی ہو میں کیوں آیا ہوں؟ ارے کیا کہوں، اس نسیم نے پریشان کر دیا، ہر روز تقاضا کرتا تھا، فیروز آباد چلئے، اچھا بھئی چلے چلیں گے۔ نہیں آج ہی چلئے، ابھی چلئے میاں ہوش کی باتیں کرو عقل کے ناخن لو، ایسی جلدی کیا ہے کسی دن بھی چل دیں گے، نہیں نہیں نہیں، آپ نہیں چلتے تو میں جاتا ہوں۔ ارے میاں صاحبزادے کہاں جاتے ہو؟ کیوں جاتے ہو؟ صمد چچا سے ملوں گا، غزالہ کو بہت دنوں سے نہیں دیکھا ہے، اس سے ملونگا، اس کی باتیں یاد آتی ہیں تو بے اختیار اس سے ملنے کو، اسے دیکھنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ اچھا بھئی اگر صمد چچا کی کشش کھینچ رہی ہے، اگر غزالہ یاد آ رہی ہیں

تو پھر ہم روکنے والے کون، بڑھاپے میں ادھر اُدھر دوڑانے پر دوڑیں گے اکلوتے بیٹے ہو، باپ کے چہیتے، ماں کے لاڈلے، تمہاری ضد پوری نہ کریں گے تو جائیں گے کہاں؟ لیجیئے صاحب نسیم میاں اپنے بوڑھے باپ کو کھینچ لائے اپنے ساتھ، اور بڑے میاں بھی کچے دھاگے میں گھسٹتے ہوئے چلے آئے، ہاہاہا! — اور بیٹی ذرا اس نسیم کی بے مروتی تو دیکھو، ہمارے ساتھ آیا ہے، لیکن ذرا جو ہماری پروا ہو۔ ہم نے خود سامان کھولا، خود اُسے ٹھیک سے رکھا، جمایا، خدا جانتا ہے سانس پھول پھول گیا۔ مگر صاحبزادے کہاں ہیں، وہ تو عزالہ سے باتیں کر رہے ہیں، ایسے منہمک ہیں باتوں میں کہ بوڑھے باپ کا ہاتھ بھی نہیں بٹاتے، اس کی خبر بھی نہیں لیتے!"

عزالہ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی مصداق، چپ چاپ کھڑی یہ لمبی تقریر سن رہی تھی، اتنے میں پھر اس کے کانوں میں امجد کی آواز آئی۔

"بیٹی، اس دن تم نے اپنے ہاتھ سے بنا کر چائے پلائی تھی، قسم کھا کر کہتا ہوں، یہاں سے گھر جا کر برابر چائے پیتا رہا، لیکن یہ معلوم ہوا جو شاندہ پی رہا ہوں، جب چائے سامنے آتی تھی، تمہاری تصویر نظروں کے سامنے پھر جاتی تھی، ایک دن جو مزہ آیا (ہنستے ہوئے)، نسیم کی ضد کے سامنے میں نے سرِ تسلیم خم کر دیا، اس کی وجہ چائے کا لالچ بھی تھا، یہ سوچ سوچ کر دل میں خوشی کی لہریں اُٹھتی تھیں کہ عزالہ بیٹی کی بنائی ہوئی چائے پیوں گا، بہت تھک گیا ہوں بیٹی، تکلیف کر بنا لا جلدی سے!"

عزالہ جاتے ہوئے بولی۔

"ابھی لائی تایا جی!"

تایا جی نے یاد دلایا۔

"اور بیٹی اس دن چائے کے ساتھ ایک اور چیز تھی، بڑے مزے کی، کیا نام تھا اس کا؟"

"کریم رول تایا جی!"

"ہاں بیٹی یہی نام تھا دو تین وہ بھی لیتی آنا، ذرا یہ نسیم بھی چکھ لے گا، نہ جانے

اس نے کبھی کھایا ہے یا نہیں؟"

غزالہ جا چکی تھی، نسیم کو اپنی یہ توہین ناقابلِ برداشت نظر آئی، اس نے بپھرے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"کریم رول کون سی ایسی نعمت ہے؟ ہزار دفعہ کھا چکا ہوں!" امجد نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں ضرور ہزار دفعہ کھایا ہوگا، جیسے میں لاکھ مرتبہ چائے پی چکا ہوں لیکن یہاں کی بات ہی اور ہے!"

نسیم نے کوئی جواب نہیں دیا، کمرہ سے نکلا چلا گیا۔

(۷)

تھوڑی دیر میں غزالہ چائے لے کر آپہنچی، چائے بھی تھی اور کریم رول بھی، اور دوسری بھی کئی چیزیں غزالہ نے دیکھا نسیم صاحب غائب ہیں۔ وہ سمجھ گئی، روٹھ کر تشریف لے گئے ہیں، اُسے دل ہی دل میں ہنسی آگئی، یہ نخرے ڈبے کیسے دکھا رہے ہیں؟ اس کا جی چاہا، امجد سے پوچھے یہ اتنے سارے کریم رول جو آپ نے اپنے چہیتے اور لاڈلے بیٹے کے لئے منگائے تھے۔ یہ کیا ہوں گے؟ لیکن پوچھنے کی جرأت نہ کر سکی، اس نے سوچا، خواہ مخواہ تایا جی شرمندہ ہوں گے،

اور واقعی تایا جی نسیم کے اس طرح چلے جانے سے سخت شرمندہ اور ملول تھے، ان کی آنکھوں نے دُور تک نسیم کا تعاقب کیا تھا، ان کا جی چاہا تھا کہ اسے پکاریں، روک لیں، لیکن ڈر گئے، جانتے تھے لونڈا اس وقت ہتھے سے اُکھڑا ہوا ہے۔ دو چار ٹیڑھی بیڑھی باتیں سب کے سامنے سنا دیں تو کس سے آنکھ ملا سکوں گا۔

یہ چائے، جس کے وہ اتنے شائق تھے، گھر کی چائے سے بھی جسے وہ اب جوشاندہ کہنے لگے تھے، بدمزہ معلوم ہو رہی، کریم رول جس کے وہ اتنے شائق تھے سامنے رکھے تھے، یہ معلوم ہوتا تھا زہر رکھا ہے۔ ذرا جو رغبت ہو، چائے تو بدقت تمام انہوں نے زہر مار کر لی۔ لیکن کریم رول میں ہاتھ

لگانے کا جی نہ چاہا۔

غزالہ نے یاد دلایا۔

"اور یہ کریم رول؟"

ڈکار لیتے ہوئے بولے۔

"نہیں بیٹی کسی اور وقت سہی، چائے بہت پی لی!"

غزالہ اڑ گئی،

"تایا جی یہ آپ کو چکھنا پڑیں گے۔ بڑے مزے کے ہیں، بالکل تازہ!"

اور یہ کہہ کر اس نے ایک کریم رول امجد کے ہاتھ میں تھما دیا، بادلِ نخواستہ انہوں نے کھایا، پھر کلی کرتے کمرہ سے باہر جو گئے تو ادھر نہیں آئے، شاید دکان پر صمد سے ملنے چلے گئے۔

امجد کے جانے کے بعد غزالہ نے چائے کی ایک پیالی بنا کر سلمیٰ کے سامنے رکھی۔

"لیجئے۔ چچی اماں!"

سلمیٰ نے اُسے محبت بھری نظروں سے دیکھا اور گھونٹ گھونٹ کر کے پینے لگی، پھر اس نے کہا۔

"بیٹی تم تو اُلجھ پڑیں تسنیم سے اس وقت!"

وہ بولی،

"کیوں نہ اُلجھتی، جو جیسی کہے گا ویسی سنے گا، کوٹھی میں کسی کی دبیل ہوں؟ آخر وہ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں؟"

"اپنے باپ کا لاڈلا اور اکلوتا بیٹا ہے، اس لئے مزاج کا تیکھا ہے!"

"میں بھی تو اپنے باپ کی لاڈلی اور اکلوتی بیٹی ہوں، میرا مزاج ان سے تیکھا ہے!"

سلمیٰ ہنسنے لگی۔

"خدا بخشے، بالکل عذرا ہے عذرا، وہی ناک نقشہ، وہی باتیں، وہی

حرکتیں!"——— لیکن بھئی یہ بھید نہ کھلا، بھائی صاحب (امجد) اس مرتبہ نسیم کو لے کر کیوں آئے ہیں؟ اور اگر لائے تھے، تو آدمی بنا کر لائے ہوتے وہ تو بالکل ———"

"ہُوش ہے ہُوش ——— کیوں چچی اماں؟"

"ہاں بیٹی اور کیا!"

"یہ چچی اماں، میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی!"

"وہ کیا بیٹی؟"

"یہ نسیم بھائی، اتنا اتراتے کیوں ہیں! بنتے کیوں ہیں؟ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں؟"

"بیٹی، بڑے باپ کے بڑے بیٹے ہیں، خدا نے دولت دی ہے عزت دی ہے، وہ نہ اترائیں گے تو کون اترائے گا ———؟"

"واہ یہ بھی کوئی بات ہوئی ؟——— ایک بات بتادوں آپ کو؟ بتادوں مجھے اتنا غصہ کیوں آیا تھا؟ میں نے ایسی اُکھڑی اُکھڑی باتیں کیوں کی تھیں؟"

"(اشتیاق کے ساتھ) ضرور بتاؤ بیٹی؟"

"میری نظر جو اُوپر اُٹھی تو کیا دیکھتی ہوں، مجھے ایسی نظروں سے گھور رہے ہیں، جن میں عجب طرح کی چمک تھی، پھر وہ مسکرائے اور آنکھ جھپک کر منہ پھیر لیا، ذرا غور تو کیجئے، کیا یہ بدتمیزی اور بیہودگی کی انتہا نہیں ہے؟"

"ہاں بیٹی ضرور ہے!"

"کیا میں اسے گوارا کر لیتی؟"

"یہ کیسے ممکن تھا؟"

"ایک فرخ بھائی ہیں، اتنے دن یہاں رہے، ہم لوگ ساتھ ساتھ.... شاپنگ کو بھی جاتے تھے، گھنٹوں اور پہروں پاس بیٹھے ہوئے باتیں کیا کرتے تھے، بلکہ کبھی کبھی لطف لینے کے لئے میں انہیں چھیڑ بھی دیا کرتی تھی، مگر کیا مجال ہے جو کبھی انہوں نے آنکھ سے آنکھ ملائی ہو؟ انکی آنکھوں میں ایسی خوفناک چمک میں نے دیکھی ہو!"

"اللہ کا شکر ہے، وہ ایسا نہیں ہے، خدا نہ کرے وہ ایسا ہوتا تو میں اس کا گلا گھونٹ دیتی، اس کا دیدہ نکال لیتی!"

"آپ نے ان کی تربیت بڑی اچھی کی ہے، تایا جی نے تو نسیم بھائی کو بالکل بگاڑ دیا ہے۔"

"ہاں ایسا ہی معلوم ہوتا ہے ——— !"

"دیکھ لیجئے گا آگے چل کر رہ جائیں گے، بھلا شریفوں کے یہ لچھن اور ایسے طور طریقے ہوتے ہیں!"

"دکھ تو مجھے بھی ہوتا ہے۔ یہ باتیں سوچ کر!"

"میں تو اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ آج ابا میاں آئیں گے تو ان سے نسیم بھائی کی شکایت کروں گی!"

"ارے بیٹی ایسا غضب نہ کرنا!"

"یہ کیوں چچی اماں!"

"اس طرح بات بڑھ جائے گی!"

"تو کیا ہوگا؟

"بُرا ہوگا، بھائی بھائی کے تعلقات خراب ہوں گے، نسیم کو کچھ ہمیشہ تو یہاں رہنا نہیں ہے، دو چار دن تو آیا ہے پھر چلا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کرو کہ اس سے زیادہ بات چیت نہ کرو!"

"بات چیت کیوں کرنے لگی، میں تو ان کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی ——
چچی اماں فرخ بھائی کب آئیں گے جمال پور سے؟"

"پندرہ دن کو کہہ گیا ہے، دیکھو کب آتا ہے!"

"ابھی تو صرف تین ہی دن ہوئے ہیں!"

"(ہنستے ہوئے) ہاں ——— اس سے یہ بھی بعید نہیں پہلے ہی آجائے، ہر سنیچر کو آجائے، پیر کو چلا جائے، میں نے تو اس سے یہی کہا تھا!"

(۸)

رات کے کھانے پر، امجد، صمد اور نسیم سب جمع ہوئے، ملازم نے میز پر کھانا لگا دیا، رومال سے ہاتھ پونچھتے ہوئے صمد نے ملازم سے کہا۔

"جاؤ غزالہ کو بلا لاؤ ——— تم نے اس سے کہا تھا نہیں کھانا لگا دیا گیا؟ چلو جلدی کرو!"

ملازم دوڑا غزالہ کے کمرہ میں گیا۔

"جلدی چلئے میاں بلاتے ہیں!"

غزالہ نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"کیوں بلاتے ہیں؟"

وہ کہنے لگا۔

"کھانے کے لئے!"

غزالہ نے اُسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"تو نے کہا نہیں، میں کھا چکی ہوں؟"

وہ گھبرائے ہوئے لہجہ میں بولا۔

"انہوں نے مجھے کچھ کہنے کب دیا، خفا ہونے لگے!"

غزالہ نے اطمینان کے ساتھ کہا۔

"تو جا میں آتی ہوں!"

"یہاں اب تک غزالہ کے انتظار میں سب لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے، اتنے میں غزالہ آئی، دروازہ پر کھڑے کھڑے اس نے کہا۔

"آپا جان میں تو کھا چکی، بھوک زور کی لگ رہی تھی!"

اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر وہ واپس چلی گئی،

امجد نے ایک قہقہہ لگایا۔

"ماشاءاللہ سیانی ہو گئی ہے، لیکن بچپن اب تک نہیں گیا مزاج سے۔ شروع کرو میاں صمد!"

سب نے بڑھ بڑھ کر کھانے پر ہاتھ مارنا شروع کر دیئے، صمد نے نسیم سے پوچھا۔

"فیروز آباد پسند بھی آیا تمہیں؟ اب کی تو بہت دنوں کے بعد آئے ہو؟"

قبل اس کے کہ نسیم کوئی جواب دے، امجد نے کہا۔

"یہ سوال بھی خوب کیا تم نے میاں صمد —— ارے میاں تم جنگل میں بھی جا کر رہو تو نسیم کو وہ گلزار نظر آئے گا، کچھ اور بھی سنا تم نے؟"

صمد نے پوچھا۔

"کوئی خاص بات ہے بھائی صاحب؟"

امجد نے جواب دیا۔

"یہ تمہارے بھتیجے صاحب فرما رہے تھے میں اب رحمت پور نہیں جاؤں گا!"

صمد کے چہرے پر حیرت کی کیفیت طاری ہو گئی،

"یہ کیوں؟"

امجد نے ایک قہقہہ لگایا۔

"کہتا ہے میرا وہاں جی نہیں لگتا، میں تو چچا جان کے پاس رہوں گا۔ بے مروّت یہ نہیں سوچتا غم فراق میں ماں رو رو کر اندھی ہو جائے گی —— عجیب زمانہ آ لگا ہے آج کل کے لڑکے کچھ خیال ہی نہیں کرتے، ارے بھئی ایسا ہی اپنے چچا کو چاہتے ہو، تو انہیں کبھی اپنے ہاں بلاؤ، مہمان رکھو، خاطر

کرو، کبھی کبھی تم بھی پھیرا لگا لیا کرو، جس طرح فیروز آباد تمہارا ہے، اسی طرح رحمت پور صمد کا ہے ——— کیوں بھائی ہیں غلط تو نہیں کہتا؟"
صمد نے خندہ پیشانی کے ساتھ کہا۔
"بالکل درست فرمایا آپ نے!"
پڈنگ پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے امجد نے کہا۔
"کیا سلمیٰ اب یہیں رہتی ہے؟"
"جی ہاں!"
"کیا مستقل طور پر؟"
"جی اور کیا!"
"لاحول ولا قوۃ ——— یہ کیا جھمیلا پال لیا ہے تم نے؟"
"کیوں بھائی صاحب؟ ——— کیا میں نے بھابی کو یہاں بلا کر اچھا نہیں کیا؟"
"بالکل اچھا نہیں کیا؟"
"میرا تو ایسا خیال نہیں ہے!"
"بوڑھے ہونے کو آئے لیکن ہو ابھی بالکل بچے تم کیا سمجھو ان باتوں کو؟ یہ عورتیں اور خاص طور پر یہ عورت خدا کی پناہ ——— استغفراللہ!"
"بھائی صاحب نہ جانے آپ سلمیٰ بھابی سے کیوں خفا ہو گئے ہیں، مجھے تو ان میں خوبیاں ہی خوبیاں نظر آتی ہیں!"

"جی کیوں نہیں ——— سلمیٰ بھابی ہونھ!"
"آخر اس خفگی کا سبب بھی تو معلوم ہو!"
"ویسے تو سلمیٰ بھی کوئی غیر نہیں، جی کڑھتا ہے اس کی حالت دیکھ کر غزالہ کو بھی اس سے بڑی مدد ملتی ہوگی۔"
"جی بہت زیادہ جب سے بھابی آئی ہیں، وہ بہت خوش رہنے لگی ہے!"
"لیکن تم جو بدنام ہو رہے ہو؟"
"میں بدنام ہو رہا ہوں؟ بھائی صاحب آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں!"
"رحمت پور اور فیروز آباد میں جو ملتا ہے یہی کہتا ہے کہ صمد میاں سلمیٰ سے

شادی کرنے والے ہیں، کس کس کو سمجھاؤں اور کہاں کہاں تردید کرتا پھروں؟ لاکھ لاکھ کہتا ہوں، جس نے اپنی بیٹی کی خاطر ساری جوانی تجرد میں گذاری وہ بھلا اب شادی کرے گا، اور وہ بھی ایک بیوہ عورت سے؟ ایک جوان لڑکے کی ماں سے؟ لیکن لوگوں کو تو اپنی چہ میگوئیوں سے مطلب ______"

(انتہائی برہمی کے ساتھ) بھائی صاحب ______"

"ہاں بھئی تردید کی کیا ضرورت ہے، کیا میں جانتا نہیں، لیکن وہ جو ہیں تمہاری بھابی، بی مرہم، جو تمہیں نسیم سے زیادہ چاہتی ہیں، جان دیئے دے رہی ہیں رو رو کر!"

"کیوں بھائی صاحب؟"

"سچ پوچھو تو انہی نے بھیجا ہے مجھے، بلکہ کھدیڑ کھدیڑ کر نکالا ہے گھر سے!"

"آپ یہ نہیں بتائیں گے کیوں؟"

"بتاؤں گا کیوں نہیں؟ آیا کس لئے ہوں؟"

"تو فرمایئے پھر!"

"وہ کہتی ہیں اگر صمد کو شادی کرنا ہے تو شوق سے کرے، لیکن میری بچی غزالہ سوتیلی ماں کے پاس نہیں رہے گی، اسے یہاں بھیج دیں۔"

"خدا کے لئے بھائی صاحب ایسی باتیں نہ کیجئے، بھلا ایسا ناپاک خیال میرے دل میں آسکتا ہے؟ آپ کو اندازہ نہیں سلمیٰ بھابی کا میرے دل میں کتنا احترام ہے؟ کتنی عزت ہے، پھر اب نہ ان کی عمر شادی کرنے کی ہے نہ میری، حیرت ہے آپ کے یا بھابی کے دل میں ایسا خیال کس طرح جاگزیں ہوگیا؟"

"بھئی ممکن ہے تمہارا ارادہ نہ ہو، لیکن سلمیٰ کا تو ہے!"

"بالکل غلط (غصے سے) بھائی صاحب میں ایسی باتیں نہیں سن سکتا۔ یہ گفتگو قطعاً میرے لئے ناقابل برداشت ہے!"

"ہمیں کیا ہم تو تمہارے بھلے کو کہتے ہیں، خفا ہوتے ہو تو چپ رہینگے!"

"میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں گا، اگر آپ چپ رہیں گے!"

کھانا ختم ہو چکا تھا، ملازم کافی لے کر آیا، پہلا گھونٹ حلق سے اُتارتے ہی امجد میاں کرسی سے ایک بالشت اُچھل پڑے۔

"لاحول ولاقوۃ، ارے بھئی یہ کیا چیز لے آئے؟"

نسیم نے باپ کو گھور کر دیکھا، اور آہستہ سے کہا۔

"کافی ہے، پی لیجئے!"

امجد میاں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"منہ خراب کر دیا ہے، کوئی شاندار نام رکھ کر پیشاب پینے کو کہو گے تو میں پی لوں گا؟ ___ آخ تھو!

(۹)

صمد میں اور امجد میں رات کے کھانے پر جو تلخ بات چیت ہوئی تھی، اس کا اثر دو روز تک قائم رہا، صمد نے بڑے بھائی کی خاطر مدارات میں تو کوئی کمی نہیں آنے دی، لیکن ویسے ذرا کھنچا کھنچا رہا۔ غزالہ نے تو گویا منہ دکھانے کی قسم کھا رکھی تھی، یا اپنے کمرہ میں پڑی کوئی کتاب دیکھ رہی ہے، یا سلمیٰ کے کمرہ میں بیٹھی اس سے باتیں کر رہی ہے، نہ امجد کے پاس اُٹھتی بیٹھتی تھی، نہ نسیم کو منہ لگاتی تھی

صمد دوکان جا چکا تھا، سلمیٰ دوپہر کے کھانے کے سلسلہ میں ہدایات د نگرانی کا فریضہ انجام دے رہی تھی، غزالہ اپنے کمرہ کے دروازے اندر سے بند کئے ایک آرام کرسی پر دراز کسی انگریزی رسالہ کا مطالعہ کر رہی تھی' امجد میاں اپنے کمرہ میں بستر پر لیٹے حقہ گڑگڑا رہے تھے، نسیم بیکر قہر و جلال بنا دونوں ہاتھ پیٹھ کی طرف سمیٹے، کمرہ میں ٹہل رہا تھا۔ آخر ٹہلتے ٹہلتے، وہ امجد کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

"میں پوچھتا ہوں آخر آپ مجھے یہاں کیوں لائے تھے؟"

امجد نے ایک زوردار کش لگایا، اور بے پروائی سے پوچھا۔

"تم نہیں جانتے میرے ساتھ کیوں آئے ہو؟ کیوں بھیجے گئے ہو؟ کیا تمہاری ماں نے تم سے کچھ نہیں کہا؟ میں نے جو پٹی پڑھائی تھی، کیا وہ بھول گئے؟"

"مجھے تمہاری رائے سے اختلاف نہیں ہے، واقعی یہ لوگ سب ہی چھٹے ہوئے ہیں، لیکن بیٹا، ضرورت کے وقت گدھے کو بھی باپ بنا لیتے ہیں۔"
لیکن نسیم کو اس نظریہ سے اتفاق نہ تھا
"میں ضرورت کے وقت باپ کو تو گدھا بنا سکتا ہوں، لیکن گدھے کو کسی طرح بھی باپ نہیں بنا سکتا ——"
امجد میاں اچھل پڑے۔
"کیا کہا نالائق؟"
نسیم نے باپ کی برہمی کا ذرا بھی اثر نہ لیا۔
"میں صرف ایک بات کہتا ہوں، اب یہاں سے چلئے!"
بے بسی کے ساتھ باپ نے بیٹا بن کر پوچھا۔
"کہاں چلوں؟"
بیٹے نے باپ کی طرح حکم سنایا —— !
"رحمت پور —— اگر آپ نے یہاں رہنے پر اصرار کیا تو یاد رکھیئے میرا پیمانہ صبر چھلک چکا ہے، اب میں ضبط نہ کر سکوں گا، میرا ہاتھ غزالہ پر بھی اُٹھ جائے گا۔"
لرزتے ہوئے اور کانپتے ہوئے امجد نے کہا۔
"غزالہ پر ہاتھ اُٹھ جائے گا؟ یہ کیا کہہ رہے ہو؟ یہ کیا سُن رہا ہوں؟"
نسیم نے اسی لب ولہجہ میں جواب دیا ——
"آپ کے کانوں کو غلط فہمی نہیں ہوئی ہے، واقعی میرا ہاتھ غزالہ پر اُٹھ جائے گا! ——"
"لیکن کیوں؟ —— کس خطا پر کس جُرم میں؟"
نسیم نے تلخ اور درشت لہجہ میں جواب دیا۔
"سب یاد ہے!"
امجد نے سوال کیا،
"پھر بھولے بن کر یہ سوال کیوں کر رہے ہو؟"

نسیم نے اسی برہمی اور کرختگی کے ساتھ کہا۔
"لیکن میں یہاں ایک منٹ بھی نہیں رہنا چاہتا! یہاں کے لوگ ذلیل ہیں، کمینے ہیں، بیہودہ ہیں ——"
امجد بیتابی کے ساتھ اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا،
"یہ کسے کہہ رہے ہو بیٹا؟"
اس نے خشم آلود لہجہ میں جواب دیا۔
"سب کو!"
امجد نے پوچھا۔
"سب کو یعنی کسے؟"
نسیم کا جواب آئینہ کی طرح صاف اور واضح تھا۔
"جو بھی اس گھر میں رہتا ہے جو بھی اس گھر کا مالک ہے!"
اب تو امجد کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے، اس نے بوکھلائے انداز میں سوال کیا۔
"یعنی، یعنی، یعنی ——"
نسیم نے بے پروائی سے جواب دیا۔
"یعنی صمد، یعنی سلمیٰ یعنی غزالہ —— سُن لیا آپ نے!"
امجد میاں تکیہ سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئے۔

"وہ بدتمیز ہے، خودسر ہے، مغرور ہے، میں اسے تمیز سکھا دوں گا میں اس کی خودسری دُور کر دوں گا، میں اس کے غرور کو اپنے جوتے کی ٹھوکر سے کچل دوں گا! آخر وہ اپنے تئیں سمجھتی کیا ہے؟"
"بیٹے میں منع نہیں کرتا۔ یہ سب کچھ تم کر سکتے ہو، غزالہ پر ایک بار نہیں سو مرتبہ ہاتھ اُٹھا لینا، لیکن کم از کم اتنا صبر تو کرو کہ اس کی شادی ہو جائے تمہارے ساتھ —— اسی لئے تو آیا ہوں!"
"میں اس سے شادی کرنا نہیں چاہتا!"
(گھبرا کر) ارے کیوں اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھود رہا ہے لڑکے ——

غزالہ سے شادی نہیں کرے گا ــــ تجھے غزالہ سے شادی کرنا پڑے گی اس سے نہیں اس کی دولت سے صمد کا غزالہ کے سوا اور ہے کون ؟ یہ عالیشان مکان، یہ شاندار دوکان یہ روپے سے بھری ہوئی تجوری، یہ مختلف بینکوں کا لاکھوں سے متجاوز بیلینس یہ زمین، یہ املاک، یہ جائیداد کیا غزالہ کے سوا کسی اور کی ہے ؟ غزالہ سے شادی کے بعد کیا یہ سب چیزیں تیری نہیں ہو جائیں گی نادان ؟"

نسیم پھر ٹہلنے لگا، اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ امجد نے کہا۔

"میں تو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں، آج مرا کل دوسرا دن، یہ سارے جھنجٹ پال کس کے لئے کر رہا ہوں، تو نے یہ بھی نہیں سوچا ؟"

نسیم نے ذرا نرم لہجہ میں کہا۔

"لیکن میں اپنی ذلت نہیں برداشت کر سکتا، ــــ آپ کی تو میں سہتا نہیں، اس کل کی چھوکری کے نخرے ڈبے سہوں گا ؟ آپ تو بہرحال میرے باپ ہیں، اس کی حیثیت کیا ہے ؟ ــــ ایک معمولی سی عورت کیا دنیا میں عورتوں کی کمی ہے ؟"

امجد نے خفگی کے لہجہ میں جواب دیا۔

"تو بالکل نادان ہے، سراسر احمق ــــ میں تیرا باپ ہوں ؟ ہوں نا ؟ اُتار جوتا، مار میرے سر پر، قسم کھاتا ہوں، کچھ جو کہوں لیکن جب تک غزالہ سے تیری شادی نہیں ہو جاتی، اس کے نخرے سہتے پڑیں گے، اس کی کڑوی کسیلی باتیں برداشت کرنا پڑیں گی، اس کے غرور کے آگے سر جھکانا پڑے گا۔ اس کی مرضی پر چلنا پڑے گا۔ اس کے اشارۂ چشم کی تعمیل کرنا ہوگی، نوکر بلکہ غلام بن کر رہنا ہوگا، اس کے سامنے اور جب شادی ہو جائے۔ پھر تو شیر ہے وہ بکری پھر وہ تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، پھر پانسہ تیرے ہاتھ میں ہوگا، پھر وہ تیری لونڈی بن جائے گی۔ پھر صمد میاں تیرے آگے پیچھے ہاتھ باندھ کر چلیں گے آج اس گھر میں ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے سب نے ہمارا بائیکاٹ کر دیا ہو، میں اندھا نہیں ہوں، بیوقوف نہیں، سب کچھ سمجھتا ہوں۔ سب کچھ جانتا ہوں ،

لیکن یہ موقع نہیں کہ حرفِ شکایت زبان پر لاؤں، سلمیٰ کو دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے، اس بس کی پڑیا کا اس گھر میں رہنا خطرہ سے خالی نہیں، میری آنکھیں وہ دیکھتی ہیں جو کوئی نہیں دیکھتا، میرا دماغ وہ سوچتا ہے جو کسی کے خیال میں نہیں آسکتا ——"

نسیم ٹہلتے ٹہلتے رُک کر کھڑا ہو گیا تھا، وہ غور سے باپ کی باتیں سُن رہا تھا، امجد میاں نے سلسلۂ سخن جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔

"لیکن ایک وقت آئے گا اور جلد ہی آئے گا، جب ہم اس گھر میں اس طرح داخل ہوں گے، جس طرح کوئی فاتح کسی مفتوح ملک میں داخل ہوتا ہے، اس گھر کا پتہ بھی ہماری مرضی اور ہمارے حکم کے بغیر جنبش نہیں کر سکے گا،

اس وقت صمد کی گردن ہمارے انگوٹھے تلے ہوگی، اس وقت سلمیٰ کے جونٹے پکڑ کر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسے نکال دوں گا، بیٹے اس وقت تمہیں اختیار ہوگا کہ غزالہ کے ساتھ جو چاہو سلوک کرو، تم نے سچ کہا، دنیا میں عورتوں کی کمی نہیں (مسکرا کر) لیکن جانِ پدر، دولت مند عورتوں کی بہت کمی ہے خوبصورت عورتیں بہت مل جائیں گی لیکن فقیر، مفلس، دریوزہ گر، دولت مند عورت اگر بدصورت بھی ہو تو اس کی قدر کرنی چاہیئے، کم از کم اس وقت تک کے لئے جب تک وہ قابو میں نہ آجائے، اور پھر غزالہ، بدصورت تو نہیں، لاکھوں میں نہیں تو ہزاروں میں ایک ہے، اگر آدمی بن کر رہے تو ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے کوئی اعتراض بھی نہیں کر سکتا، اور اگر شادی کے بعد بھی اس کا وطیرہ نہ بدلے تو پھر اس گھر میں اسے لونڈی اور باندی بن کر رہنا پڑے گا۔"

نسیم کرسی پر بیٹھ گیا، امجد نے کہا۔

"اب بات ذرا بگڑ چکی ہے، غزالہ تم سے اینٹھی ہوئی ہے۔ صمد میاں مجھ سے اکڑے ہوئے ہیں، اس وقت یہاں سے رخصت ہو جانا ہی مصلحت ہے۔ چند روز کے بعد ہم پھر دھاوا کریں گے!"

(۱۰)

اس گفتگو کے بعد نسیم باہر چلا گیا، امجد میاں تکیہ سے ٹیک لگائے، حقہ گڑ گڑاتے رہے، پھر نہ جانے کیا سوچ کر اٹھے، اور باہر نکلے، اتفاق کی بات قسمت کی ماری سلمیٰ نظر آگئی، اسے دیکھ کر تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی، وہ بیچاری کیا جانتی تھی کہ امجد ان لوگوں میں، جن کے بارے میں جگر مراد آبادی نے کہا ——— اوپر اوپر پھول کھلے ہیں بھیتر بھیتر آگ ———

وہ امجد میاں کے سوز درون سے ناواقف تھی، اور امجد میاں کو اس فن میں کمال حاصل تھا کہ دل میں آگ کے شعلے بھڑکتے رہیں اور منہ سے پھول جھڑتے رہیں، انہوں نے سلمیٰ کو دیکھا اور مسکراتے لگے۔

"سلمیٰ بیٹی!"

گویا کوئی بڑا اچھا مصرعہ زبان پر آگیا تھا۔

سلمیٰ جاتے جاتے ٹھٹکی۔

"کوئی کام ہے بھائی صاحب!"

وہ سراپا اخلاق و فروتنی بن کر بولے۔

"تجھے کام کرتے دیکھتا ہوں تو جیسے کلیجہ پر گھونسہ مار دیتا ہے کوئی، ——— ہائے جان ہار احمد اس دنیا سے نہ گذر گیا ہوتا، تو راج کر رہی ہوتی، تو اس وقت اور اب ———"

یہ کہہ کر وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگے، سلمیٰ گھبرا گئی۔

"کیا ہوا بھائی صاحب؟"

وہ آنسو پونچھتے ہوئے اور ہچکیوں پر قابو پاتے ہوئے بولے۔

"کاش میری زندگی احمد کو مل جاتی، لیکن اس دنیا میں سب کچھ ہو سکتا ہے مگر زندگی کا سودا نہیں ہو سکتا —— احمد زندہ ہوتا تو کیا اسی طرح لونڈیوں کی طرح صبح سے شام تک کام میں جٹی رہتی —— صمد میاں کچھ تنخواہ بھی دیتے ہیں تجھے؟"

سلمیٰ کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ اس نے ذرا رکھائی کے ساتھ کہا۔

"بھائی صاحب ایسی باتیں نہ کیجئے۔ مجھے یہاں کام ہی کیا کرنا پڑتا ہے کچھ نہیں، بس صرف اتنا ہی صبح سے شام تک دیور کی خدمت کرتی ہو، اس کی لڑکی کو بہلایا کرتی ہو، یہ بھی کوئی کام ہوا؟"

"بھائی صاحب یہ آپ کی غلط فہمی ہے بھیا تو چاہتے ہیں میں اُٹھ کر پانی نہ پیوں، یہی حال غزالہ کا ہے مجھے کوئی کام کرتے دیکھتی ہے تو مچل جاتی ہے اور خود کرنے لگتی ہے، جو کچھ کرتی ہوں، وہ بھی اپنی زبردستی!"

احمد میاں کو سلمیٰ کے اس "سفید جھوٹ" پر ہنسی آگئی، فرمایا۔

ارے لڑکی میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کئے ہیں، جتنا کام تو کرتی ہے، پچاس روپیہ مہینہ تنخواہ اور سو روپیہ مہینہ اوپر سے اُڑا لینے والی نوکرانی تو کر کے دکھائے —— ؟"

سلمیٰ نے پھر احمد میاں کی غلط فہمی رفع کرنے کی کوشش کی۔

" پھر بھائی صاحب یہ بھی تو ہے، آدمی جس گھر میں رہے، اپنا سمجھ کر رہے میں تو اس گھر کی ہر چیز کی اسی طرح رکھوالی کرتی ہوں۔ جس طرح اپنی کسی چیز کی کرنی چاہیئے!"

احمد میاں نے دیکھا، داؤں کارگر نہیں ہوا، فوراً بدل گئے، عقیدت اور عظمت کی نظروں سے سلمیٰ کو دیکھا اور ایک آہ سرد کے ساتھ گویا ہوئے "سلمیٰ تو اس بات کا جیتا جاگتا نمونہ ہے کہ شریف عورت کیا ہوتی ہے؟ تیری یہی باتیں

ہیں جنہوں نے میرے دل میں تیری عزت اور عظمت پیدا کر دی ہے، کتنی مجھے حسرت تھی کہ خدا کوئی لڑکی دیتا، اور وہ لڑکی سلمیٰ ہوتی ــــــ لیکن یہ میں کیا کہہ رہا ہوں ــــــ کیا تو میری لڑکی نہیں ہے ؟"

سلمیٰ نے ادب سے سر جھکا لیا، اور بولی۔

"میں تو ہمیشہ سے یہی سمجھتی ہوں!"

لیکن امجد نے کف افسوس ملتے ہوئے کہا۔

"مگر میری آنکھوں پر تو پردے پڑے ہوئے تھے، احمد کی زندگی میں تیرا اصلی روپ میری نظروں سے اوجھل رہا، تیرے جوہر تو بیوہ ہونے کے بعد کھلے ہیں، نہ تو بیوہ ہوتی، نہ تیرا یہ باعظمت کردار نظروں کے سامنے آتا، اس اعتبار سے احمد کا مرنا بھی مشیت ربی کا کرشمہ تھا!"

امجد کی یہ توضیح سلمیٰ کو کچھ پسند نہ آئی، لیکن ان سے بحث کرنا بھی معیوب تھا، وہ خاموش ہو رہی، امجد میاں نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"غزالہ کہاں ہے ؟"

سلمیٰ نے جواب دیا۔

"اپنے کمرہ میں ہے!"

وہ آگے بڑھ گئے!

---

(۱۱)

امجد میاں تیر کی طرح سیدھے غزالہ کے کمرے میں پہنچے۔ وہ اب تک آرام کرسی پر دراز کچھ پڑھے جا رہی تھی، اب جی اُکتایا تو اُٹھی اور ریڈیو کی گوشمالی کرنے لگی، اس کے اندر سے مختلف قسم کی آوازیں زیر و بم کے ساتھ نکلنے لگیں، امجد میاں دبے پاؤں کمرہ میں داخل ہوئے، اور اس کی پیٹھ کے پاس جاکر چپ چاپ کھڑے ہو گئے، وہ بڑی دیر تک مختلف اسٹیشن ملاتی رہی، لیکن کوئی پسند نہ آیا۔ یکایک اس کے کانوں میں ثریا کا نغمہ گونجا وہ غالب کی غزل گا رہی تھی۔

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی
شق ہو گیا ہے سینہ زہے لذتِ فراق
تکلیفِ پردہ داریٔ زخمِ جگر گئی
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں؟
اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی
دیکھو تو دل فریبیٔ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی
ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی
نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی
فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

غالب کی غزل ثریا کا سحر طراز نغمہ غزالہ بت بنی یہ غزل سنتی رہی، پھر ایک کلاونت نے پکا گانا شروع کر دیا، اس نے جھلا کر ریڈیو بند کر دیا۔

سوچا جاؤں ذرا سلمیٰ چچی کا دماغ کھاؤں، وہ مڑی اس نے دیکھا سر پر امجد میاں کھڑے مسکرا رہے ہیں، اور محبت بھری نظروں سے دیکھ رہے، انہیں دیکھ کر وہ سٹ پٹا گئی۔

"ارے آپ؟"

امجد میاں نے قہقہہ لگایا۔

"ہاں بیٹی میں!"

"لیکن آپ کب آئے، مجھے تو پتہ بھی نہیں چلا!"

"تم اتنی محویت سے گانا سُن رہی تھیں، پتہ کیسے چلتا؟"

"جی ہاں، ثریا کی آواز مجھے پسند ہے، خوب گاتی ہے؟"

"(بھولے بن کر) لیکن ثریا کون؟"

"(ہنستے ہوئے) ارے آپ ثریا کو بھی نہیں جانتے؟ مس ثریا جس کی نغمہ طرازی کی دھوم ہے!"

"ہوگی بھئی، ہم تو آج ہی مس ثریا کا کلام سننے کے گنہگار ہیں!"

"ہنسی روکنے کی کوشش کرتے ہوئے" تایا جی گانا مس ثریا کا تھا کلام غالب کا!"

"یہ کون بزرگ ہیں؟ میں نے تو ان کا نام بھی آج ہی سُنا ہے، ویسے شعر تو اچھے کہے ہیں —— کبھی ملی ہو غالب سے؟"

"خدا نہ کرے تایا جی —— غالب سے ملنے کے لئے تو مرنا پڑے گا!"

"یہ کیوں بیٹی؟ یہ کیا کہا تم نے؟"

"جی اور کیا، وہ تو مر بھی چکے۔"

"(افسوس کرتے ہوئے) مر گئے بیچارے —— (آہ سرد کے ساتھ) اس زمانہ میں لوگ اس آسانی سے مر جاتے ہیں کہ کچھ نہ پوچھو، ذرا نہیں سوچتے ان کے بعد ان کے متعلقین کیا کریں گے —— کوئی لڑکا ہے غالب کا؟"

اب تو عزالہ کے لئے ہنسی کا ضبط کرنا دشوار ہو گیا، وہ بے اختیار قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

"تایا جی غالب کا لڑکا ؟"

اور وہ پھر ہنسنے لگی، امجد میاں نے مصنوعی غصّہ کے ساتھ اُسے ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔

"کیا کہا ہے ـــــ میں غالب کا لڑکا ہوں ؟"

غزالہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگئی۔

"غالب کو تو مرے ہوئے سو برس ہونے کو آئے، آپ ان کے بیوی بچوں کی خیریت پوچھ رہے ہیں!"

امجد میاں کو بھی اپنی ناواقفیت پر ہنسی آگئی، کہنے لگے۔

"بیٹی میں کیا جانوں غالب کون تھے ؟ اور ثریا غالب کی کیا لگتی ہے ؟ میں تو ٹھیٹھ کاروباری آدمی ہوں، شعروسخن سے مجھے کیا سروکار ؟"

بیٹی ایک بات بتاؤ !"

غزالہ نے آمادگی کے ساتھ پوچھا۔

"ضرور بتاؤں گی ـــــ کہئے کیا بتاؤں ؟"

امجد کے چہرے پر سنجیدگی پیدا ہوگئی، ایسا معلوم ہوا، آنکھیں اب گوں ہوتی جارہی ہیں، اور ہونٹ اس طرح پھڑپھڑا رہے ہیں، جیسے روتے سے پہلے، یا رونا ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پھڑپھڑانے لگتے ہیں، یہ منظر دیکھ کر غزالہ پریشان ہوگئی، اس نے محبت بھرے لہجہ میں پھر اپنا سوال دہرایا۔

"کیا بات ہے تایا جی ؟"

امجد نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"تم ہم سے کب تک خفا رہوگی ـــــ ؟"

غزالہ نے سراپا حیرت بن کر امجد کو دیکھا۔

"بھلا آپ سے میں خفا ہوسکتی ہوں ؟ کوئی بزرگوں سے بھی خفا ہوتا ہے ؟"

امجد میاں کا چہرہ وفورِ مسرت سے دمکنے لگا، انھوں نے خوشی سے بے قابو ہوکر کہا۔

بیٹی تو نے بہت بڑا بوجھ میرے دل سے اُتار دیا، اب میں خوش ہوں،

(ٹھنڈی سانس لے کر) اب میں مطمئن ہوں، رات بھر نیند نہیں آئی، اس فکر میں آج واپس رحمت پور جا رہا ہوں، سوچا اگر تو روٹھی رہی، تو مرہم کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ وہ تو مجھے اُلٹے پاؤں واپس کر دے گی، گھر میں قدم نہیں رکھنے دے گی!۔۔۔۔ ممکن ہے خود بھاگی بھاگی چلی آئے!"

غزالہ انگشت بدنداں امجد کی یہ باتیں سُن رہی تھی اس نے کہا۔

"لیکن ایسی اَن ہوتی بات کا خیال کیوں آیا آپ کے دل میں، مجھے شرمندگی ہو رہی ہے اس تصوّر سے، آخر آپ نے میری کس بات سے یہ اندازہ لگایا۔

امجد میاں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"بیٹی ایمان کی بات تو یہ ہے کہ تیرا جیسا اخلاق، میں نے کسی میں نہیں دیکھا۔ میں خود حیران تھا کہ بغیر کسی بات کے، بغیر کسی وجہ کے تو ہم سے کیوں روٹھے گی! معلوم ہوتا ہے غلط فہمی ہو گئی اسے!"

اب تو غزالہ کی حیرت اور بڑھی۔

"کسے غلط فہمی ہو گئی تایا جی۔"

امجد نے کہا۔

"خیر کوئی بات نہیں۔ میں سمجھا دوں گا اسے!"

عاجز آکر غزالہ نے کہا۔

"لیکن اس کا نام بھی تو لیجئے تایا جی!" ۔۔۔۔ کسے سمجھا دیں گے؟ کسے غلط فہمی ہوئی ہے؟"

امجد نے قدرے تامل کرتے ہوئے کہا

"ارے بھئی وہی دیوانہ ۔۔۔۔ نسیم اور کون؟ نہ جانے اس کے دل میں یہ کیوں بیٹھ گیا ہے کہ تم اس سے خفا ہو؟ میرے اصرار سے بہ مشکل دو چار لقمے توڑ لیتا ہے، کھانا بھی نہیں کھایا جاتا اس صدمہ سے!"

غزالہ نے ان باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا، اتنے میں امجد میاں نے پکارنا شروع کیا۔

"نسیم، نسیم، نسیم!"

وہ ابھی ابھی باہر سے آیا تھا، آواز سنتے ہی باپ کی طرف لپکا کہ کیا حادثہ ہوگیا، کہیں گر تو نہیں پڑے، دروازہ پر کھڑے ہو کر غزالہ کی طرف دیکھے بغیر اس نے پوچھا۔

"کیا بات ہے ابّا جان!"

امجد میاں اُٹھتے ہوئے اور نسیم کی پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے، اور خوشی کا جھولا جھولتے ہوئے بولے۔

"دیکھو میں نہ کہتا تھا ——— غزالہ نہ مجھ سے روٹھی ہے، نہ تم سے خفا ہے، وہ ایسی لڑکی ہی نہیں مفت میں خود بھی پریشان ہوئے مجھے بھی پریشان کیا!" (غزالہ سے مخاطب ہو کر) اچھا بیٹے!"

پھر نسیم کو لے کر باہر چلے گئے!

---

(۱۲)

امجد نسیم کو اپنے ساتھ لیتا گیا تھا، تھوڑی دیر کے بعد نسیم پھر نمودار ہوا، اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا کیمرہ تھا، وہ مسکراتا ہوا آیا، اور غزالہ کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیوں بھئی ہمارا آنا تمہیں ناگوار تو نہیں گزرا؟"

ناگوار تو گزرا تھا، لیکن مہمان کے منہ پر اتنی صاف گوئی سے تو کام نہیں لیا جا سکتا کہ واقعی کہہ دیا جائے، ہاں صاحب آپ کی تشریف آوری ہمیں ناگوار گذری ہے، واپس چلے جایئے ٹھنڈے ٹھنڈے، اس نے ازراہِ اخلاق جواب دیا۔

"نسیم بھائی، آخر اس طرح کے خیالات کیوں آ رہے ہیں، آپ کے دل میں؟"

وہ شوخ نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

"دل ہی تو ہے!"

یہ جواب سن کر غزالہ کا چہرہ سُرخ ہو گیا، کوئی اور موقع ہوتا تو شاید وہ کھڑے کھڑے نسیم میاں کو چلتا کر دیتی، لیکن ابھی ابھی ایک بڑا مرحلہ طے کر کے تایا جی گئے تھے، کوئی ایسی ویسی بات منہ سے نکل گئی، تو خواہ مخواہ پھر ایک ہنگامہ شروع ہو جائے گا، ممکن ہے بات ایا جی تک پہنچے، پھر یہ لوگ اب جا ہی رہے

ہیں تو کیا فائدہ مزید بدمزگی اور تلخی سے، یہ سوچ کر وہ چپ ہو رہی بعض دفعہ ایک خاموشی میں ہزار بلائیں ٹل جاتی ہیں اس کی خاموشی سے نسیم کا حوصلہ اور بڑھ گیا۔ اس نے پوچھا۔

"کیوں غزالہ کیا اپنی کوئی تصویر دے سکتی ہو؟"

غزالہ کا چہرہ سُرخ ہوگیا، پھر بڑی مشکل سے اس نے ضبط کیا۔

"نہیں نسیم بھائی، میں نے اپنی تصویر کبھی نہیں کھنچوائی!"

نسیم کو یقین نہیں آیا،

"کالج کی طالبات کے ساتھ کوئی گروپ فوٹو بھی نہیں ہے؟"

تھا تو، لیکن کیوں دکھاتی؟ کیوں بتاتی؟ اس نے صاف انکار کر دیا،

"جی نہیں!"

نسیم کو اب بھی اس بات کے تسلیم کرنے میں تامل تھا۔

"بھئی تم لوگ، جوان لڑکیاں ہو یا بوڑھی مائیں؟"

پھر خود ہی قہقہہ لگایا، اور گویا ہوا۔

"جی چاہتا ہے آج سے تمہارا نام ملانی جی رکھ دوں!"

غزالہ نے کہا۔

"رکھ دیجئے!"

نسیم کو حیرت ہوئی۔

"ارے تم بُرا نہیں مانو گی ——؟"

غزالہ نے جواب دیا،

"بالکل بُرا نہیں ماننے کی؟"

نسیم کہنے لگا۔

"حیرت ہے —— یہ کیوں بھئی!"

غزالہ بولی،

"شیکسپیئر کا قول ہے گلاب کے پھُول کو تم کسی نام سے بھی پکارو، وہ گلاب کا پھُول ہی رہے گا!"

"یہ جواب باصواب سُن کر نسیم کی ساری حاضر جوابی رخصت ہو گئی، اسے نہ شیکسپیئر سے کوئی سروکار تھا، نہ گلاب کے پھول سے، لیکن اس لڑکی نے ایسی تیکھی بات کہہ دی تھی کہ وہ دم بخود رہ گیا، جیسے سکتہ سا ہو گیا ہو، لیکن وہ ایک خاص مقصد لے کر آیا تھا، یوں چُپ چپاتے ہار بھی نہیں مان سکتا تھا، اس نے کیمرہ نکال لیا اور اس کا لینز ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

"بس اسی طرح بیٹھی رہو —— بالکل اسی طرح —— نہیں بھئی جنبش نہ کرو! —— ہاں اب ٹھیک ہے!"

لیکن غزالہ کھڑی ہو گئی،

"آپ کا مقصد کیا ہے آخر؟"

نسیم نے سادگی سے جواب دیا۔

"تمہاری تصویر کھینچوں گا، اپنے ساتھ لے جاؤں گا، یادگار کے طور پر میرے پاس رہے گی، تم اس پر دستخط بھی کر دینا کوئی شعر لکھ کر!"

ہر چیز کی ایک انتہا ہوتی ہے، اب اس کا پیمانۂ صبر چھلک چکا تھا، اس نے کہا۔

"نسیم بھائی نہ جانے آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں —— نہ میں تصویر کھنچواؤں گی، نہ دستخط کروں گی، نہ کوئی شعر مجھے یاد ہے!"

اور پھر وہ خاموشی کے ساتھ کمرہ سے چلی گئی!

بے ساختہ نسیم کے منہ سے نکلا،

"پھڑ بل —— کمینی، حرامی —— !"

لیکن غزالہ جا چکی تھی!

(۱۳)

غزالہ سلمیٰ کے کمرہ میں پہنچی تو اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا، کان کی لویں تک سُرخ ہو رہی تھیں، آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے، سلمیٰ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر سراسیمہ ہو گئی، وہ بستر پر لیٹی تھی۔ غزالہ کو اس رنگ میں دیکھ کر بے تابانہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"غزالہ یہ تمہاری کیا کیفیت ہو رہی ہے؟"

وہ غمزدہ لہجہ میں بولی۔

"ٹھیک ہوں چچی اماں ــــــ!"

سلمیٰ نے پوچھا۔

"بیٹی میں باتوں میں آنے والی نہیں، ضرور کوئی خاص بات ہے!!"

اس کے ہونٹوں پر ایک سوگوار سا تبسم نمودار ہوا۔

"نہیں سچ ـــــ کوئی بات نہیں!"

سلمیٰ بھی جیسے اصل حقیقت معلوم کرنے کے لئے اڑ گئی تھی۔

"نا بیٹی، میں تو نہیں ماننے کی، تو میری گودوں کی کھلائی ہوئی ہے، تیری رگ رگ اور نس نس سے واقف ہوں، مجھے باتوں میں اڑانے کی کوشش نہ کر!"

غزالہ مسکرانے لگی،

"آپ پوچھے جائیں گی تو میں یوں ہی جھوٹ موٹ کوئی بات بتا دوں گی!"

سلمٰی ہنسنے لگی، پھر اس نے دریافت کیا۔
"صمد بھیّا نے کچھ کہا ہے؟"
عزالہ پھر سنجیدہ بن گئی۔
"بھلا وہ کیا کہیں گے؟ کبھی آج تک تو انہوں نے کچھ کہا نہیں!"
سلمٰی کا اضطراب اب بھی قائم تھا۔
"کوئی نہ کوئی بات ہے ضرور، لاکھ چھپاؤ میں نہ مانوں گی، اس کا مجھے دُکھ ہے کہ تم مجھے اس قابل نہیں سمجھتیں!"
عزالہ نے سلمٰی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔
"خفا ہوگئیں چچی اماں ——؟"
سلمٰی نے اس کی پیشانی پر پیار کرتے ہوئے کہا۔
"کہیں ماں اپنی بیٹی سے بھی خفا ہوتی ہے؟"
عزالہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب سلمٰی کو رازدار بنا لے گی۔
"بات یہ ہے کہ یہ باپ بیٹے کس مٹی کے بنے ہیں، کسی طرح سمجھ ہی میں نہیں آتا!"
سلمٰی نے پوچھا۔
"آخر ہوا کیا؟ کچھ کہو گی بھی یا نہیں؟"
آخر عزالہ نے امجد اور نسیم کی ساری باتیں سنا دیں، پھر کہنے لگی، ——
"چچی اماں آخر ان باتوں کا انجام کیا ہوگا؟ سوچئے تو سہی بھلا یہ حرکتیں برداشت کی جا سکتی ہیں؟ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے دونوں باپ بیٹے مل کر ابا کو، اور مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا کوئی خاص مقصد ہے، جسے اب تک زبان پر نہیں لائے ہیں، لیکن دیکھ لیجئے گا ایک نہ ایک دن آئے گا زبان پر، اور اس گھر میں وہ آخری دن ہوگا، ان دونوں کے لئے میں صرف اس کا لحاظ کرتی ہوں کہ تایا جی میرے باپ کے بڑے بھائی ہیں، بوڑھے ہیں، مہمان ہیں، آج آئے ہیں کل چلے جائیں گے، نسیم بھائی کے بارے میں بھی یہی سوچتی ہوں کہ تایا جی کے لڑکے ہیں، تعلیم سے بے بہرہ، تربیت سے محروم، تہذیب سے ناآشنا ہمیں کچھ ان کے ساتھ گزر تو کرنا نہیں ہے، لاکھ بیہودگی

کریں، احمقانہ باتیں کریں، ٹال جانا چاہیئے ــــــ۔"
سلمٰی نے تائید کی،
"ہاں بیٹی یہی ٹھیک ہے، یہی مناسب ہے!"
لیکن تلملا کر عزالہ نے جواب دیا۔
"مگر اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے، زیادہ برداشت کرنا میرے لئے ناممکن ہے، میں سب کچھ سہہ سکتی ہوں انگیز کر لے جا سکتی ہوں، لیکن گستاخ نگاہیں اور بیہودہ باتیں کسی طرح بھی نہیں گوارا کر سکتی، اب تک میں نے صرف اسلئے طرح دی کہ
"کسی لئے بھی طرح دی، بہرحال اچھا کیا، آج شام کو ورنہ صبح یہ لوگ چلے ہی جائیں گے، پھر کیا فائدہ غصہ کرنے سے!"
عزالہ نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔
"یہ ٹھیک ہے چلے جائیں گے، لیکن پھر آ جائیں گے!"
سلمٰی اس معصوم اعتراض پر ہنسنے لگی۔
"ہاں بیٹی انہیں روک کون سکتا ہے؟ گھر ان کا ہے!"
وہ روٹھتی ہوئی بولی۔
"واہ کہیں ہوا نہ ہو، میں نے تو فیصلہ کر لیا ہے، آج ابا جان سے سارا پول کھولے دیتی ہوں یا پپ بیٹے کا ــــ!"
سلمٰی نے منع کیا۔
"اس دفعہ خاموش ہو جاؤ، اب کے اگر آئیں اور ایسی حرکتیں کریں تو مجھے بتا دینا، میں خود بھیا کو سمجھا دوں گی، بہت اچھی طرح سب کچھ!"

(۱۴)

امجد اور نسیم خدا خدا کر کے رخصت ہوئے، جاتے وقت امجد نے سلمٰی کے سر پر ہاتھ پھیرا، غزالہ کا سر اپنے سینہ سے لگا کر الوداعی آنسو بہائے اُسے دُعائے ترقی عمر و اقبال دی، نسیم چپ چاپ منہ پھلائے الگ کھڑا رہا جیسے اس ناٹک سے اسے کوئی واسطہ نہیں، ان لوگوں کے جانے کے بعد غزالہ نے اطمینان کا سانس لیا، اور سلمٰی کی طرف دیکھتے ہوئے زیرلب تبسّم کے ساتھ کہا۔

"الٰہی تیرا شکر!"

سلمٰی ہنسنے لگی،

"بڑی شریر ہوگئی ہے تو؟"

وہ بولی۔

"سچی امّاں میں تو ذہنی طور پر مفلوج ہو کر رہ گئی تھی، ایسی باتیں بھلا کاہے کو میں نے کبھی سنی تھیں ایسے ناٹک میں نے زندگی بھر نہیں دیکھے تھے، زندگی جنجال بن گئی تھی، جی چاہتا تھا کپڑے پھاڑ کر بھاگ جاؤں کسی طرف!"۔۔۔

سلمٰی نے پیار بھری نظروں سے اُسے دیکھا اور کہا۔

"بڑی انتہاپسند ہو!"

وہ اٹھلاتی ہوئی گویا ہوئی،

"کیا کریں چچی، ہم تو ایسے ہی ہیں ـــــ آپ نے ایک بات پر غور کیا تھا ـــــ؟"

سلمٰی نے پوچھا،

"کون سی بات؟ میں نے تو کسی طرف دھیان نہیں دیا!"

غزالہ ہنسنے لگی۔

"رسی جل گئی، مگر اس کا بَل نہ گیا ـــــ تایا جی تو خوب محبت آپ کے اور میرے ساتھ بگھار رہے تھے، اور نسیم بھائی منہ پھلائے ایک کونہ میں الگ تھلگ اس طرح کھڑے ہم دونوں کو گھور رہے تھے جیسے یا ئیں تو کچّا چبا جائیں، نہ جانے آپ نے اور میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے؟"

سلمٰی نے پوچھا۔

"میں نے بھی؟"

غزالہ نے بتایا۔

گھُور تو آپ کو بھی اسی طرح رہے تھے ـــــ اصل بات یہ ہے وہ ہم دونوں سے خفا ہیں!"

"ذرا دیر چپ رہ کر پھر غزالہ نے سلمٰی کو مخاطب کیا ـــــ

"لیکن چچی اماں ایک کام بڑا ضروری ہے، اُسے کرنا ہی چاہیئے، اور وہ آپ کے سوا کوئی نہیں کرسکتا!"

سلمٰی نے آمادگی اور جوش کے ساتھ کہا۔

"ضرور کروں گی بتاؤ!"

غزالہ نے شوخ نظروں سے چچی کو دیکھا، اور بولی۔

کوئی ایسی ترکیب کیجئے کہ کم از کم نسیم بھائی اب اس گھر میں قدم نہ رکھیں ـــــ جب اُن کی تصویر مانگنے کی بات اور اس پر شعر لکھنے کی فرمائش کا خیال آتا ہے، تو مارے غصّہ کے بیٹھے بیٹھے کانپنے لگتی ہوں کیوں چچی نسیم بھائی کو اس طرح کی بات مجھ سے کہنا چاہیئے تھی؟ کیا شریفوں کے یہی لچھن ہوتے ہیں؟"

سلمٰی نے جواب دیا۔

"نہیں ــــــ مجھے خود حیرت ہے بھائی صاحب نسیم کی تربیت کی طرف کیوں توجہ نہیں کرتے، اگر وہ آوارہ ہوگیا، تو اس کی ذمہ داری کس پر ہوگی؟ اس سے نقصان کسے پہنچے گا، ہمارا تو کچھ بگڑے گا نہیں، وہی سر پہ ہاتھ رکھ کر روئیں گے۔"

"اور روتے نہیں بن پڑے گا۔" غزالہ نے کہا۔

"ہاں اور کیا!"

"لیکن چچی اماں آپ نے "اگر" کی شرط خوب لگائی، آپ کے خیال میں آئندہ چل کر نسیم بھائی کے آوارہ ہوجانے کا اندیشہ ہے یا نہیں؟ ــــ"

(۱۵)

عزالہ کالج سے واپس آئی تو یہ دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں کہ حضرت فرخ تشریف فرما ہیں بے ساختہ اس نے پوچھا۔

"ارے آپ کب آئے ؟"

فرخ اس کی سحر طراز آنکھوں کی تاب نہ لا سکا، نظر جھکا کر گویا ہوا۔

"آج ہی ـــــ ابھی ذرا دیر ہوئی !"

عزالہ نے اپنی بے پایاں مسرت کو چھپانے کی ذرا بھی کوشش نہ کی کہنے لگی۔

"بڑا اچھا کیا آپ نے ـــــ مجھے تو اندیشہ تھا کہیں بیمار نہ پڑ جاؤں آپ کو نہیں معلوم فرخ بھائی مجھ پہ اس عرصہ میں کیا کیا آفتیں گذر گئیں !"

عزالہ ایک ہی سانس میں اتنی ساری باتیں کر گئی، مگر فرخ کی سمجھ میں خاک نہ آیا، عزالہ کہنا کیا چاہتی ہے۔

"کون سی آفتیں گذر گئیں تم پر ؟"

"کچھ بتاؤ تو سہی۔"

وہ سادگی سے بولی۔

"ارے وہ آئے تھے، تایا جی ـــــ"

"تو کیا وہ اپنے ساتھ آفتیں بھی لائے تھے ؟" فرخ نے پوچھا۔

"ہاں ایک بہت بڑی آفت، جس کا نام ہے نسیم بھائی ـــــ آپ نہیں

سمجھے تایا جی کے ولی عہد بہادر !" غزالہ نے بتایا۔

"سمجھ تو گیا، نسیم کو اچھی طرح جانتا ہوں !"

" آپ نسیم بھائی کو جانتے ہیں ؟"

"ہاں خوب !"

"پہچانتے بھی ہیں ؟"

" بہت اچھی طرح !"

"کیا رائے ہے آپ کی ان کے بارے میں —— ؟"

" وہی جو تمہاری ہے !"

" معلوم ہو یا نہ ہو، اتنا بہرحال یقین ہے کہ تم غلط رائے نہیں قائم کر سکتیں، اگر تم نے نسیم کے بارے میں اچھی رائے قائم کی ہے تو تسلیم کروں گا وہ بہترین آدمی ہے !"

" اور اگر بری رائے قائم کی ہو ہیں نے تو ؟"

" پھر میری نظر میں اس سے بدتر آدمی کوئی نہ ہوگا !"

غزالہ ہنسنے لگی۔

" بنا لیجئے، خوب جی بھر کے !"

فرخ نے سنجیدہ لب و لہجہ میں کہا۔

" غزالہ مجھے غلط سمجھنے کی کوشش نہ کرو —— کیا واقعی تمہارا یہ خیال ہے کہ میں تمہیں بنا تا ہوں ؟"

فرخ کے اس سوال میں فریاد سی محسوس کی غزالہ نے، اس نے اظہارِ ندامت کرتے ہوئے کہا۔

" میں تو یونہی مذاق کر رہی تھی !" —— لیکن فرخ بھائی، نسیم بھائی اتنے بُرے کیوں ہیں ؟ آپ اتنے اچھے کیوں ہیں ؟"

بے تحاشہ فرخ ہنس پڑا۔

" یہ کیا قصہ لے بیٹھیں تم ؟ —— نہ وہ بُرے ہیں نہ میں اچھا ہوں !"

غزالہ کو فرخ کی اس رائے سے اتفاق نہ تھا۔

"یوں تو میں ہمیشہ سے آپ کو اچھا آدمی سمجھتی ہوں، لیکن جب سے نسیم بھائی کے کرتوت دیکھے ہیں میرے دل میں، میری نظر میں آپ کی وقعت کئی گنا بڑھ گئی ہے، ایک آدمی کی صورت میں شیطان، دوسرا آدمی کے روپ میں فرشتہ ہے!"

فرخ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اس قدر جلد انتقام نہ لیا کرو!"

غزالہ نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"انتقام کیسا؟"

فرخ نے جواب دیا۔

"ابھی تم کہہ رہی تھیں کہ میں تمہیں بنا رہا ہوں، اب تم نے مجھے بنانا شروع کر دیا، یہ انتقام نہیں تو اور کیا ہے؟"

اتنے میں سلمیٰ آ گئی، اس نے فرخ سے کہا۔

"ارے تم یہاں بیٹھے ہو، میں تمہیں تلاش کرتی پھر رہی ہوں، چلو چائے تو پی لو!"

فرخ اُٹھ کھڑا ہوا، غزالہ نے اُسے روکا۔

"بیٹھئے فرخ بھائی!"

پھر بچوں کی طرح اٹھلاتے ہوئے اس نے سلمیٰ سے کہا۔

"اچھی چچی اماں، یہیں بھیج دیجئے اتنے دنوں کے بعد تو فرخ بھائی آئے ہیں، ان سے باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے، یہیں پی لیں گے ہم دونوں ––!"

فرخ پھر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا، سلمیٰ واپس چلی گئی، ذرا دیر میں ملازمہ چائے کی ٹرے لئے حاضر ہوئی۔ اس نے ٹرے میز پر رکھ دی۔ اور چلی گئی، غزالہ چائے بنانے لگی۔

---

(۱۶)

فرخ سامنے بیٹھا تھا چہرے بشرے سے معلوم ہو رہا تھا، کسی گہری فکر میں غرق ہے، غزالہ نے چائے بنا کر پیالی اس کے سامنے رکھ دی، پھر اپنی پیالی سے ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"فرخ بھائی کچھ سوچنے لگے آپ ؟"

فرخ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اسی طرح بحر خیالات میں غوطہ زن رہا۔ اب کے غزالہ نے ذرا زور سے کہا۔

"میں پوچھتی ہوں، آپ کہاں تشریف لے گئے ہیں ؟"

وہ چونک پڑا، اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ذرا رحمت پورہ گیا تھا۔"

"غزالہ کے خوبصورت ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگا۔

"کس سے ملنے ؟"

فرخ نے زیر لب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہارے نسیم بھائی سے، شرفِ نیاز حاصل کرنے !"

وہ ذرا چڑتی ہوئی بولی۔

"میرے نسیم بھائی، لیکن آپ کے بھی تو ہیں وہ کچھ ؟"

فرخ نے جواب دیا۔

"ہاں کیوں نہیں، ضرور ہیں، رشتہ کوئی معمولی نہیں بھائی کا ہے، لیکن سوچ رہا ہوں، کاش وہ ہمارے بھائی نہ ہوتے، کاش ان سے ہمارا کوئی رشتہ نہ ہوتا، کاش ہم لوگ ایک دوسرے سے واقف نہ ہوتے!"

یہ باتیں فرخ نے کچھ ایسے تیور اور ایسے لہجہ میں کہیں کہ عزالہ یہ سوال کئے بغیر نہ رہ سکی۔

"آپ کیوں نالاں ہیں اتنے؟ آپ کا ان سے تو کچھ بگاڑ نہیں ہوا؟"

فرخ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"تمہاری زبان سے ان ذاتِ شریف کی ساری باتیں سُن چکا ہوں، اس سے پہلے بھی، ان کے چند کارنامے میرے علم میں آچکے ہیں، ان حالات کی روشنی میں یہ سوال واقعی بڑا اہم ہے کہ ــــــ"

عزالہ نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کے علم میں بھی ان کے کچھ کارنامے ہیں؟ ضرور بتایئے، مجھے اشتیاق ہے ان کے سننے کا!"

فرخ نے سنجیدہ لب و لہجہ میں کہا۔

"نہیں عزالہ وہ ایسی باتیں نہیں جنہیں سُن کر خوشی ہو، تکلیف ہی ہوگی!"

"کیا اس سے بھی زیادہ جو پہنچ چکی ہے؟"

"ہاں شاید اس سے بھی زیادہ، بہت زیادہ!"

"ہونے دیجئے، آپ بتایئے، ماجرا کیا ہے؟"

"وہ ایک مرتبہ جمال پور بھی گئے تھے ــــــ جب میں یہاں چھٹیاں گذار رہا تھا!"

"(چونک کر) کیوں، وہاں کیوں گئے تھے؟"

"تم یہ سُن کر حیران رہ جاؤ گی، مجھے فیل کرانے!"

"(حیرت سے) کیا کہا آپ نے؟ آپ کو فیل کرانے گئے تھے؟"

"ہاں بھئی ہاں!"

"لیکن یہ تو بڑی عجیب بات سُن رہی ہوں!"

"ہاں ہمارے کالج کے ہیڈ کلرک کو تم سے بھی زیادہ حیرت ہے!"

"آخر ہوا کیا تھا؟"

"چھٹی گذارنے کے بعد، جب میں کالج پہنچا تو ہیڈ کلرک نے اپنے کمرہ میں مجھے بلایا۔ بیچارہ مجھ پر بہت مہربان ہے بوڑھا، نیک اور شریف آدمی ہے، ذہین اور محنتی لڑکوں کی کسی امکانی مدد سے دریغ نہیں کرتا۔"

"آپ تو نسیم بھائی کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے!"

"ہاں ـــــ تو ہیڈ کلرک نے ایک چھوٹی سی تصویر میری طرف بڑھائی، اور پوچھا۔

"اس آدمی کو آپ پہچانتے ہیں؟"

بھلا میں نسیم بھائی کو نہ پہچانوں، میں نے جواب دیا۔

"ہاں بہت اچھی طرح!"

وہ مسکرایا اور گویا ہوا۔

"دوست ہیں آپ کے؟"

میں نے کہا۔

"نہیں بھائی!"

وہ اپنی کرسی سے اُچھل پڑا، اس نے کہا۔

"بھائی؟ ـــــ واقعی بھائی ہیں!"

میں نے پوچھا۔

"یہ سن کر آپ اتنے مضطرب کیوں ہو گئے؟ کہہ تو رہا ہوں بھائی ہیں میرے!"

اس کے حواس بحال ہو چکے تھے، اس نے سوال کیا۔

"سگے یا رشتہ کے؟"

میں نے بتایا۔

"سگا تو میرا کوئی بھائی نہیں ہے، رشتہ کے ہیں!"

پھر اس نے سوال کیا،

"آپ دونوں کے تعلقات کیسے ہیں؟"

میں نے صفائی سے کہہ دیا۔
" نہ اچھے نہ بُرے!"
وہ ہنسنے لگا،
"مسٹر فرخ آپ کچھ چھپا رہے ہیں!"
میں ان پیہم سوالات سے چڑ گیا تھا۔ میں نے کہا۔
" نہ جانے یہ سوالات کیوں کر رہے ہیں آپ؟ سمجھ میں نہیں آتا ہے، تصویر آپ کے پاس کس طرح آگئی، بہر حال میں یقین دلاتا ہوں کہ میں نے کوئی بات نہیں چھپائی، آپ میرے محسن ہیں آپ سے تو ہر بات میں مشورہ لیتا ہوں، چھپاؤں گا کیا!"
لیکن اسے اب بھی یقین نہیں آیا، اس نے کہا۔
" اچھا مسٹر فرخ یہ بتایئے آپ میں اور اس شخص میں رقابت تو نہیں ہے؟"
میرا چہرہ سرخ ہو گیا، میں نے کہا۔
" آپ کی بزرگی کا احترام مدنظر نہ ہوتا تو بڑا سخت جواب دیتا۔"
وہ ہنسنے لگا۔
" آپ کا غصہ میرے شبہ کی تصدیق کر رہا ہے —— کہیں ایسا تو نہیں ہے آپ دونوں ایک ہی جگہ شادی کے امیدوار ہیں!"
اب واقعی مجھے غصہ آگیا، میں نے درشت الفاظ میں کہا۔
" میں اس طرح کی باتیں نہیں سننا چاہتا!"
پھر میں نے پوچھا۔
" آپ میری حالت نہیں دیکھتے؟ آپ کو میری حالت نہیں معلوم؟ کیا آپ نہیں جانتے، میرا باپ مر چکا ہے؟ میں غریب اور مفلس ہوں؟ مجھ پر بیوہ ماں کا بوجھ ہے؟ مجھے اپنے مستقبل کی فکر ہے؟"
اس نے گردن ہلاتے ہوئے اقرار کیا۔
" ہاں سب کچھ جانتا ہوں، بہت اچھی طرح!"
میں نے پوچھا۔

"پھر آپ ہی غور کیجئے میں شادی کے چکر میں پھنس سکتا ہوں؟ شادی کا خیال بھی دل میں لا سکتا ہوں؟ مجھ جیسے آدمی کو شادی کرنی چاہیئے؟ کسی کا رقیب بننا چاہیئے؟ ——— ایک مرتبہ پھر نہایت ادب سے میں دریافت کرنا چاہتا ہوں، ان سوالات سے آپ کا مقصد کیا ہے؟"

"ہیڈ کلرک نے جو کچھ کہا، اُسے سُن کر میں دنگ رہ گیا؟"

"کیا کہا، غزالہ نے پوچھا۔

" اس نے کہا فرخ نے بتایا " یہ شخص میرے پاس آیا تھا، اس نے دس دس روپے کے دس نوٹ میری میز پر بکھیر دیئے اور کہا۔

" فرخ کے بارے میں کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں، وہ پاس ہو گیا یا فیل؟"

یہ سوال سُن کر میں اس کا منہ تکنے لگا، میں نے کچھ تامّل کے بعد جواب دیا۔

"مسٹر فرخ بڑے اچھے نمبروں سے کامیاب ہوتے ہیں!"

یہ سُن کر اس کا چہرہ زرد ہو گیا جیسے یہ خبر سُن کر اُسے روحانی تکلیف ہوئی اب اس نے صدری میں ہاتھ ڈالا، اور سو سو کے پانچ نوٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

" ایک تکلیف دینا چاہتا ہوں!"

میں نے نوٹ اُسے واپس کرتے ہوئے کہا۔

"میں اگر کوئی خدمت کر سکوں گا تو مجھے خوشی ہوگی، فرمایئے!"

وہ کہنے لگا۔

" فرخ کے نمبر کم کر دیجئے، اسے فیل کر دیجئے، اتنے نمبروں سے فیل کیجئے کہ اُسے ترقی بھی نہ مل سکے، ابھی رزلٹ آؤٹ نہیں ہوا ہے، آپ سب کچھ کر سکتے ہیں!"

یہ باتیں سُن کر مجھے غصہ آ گیا، میں نے اسے کھڑے کھڑے اپنے کمرہ سے نکال دیا۔ شام کو کالج سے اُٹھا تو میرے ایک دوست ہیں مسٹر تیمور ان کے ہاں دعوت ولیمہ تھی۔ وہاں چلا گیا۔ تقریباً گیارہ ساڑھے گیارہ بجے رات کو واپسی ہوئی، راستہ میں بازارِ حسن پڑتا ہے، میں راستہ کترا کر جا رہا تھا کہ ایک بالاخانہ سے میں نے اسی شخص کو اُترتے ہوئے دیکھا، بے طرح پیئے ہوئے تھے، پاؤں رکھتا کہیں تھا پڑتے کہیں تھے ایک دلال اس کے ساتھ تھا، وہ اُسے دوسرے بالاخانہ

بڑھ گیا، دروازہ پر پان والے کی دوکان تھی، وہاں سے اُس نے سگریٹ خریدا، میں ٹھٹک کر ایک گوشہ میں کھڑا ہو گیا تھا کہ یہ کمبخت جالے۔ تو آگے بڑھوں ایسا نہ ہو، ہم دونوں کی مڈبھیڑ ہو جائے، اور وہ نعرہ لگائے۔ ؎

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

جب وہ اوپر چڑھ گیا تو میں آگے بڑھا، میرے پاؤں کے پاس یہ تصویر پڑی تھی۔ نہ جانے جی میں کیا آئی کہ میں نے اُسے اُٹھا لیا، دیکھتا ہوں تو انہی حضرت کی ہے میں نے غور کیا یہ تمہیں فیل کرانے کی کوشش کیوں کر رہا تھا ذہن میں یہی خیال آیا، ہو نہ ہو زر، زن، زمین کا کوئی جھگڑا ہو گا۔ زمین تمہارے پاس ہے نہیں، زر سے تمہاری جیب خالی ہے، بس تیسری ہی چیز باقی رہ جاتی ہے، لیکن تم کہتے ہو وہ تمہارا بھائی ہوتا ہے!"

پھر وہ ٹھنڈی سانس لے کر گویا ہوئے۔

"بڑا خراب زمانہ آگیا ہے، اس زمانہ کے عزیز اور رشتہ دار دشمنوں سے بڑھ کر دشمن ثابت ہوتے ہیں، خدا بچائے ان سے، لیکن صاحبزادے ہوشیار رہنا، آدمی خطرناک معلوم ہوتا ہے۔"

(۱۷)

غ... ہ بڑے غور اور توجہ سے فرخ کی باتیں سنتی رہی، پھر اس نے فکرمند لہجہ میں کہا۔

" ان باتوں کا مدعا کیا ہے آخر ——— ؟ "

فرخ نے جواب دیا۔

" یہی بات تو لاینحل معمہ بنی ہوئی ہے !"

دونوں پھر خاموش ہو گئے، فرخ نے ذرا دیر بعد کہا۔

" اس سینیچر کو میرا ارادہ آنے کا نہیں تھا، بار بار کے آنے سے طبیعت ہٹتی ہے، سوچا تھا لیس ہر پندرھواڑے فیروز آباد جایا کروں گا، لیکن یہ ایسا دفعہ پیش آیا کہ میں نے سوچا، چچا جان کو صورتِ احوال سے مطلع کر دوں "

غزالہ نے تائید کی۔

" ضرور کیجئے "

فرخ بے بسی کے ساتھ بولا۔

" لیکن اماں جو منع کرتی ہیں "

غزالہ کو بڑا اچنبھا ہوا۔

" کیوں منع کرتی ہیں !"

فرخ نے بتایا۔

"وہ کہتی ہیں صبر کرو، خدا پر بھروسہ رکھو، اپنے کام میں لگے رہو، نسیم کو یہ جتانے کی بھی ضرورت نہیں کہ ہم اس کی کارروائیوں سے واقف ہیں، اور صمد بھیا کے سامنے تو ان باتوں کا اشارتاً بھی ذکر نہ کرنا، خواہ مخواہ انہیں صدمہ ہوگا، اور وہ پریشان ہوں گے، بتاؤ میں کیا کرسکتا ہوں، سوائے خاموش رہنے کے۔"

جیسے سلمٰی سامنے بیٹھی ہو۔ اور غزالہ اس سے اٹھلا اٹھلا کر کہہ رہی ہو۔

"واہ چچی اماں، بھلا یہ بھی کوئی بات ہے؟ ——— مجھے بھی منع کرتی ہیں کہ ایک لفظ منہ سے نہ نکالوں، اور آپ کے منہ پر بھی تالا لگادیا ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا، آخر اننے غیر شریفانہ اور غیر انسانی رویہ کے جواب میں، ہمیں اپنے تئیں فرشتہ ثابت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

دونوں ان باتوں میں ایسے محو ہوئے کہ ایک ایک گھونٹ کے سوا کچھ نہ پی سکے، چائے سامنے رکھی رکھی ٹھنڈی ہوگئی، غزالہ نے کہا۔

"چائے تو پیجئے!"

فرخ نے پیالی پر ہاتھ رکھ کر اٹھالیا، پھر مسکرایا۔

"پہلے تم پیو!"

غزالہ نے چائے کا گھونٹ منہ میں رکھا، اور فوراً کلی کردی۔

"توبہ ——— بالکل یخ!"

پھر وہ ہنسنے لگی۔

"ان باتوں میں ہم ایسے کھو سے گئے کہ یاد ہی نہ رہا، سامنے چائے رکھی ٹھنڈی ہورہی ہے ——— ٹھہریئے ابھی گرم کراتی ہوں۔"

فرخ منع ہی کرتا رہ گیا، اس نے دروازہ پر کھڑے ہوکر ملازمہ کو آواز دی، وہ آئی تو اس سے مسکراتی ہوئی بولی۔

"یہ تم چائے لائی تھیں یا ٹھنڈا شربت ——— جاؤ دوسری بنا کر لاؤ!"

خادمہ نے حیرت سے اپنی آقازادی کو دیکھا، چائے پھر سے کیتلی میں انڈیلی اور واپس چلی گئی، ذرا ہی دیر میں نئی چائے بن کر آگئی، دونوں خاموشی

کے ساتھ بیٹھ کر پینے لگے۔ دونوں خاموش تھے۔ لیکن دونوں کا دماغ کچھ سوچ رہا تھا ـــــ نہ جانے کیا کیا؟

حادثہ

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے

کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور!

(۱)

اب یہ معمول ہو گیا تھا کہ فرخ ہر سینچر کو فیروز آباد آجاتا اور ہر پیر کو واپس چلا جاتا۔ بیچ میں اگر کوئی چھٹی پڑتی تو بھی سائیکل پر بیٹھتا، گویا ہواؤں پر اڑتا ہوا آن کی آن میں فیروز آباد پہنچ جاتا، کچھ عرصہ تک تو اس کے دوست اور ساتھی پابندی کے ساتھ اس کی آمد و رفت کا یہ منظر دیکھتے رہے، لیکن کب تک صبر کرتے، ایک روز اس کے ایک بے تکلف اور مخلص دوست تنویر نے یہ سوال اٹھا ہی دیا، سینچر کا دن تھا اور فرخ حسب معمول فیروز آباد جانے کے لئے پا بہ رکاب تھا، تنویر نے اس کی بیتابی سفر دیکھی اور مسکرانے لگا۔ فرخ نے پوچھا۔

"مسکرا کیوں رہے ہو؟"

تنویر نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"سبحان اللہ، کیا سوال فرمایا ہے آپ نے؟ کیا مسکرانا جرم ہے؟"

فرخ نے جواب دیا۔

" بدتمیزی تو ہے!"

تنویر ہنسنے لگا،

" آپ میرے والد بزرگوار تو نہیں ہیں، جو منہ بند رکھوں، آنکھیں نیچی رکھوں۔ کیا فیروز آباد جا رہے ہو؟"

" ہاں بھئی، شام ہوتی جا رہی ہے کہیں دیر نہ ہو جائے!"

" تو نہ جاؤ، کل چلے جانا!"

" نہیں بھائی یہ نہیں ہو سکتا!"

" جاؤ گے ضرور؟"

" ہاں ضرور!"

" کیوں؟ ــــ کیا ضرورت ہے؟"

" ضرورت تو کچھ بھی نہیں، اور ہے بھی!"

تنویر کو پھر ہنسی آ گئی اس نے کہا۔

" دیکھو میں پھر مجبور ہو کر ہنس پڑا۔ بدتمیز بعد میں کہہ لینا، پہلے یہ بتاؤ، آخر فیروز آباد میں یک بیک اتنی کشش پیدا ہو گئی ہے؟"

فرخ کے چہرہ پر سرخی دوڑ گئی۔

" کشش کا کیا سوال؟ وطن ہے!"

تنویر نے پوچھا۔

" کب سے؟"

" ہمیشہ سے!"

" لیکن یہ بیتابی تو اب پیدا ہوئی ہے!"

" تمہارا تو دماغ چل گیا ہے!"

" لیکن مجھے تو تم چلتے ہوئے نظر آ رہے ہو!"

فرخ مسکرانے لگا۔ پھر اس نے گنگنانا شروع کیا۔

شور پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا ــــ آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا؟

تنویر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"پکڑ لیا چور ـــــ تا بھائی میں تا صح نہیں ہمدرد اور غمخوار ہوں، بتاؤ کس دکھ میں مبتلا ہو میں تمہارا ساتھ دوں گا۔"

"دکھ ہے ـــــ تمہاری بکواس سے سر درد کرنے لگا، چپ ہو جاؤ۔ تو سمجھوں واقعی میرے سچے ہمدرد اور غمخوار ہو!"

تنویر نے کہا۔

"فرخ بھائی اس طرح کام نہیں چلنے کا، میں تم سے اگلوا کر رہوں گا سب کچھ ـــــ آخر یہ راز کیا ہے؟"

"راز کیا ہونا ہے؟ ـــــ تمہاری احمقانہ قیاس آرائیاں ہیں!"

"کیوں ہر سینیچر کو فیروز آباد جاتے ہو؟"

"گھر سے جاتا ہوں!"

"اتنی بیتابی کے ساتھ کیوں جاتے ہو؟"

"بیتابی کیسی ہے ـــــ صرف تمہارا خیال ہے!"

"جی نہیں بندہ پرور، میرا خیال نہیں امر واقعہ ہے، میں دیکھتا ہوں، محسوس کرتا ہوں، جب یہاں سے جاتے ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے، دوزخ سے بھاگ کر جنت کی طرف جا رہے ہو، ہشاش بشاش، ترو تازہ، مسرور خرم جب واپس آتے ہو معلوم ہوتا ہے کسی نے جنت سے کان پکڑ کر جہنم میں پھینک دیا، حواس باختہ، پریشان، مضطر، گم صم ـــــ پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی۔ میرے بھائی ٹالنے کی کوشش نہ کرو، بتا دو!"

فرخ نے سائیکل باہر نکالی، ایک مرتبہ رومال سے اُسے جھاڑا، کتابیں کیرئیر پر رکھیں، پیڈل پر پاؤں رکھ کر اُچکا اور گدی پر بیٹھ گیا، پھر گویا ہوا۔

"اگر بتاؤں گا!"

اور ہنستا ہوا یہ جا وہ جا!

(۲)

آج غزالہ کی سالگرہ تھی!

سالگرہ کی یہ تقریب ہر سال بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی تھی، صمد میاں ویسے بھی فراخ دست اور فراخ دل آدمی تھے، لیکن اس موقع پر تو وہ حاتم دوراں بن جاتے تھے، دوستوں، عزیزوں اور رشتہ داروں کی بڑی پُرلطف اور شاندار دعوت کرتے تھے، ملازموں اور خادماؤں کو منہ مانگا انعام دیتے تھے اور کوئی بیش قیمت زیور غزالہ کو نذر کرتے تھے۔

اس موقع پر غزالہ کی سہیلیاں بھی آتی تھیں، شوخ، طرار، بیباک، ان کے آنے سے گھر میں وہ دھما چوکڑی مچتی تھی کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔

آج بھی اس کی کئی سہیلیاں رابعہ، نصرت، انوری وغیرہ آئی ہوئی تھیں، دل لگی، قہقہے، ٹھٹھے، چہچہے، نغمہ طرازی، نقلیں، ان سب چیزوں نے مل کر فضا پر عجیب سرخوشی اور نشاط کی کیفیت طاری کر دی تھی، غزالہ بھی آج بہت خوش تھی اور اپنی سہیلیوں کے ہنسی مذاق میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی۔

فرخ نے بڑی کوشش کی کہ اس تقریب سعید میں وہ بھی شریک ہو سکے، لیکن دفعتہً وہ تپ و لرزہ میں ایسا مبتلا ہوا کہ دل کی دل ہی میں رہ گئی، نانا اور نانی نے کسی قیمت پر اُسے جانے کی اجازت نہیں دی، حالانکہ خود

اس کا جہاں تک تعلق تھا، اس حالت میں بھی وہ جانے پر تیار تھا، اپنی اس محرومی پر اُسے اتنا دُکھ ہوا کہ بستر پر لیٹے لیٹے وہ رونے لگا، اس نے اپنے دل میں کیسے کیسے پروگرام بنائے تھے لیکن سب دھرے کے دھرے رہ گئے۔

امجد میاں رحمت پور سے تشریف لائے تھے، ان کے ساتھ ان کا ضمیمہ یعنی نسیم بھی تھا۔

غزالہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھی، یکایک انوری نے فرمائش کی۔

"غزالہ آج تمہیں گانا پڑے گا!"

نصرت نے بھی ہاں ہاں ملائی،

"اگر آج بھی تم نے نہ سنایا تو ہم اپنا گانا شروع کر دیں گے یعنی رونا!"

سب ہنسنے لگیں، رابعہ نے کہا۔

"غزالہ سنا دو!"

غزالہ بولی۔

"تم ہی سنا دو، تم نے تو کالج میں انعام بھی حاصل کیا ہے!"

رابعہ نے جواب دیا۔

"اچھا بھئی یوں کرو، ہر شخص باری باری سے سنائے، چاہے ایک ہی شعر کیوں نہ ہو!"

غزالہ نے یہ تجویز مان لی،

"ٹھیک ہے ——— شروع کرو!"

رابعہ نے کہا۔

"واہ بھئی یہ بھی اچھی رہی جو راستہ بتائے، وہی آگے بھی چلے!"

غزالہ نے ایک اور فارمولا پیش کر دیا۔

"اچھا یوں کرو قرعہ ڈالتے ہیں، جس کی باری آجائے وہی سنا دے!"

سر خسرو سے نازِ کجکلاہی چھن بھی جاتا ہے
کلاہِ خسروی سے بوئے سلطانی نہیں جاتی

فیض کے یہ اشعار غزالہ نے کچھ ایسے سوز، اور ایسے تاثر کے عالم میں گائے، کہ سب پر سناٹا چھا گیا، یہ سہیلیاں جو ابھی بیٹھی چہلیں کر رہی تھیں، نقلیں اتار رہی تھیں، ایک دوسرے پر فقرے چست کر رہی تھیں اس طرح گم صم بیٹھی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا انہیں بولنا آتا ہی نہیں۔

یکایک دروازہ پر ایک مسکراتا ہوا چہرہ نمودار ہوا۔
یہ نسیم تھا،
نسیم نے کہا۔

" غزالہ بہت اچھا گاتی ہو، ماشاء اللہ تمہاری سہیلیاں بھی فن کی ماہر ہیں۔
لیکن سچ تو یہ ہے کہ تمہاری بات ہی اور ہے —— عالم میں تم سے لاکھ سہی۔
تم مگر کہاں!"

نسیم کو دیکھ کر غزالہ کی سہیلیاں سمٹ کر بیٹھ گئیں، غزالہ کا ایک رنگ آتا تھا، ایک جاتا تھا، اس نے بڑی مشکل سے غصہ ضبط کیا اور کہا۔

" آپ یہاں کیوں آگئے ؟"
نسیم نے وہیں کھڑے کھڑے دریافت کیا۔
"کیا پردہ ہے ؟"

اور پھر وہ ہنسنے لگا، غزالہ غصہ سے اس طرح کانپ رہی تھی ۔ جیسے تیز ہوا میں گلاب کی پتی ہلتی ہے، اس نے کہا۔

" ہاں، پردہ نشیں یہاں ہیں!"
نسیم کے پاس جواب تیار تھا اُس نے کہا۔

لیکن میں نے تو ان سب کو بے پردہ آتے دیکھا تھا، اگر کسی کے پاس برقع یا نقاب ہو تو دکھاؤ، میں ابھی چلا جاؤں گا!"

پھر وہ ہنسنے لگا۔
غزالہ کو نسیم کی باتیں اور اس کے بے موقع قہقہے زہر لگ رہے تھے

سب نے اتفاق کر لیا، قرعہ ڈال دیا گیا، سب سے پہلا نام رابعہ کا نکلا، پھر نصرت کا، پھر انوری کا، پھر غزالہ کا!

رابعہ گنگنانے لگی، ؎

اک تری دید چھین گئی مجھ سے   ورنہ دنیا میں کیا نہیں باقی!

خوب خوب داد دی گئی، پھر نصرت کی باری آئی، اس نے بھی لہک لہک کر گانا شروع کر دیا۔ ؎

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

نصرت نے بھی خراج تحسین حاصل کیا۔

پھر انوری کا نمبر آیا، پہلے تو وہ ذرا کسمسائی لیکن ایک پیش نہ گئی۔ اسے بھی گانا پڑا۔ ؎

بھلائے سے بھی قصۂ ربط ماضی   بھلایا نہ جائے گا، ہم سے نہ تم سے

اس شعر پر اس طرح داد ملی، جیسے کوئی مشاعرہ ہو رہا ہو۔

اب غزالہ سے تقاضہ شروع ہوا، نصرت نے کہا۔

اب غزالہ سے تقاضہ شروع ہوا، نصرت نے کہا۔

غزالہ نے ٹوکا۔

اے واہ، میں کیوں استاد ہوتی —— تم خود ——"

سب کو اس "تم خود" پر ہنسی آگئی، کمرہ میں نقرئی قہقہے، گونجنے لگے، آخر غزالہ نے مجبور ہو کر لَے کے ساتھ گانا شروع کیا۔

کئی بار اس کا دامن بھر دیا حسنِ دو عالم سے
مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی

کئی بار اس کی خاطر ذرہ ذرہ کا جگر چیرا
مگر یہ چشم حیراں، جس کی حیرانی نہیں جاتی

مری چشم تماشہ کو بصیرت مل گئی جب سے
بہت جانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

اس وقت وہ اتنی شرمندہ تھی کہ جی چاہتا تھا زمین پھٹ جائے، اور وہ سما جائے، اس نے تیکھی نظروں سے نسیم کو دیکھا اور بولی۔

"چلے جایئے یہاں سے!"

نسیم نے ہنستے ہوئے کہا،

"دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے!"

اور پھر ہنستا ہوا چلا گیا۔

تھوڑی دیر تک محفل پر سناٹا طاری رہا۔

نسیم کی یہ حرکت سب ہی کو ناگوار گذری تھی، خاص طور پر نصرت کو اس نے کہا۔

"غزالہ ایسا تو تمہارے گھر میں آج تک نہیں ہوا تھا، یہ کون بدتمیز اور بیہودہ شخص تھا"

غزالہ نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"ایک بدتمیز اور بیہودہ شخص!"

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، نصرت کا دل پگھل گیا۔ اُس نے کہا۔

"ارے تم تو رونے لگیں ـــــ میں نے تو یُوں ہی ایک بات کہہ دی تھی، گھر کی لڑکی اپنی سہیلیوں کے ساتھ بیٹھی ہو، لڑکیاں جب آپس میں بیٹھتی ہیں تو سب طرح کی باتیں کرتی ہیں، مجھے اگر یہ معلوم ہوتا کہ یہ حضرت دروازے میں کھڑے جھانک رہے ہیں تو ہرگز نہ گاتی شریف لوگوں کو ایسا تو نہیں کرنا چاہیئے؟

غزالہ نے جل کر کہا۔

"کمینہ شخص کو شرافت سے کیا سروکار!"

اندری اب تک خاموش تھی، اب وہ بھی بولی۔

"میں تو یہ سمجھی شاید یہ حضرت ہماری غزالہ کے کچھ ہونے والے ہیں اس لئے چپ رہی، ورنہ ایسی سناتی کہ آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتا۔

رابعہ نے پوچھا۔

"کیوں غزالہ سچ کہنا، واقعی یہ صاحب تمہارے کچھ ہونے والے ہیں ؟"
غزالہ نے جھلا کر جواب دیا۔
" تمہیں میری توہین کرنے کا کوئی حق نہیں ہے!"

یہ الفاظ غزالہ نے کچھ ایسے تیور سے کہے کہ رابعہ نے خاموش ہوجانا ہی مناسب سمجھا!

یہ اتنا عجیب اور خلاف توقع واقعہ پیش آیا تھا کہ انوری، نصرت، رابعہ سب ہی حیران و ششدر ہو کر رہ گئیں، ایسی بدمزگی اور تلخی پیدا ہوئی کہ کوشش کے باوجود، پھر ہنسی دل لگی کی بات کسی کے منہ سے نہ نکلی، اور غزالہ تو ایسی نادم اور شرمندہ ہو رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا گھڑوں پانی پڑ گیا ہے بیچاری پر۔

اس سے پہلے ایسے موقعوں پر غزالہ اپنی سہیلیوں کو اصرار کر کر کے رات گئے تک روکتی تھی، لیکن آج جب انوری نے جانے کا نام لیا تو وہ رسمی طور پر بھی روکنے کی جرأت نہ کر سکی، یہ تک نہ کہہ سکی کہ کھانا کھا کر جانا، وہ تو اتفاق سے سلمیٰ ادھر آنکلی، اس نے جو انوری وغیرہ کو جاتے دیکھا، تو جلدی سے دسترخوان بچھوا دیا۔ اور سب سے پہلے انہیں کھانا کھلا لیا، تب جانے کی اجازت دی!

(۳)

سلمیٰ بڑی ہوشیار اور دُور اندیش عورت تھی، اس نے رنگِ محفل دیکھ کر اور غزالہ کو چپ چاپ دیکھ کر محسوس کر لیا تھا، ضرور دال میں کچھ کالا ہے، لیکن فضا پر اتنی اداسی چھائی ہوئی تھی کہ اس نے کریدنا مناسب نہ سمجھا لیکن جب یہ سہیلیاں چلی گئیں تو اس نے کہا۔

"بیٹی غزالہ میں تمہیں کچھ اداس اور غمزدہ دیکھ رہی ہوں، یہ بدشگونی ہے، آج کا دن خوشی کا دن ہے، خوب مسکراؤ، ہنسو، بولو!"

غزالہ نے کوئی جواب ہی نہیں دیا، سلمیٰ نے کہا۔

"غضب خدا کا تم نے اپنی سہیلیوں کو بھی چلا جانے دیا ـــ!"

غزالہ نے کہا۔

"کاش وہ نہ آئی ہوتیں!"

سلمیٰ نے دور کی ایک نظر غزالہ پر ڈالی۔

"ضرور کوئی بات ہوئی ہے، مجھے نہ بتاؤ گی؟"

غزالہ نے روہانسی آواز میں کہا۔

"کیا بتاؤں، اور کہاں تک بتاؤں!"

"یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، سلمیٰ نے اُسے گلے لگا لیا۔ اور پیار بھرے انداز میں اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔

"بتاؤ تو آخر ہوا کیا تھا؟ میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے، تمہارے آنسو میں نہیں دیکھ سکتی، ویسے ہی میرے نصیب میں خوشی کا کہیں گذر نہیں، آج تمہاری سالگرہ کی وجہ سے ایک لہر سی اٹھی تھی مسرت کی، لیکن تمہارا یہ رنگ دیکھ کر تو میں روئے دے رہی ہوں!"

آخر غزالہ نے آج کا سارا ماجرا بھرائی ہوئی آواز میں اُسے سنا دیا،

"بتایئے چچی اماں یہ باتیں شرمناک ہیں یا نہیں؟"

"ہاں بیٹی ضرور ہیں۔"

"نصرت، رابعہ، انوری، کیا تھوک رہی ہوں گی میری اوقات پر؟ کیا خیال لے کر گئی ہوں گی یہاں سے؟ کیا سوچا ہوگا انہوں نے اس گھر کے بارے میں، یہاں کی تہذیب، تمدن اور معاشرت کے بارے میں اب تک ان سب سے میں سُرخ رو اور سر بلند ہو کر ملتی تھی، ان کے دل میں میرا وقار تھا، عزت تھی، پر مجھے نہ جانے کیا سمجھتی تھیں، شاید بہت اونچا بہت بلند!"

پھر وہ خاموش ہو گئی، ذرا دیر کے بعد وہ گویا ہوئی۔

"اب میں ان سے آنکھیں نہیں چار کر سکتی، اب میں ان کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہوں، اب وہ ذلیل سمجھتی ہوں گی، میں ان کی نظر میں خوار ہو گئی، وہ سمجھتی ہوں گی، یہ لڑکی ہمارے سامنے بڑا لئے دیئے رہتی ہے اپنے آپ کو لیکن گھر میں نوجوان لڑکوں کے ساتھ بے تکلفی اور بے غیرتی کی زندگی بسر کرتی ہے، وہ مجھے آوارہ اور آبرو باختہ خیال کرتی ہوں گی، وہ دل ہی دل میں یہ تاثر لے کر گئی ہوں گی کہ واقعی دولت سے آدمی شریف نہیں ہو جاتا، غزالہ کے گھر میں دھن برس رہا ہے، اس کا باپ لاکھوں روپے کما تا ہے، لیکن یہ رہی وہی دو پیسے کی چھوکری، وہ یہ بھی خیال کرتی ہوں گی کہ یہ خاندان نیچ ہے، بھلا کہیں شریف خاندان کے لڑکے اس طرح کی باتیں کر سکتے ہیں۔"

پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، اس نے کہا۔

میری بچی اماں، کہیں سے مجھے زہر لادیجئے، میں مر جانا چاہتی ہوں، آج کی ذلت کے بعد، اب میں کسی کو منہ دکھانا نہیں چاہتی۔!"

سلمیٰ نے ایک مرتبہ پھر غزالہ کو گلے سے لگالیا۔

"میری بچی، تو رو رو کر اپنا جی کیوں ہلکان کر رہی ہے۔ دولت سے کچھ نہیں ہوتا، خاندان سے بھی کچھ نہیں ہوتا، ہر انسان اپنی ذات سے اونچا یا نیچا ہوتا ہے، تیرے اندر خدا نے جو شان رکھی ہے اُسے دیکھ، کون تجھے ذلیل سمجھ سکتا ہے۔"

غزالہ جواب میں کچھ کہنے والی تھی کہ کان میں آواز آئی۔

"ارے بھئی ہماری غزالہ بیٹی تو یہاں بیٹھی ہے، سلمیٰ بیگم کے پاس آؤ بھئی صمد میاں، نسیم تو دروازہ میں کیوں کھڑا ہے آتا کیوں نہیں!"

یہ امجد میاں تھے!

ان کا حکم پاکر پہلے صمد، پھر نسیم کمرہ میں چلے آئے۔

امجد میاں نے ایک خوبصورت گھڑی، جس کی قیمت زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو روپیہ ہوگی، اپنے مرتعش ہاتھوں سے غزالہ کی کلائی پر باندھ دی!

پھر صمد سے کہا۔

"آگے بڑھو ——— لاؤ کیا تحفہ دیتے ہو ہماری بیٹی کو؟"

صمد نے ایک نہایت قیمتی اور خوبصورت طلائی ہار اپنے ہاتھ سے غزالہ کے گلے میں ڈال دیا۔

ایک مرتبہ پھر امجد میاں کی آواز گونجی،

"نسیم ———"

نسیم سامنے آکر کھڑا ہوگیا،

"جی"

امجد نے ڈانٹا۔

"کیا جی جی کر رہا ہے، عورتوں کی طرح شرمایا اور لجایا کیوں جا رہا ہے!"

گھور کر ایک مرتبہ نسیم کو دیکھا، پھر فرمایا۔

"اب کھڑا میرا منہ ہی دیکھتا رہے گا؟ کہاں گیا وہ تیرا تحفہ جسے تو مہینہ بھر

سے لیے لئے گھوم رہا تھا۔

نسیم نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک انگوٹھی نکالی، انگوٹھی کا نگ ہیرے کا تھا، اس کی جوت سے آنکھیں چکا چوند ہونے لگیں، پانچ سو روپے سے کم کا ہرگز نہ تھا۔

امجد میاں نے صمد سے کہا۔

"دیکھنا بھئی کیا اٹھا لایا ہے یہ لڑکا؟"

صمد نے انگوٹھی دیکھی، اور رائے دی۔

"بڑی عمدہ چیز ہے!"

امجد میاں نے فرمایا۔

ہاں بھئی عمدہ چیز کیوں نہ ہو گی؟ اس کی تلاش میں نسیم میاں نے بقول شخصے کنویں میں بانس ڈال دیئے، فیض پور تشریف لے گئے تو جوہری کی دوکان نہیں چھوڑی، بڑی مشکل سے ایک دوکان پر یہ گوہر یکتا ہاتھ آیا!"

پھر امجد میاں نے نسیم پر ایک تیز نگاہ ڈالی اور اسے چمکارتے ہوئے کہا۔

"پہن لو بیٹے، اپنے ہی لئے لائے ہو!"

یہ الفاظ امجد میاں نے کچھ ایسی بے ساختگی سے کہے کہ نسیم جھینپ گیا۔ صمد اور سلمیٰ کو ہنسی آگئی، ذرا جھجکتا ہوا نسیم آگے بڑھا، اس نے چاہا کہ اپنے ہاتھ سے انگوٹھی غزالہ کی انگلی میں پہنا دے۔ لیکن اُس نے اپنا دست نازک سمیٹ لیا، سلمیٰ نے آہستہ سے چٹکی لی، مطلب یہ کہ پہن لو، کوئی ایسی بات نہ کرو، جس سے تمہاری ناگواری ظاہر ہو، لیکن غزالہ کا سمٹا ہوا ہاتھ نہ پھیلنا تھا نہ پھیلا۔ نسیم بدستور انگشتری لئے کھڑا تھا، ایک مرتبہ پھر امجد میاں نے ڈانٹ کر اس میں حوصلہ پیدا کیا۔

"ابے الو کے پٹھے اونگھ کیوں رہا ہے، کھڑا ہوا؟"

نسیم پھر آگے بڑھا، سلمیٰ نے پھر ٹھوکا دیا کہ خبردار کوئی ایسی بات نہ کر بیٹھنا، جس سے رنگ میں بھنگ ہو جائے، لیکن غزالہ بھی آخر غزالہ تھی، اس کے سمٹے ہاتھ نے کسی طرح اپنی جگہ سے جنبش نہ کی،

امجد ایک جہاندیدہ اور گرگ باراں دیدہ تھے، سمجھ گئے، یہ بہت پُرفن یوں رام

نہ ہوگا۔ انہوں نے نسیم کے ہاتھ سے انگشتری لے لی۔
"چل ہٹ ——— ہم اپنی بیٹی کو پہنائیں گے!"
پھر وہ اس کے پاس آکر اکڑوں بیٹھ گئے، بڑی آسانی سے اس کا ہاتھ کھینچا اور وہ انگشتری پہنا دی، غزالہ مزاحمت نہ کر سکی!
سال گرہ کی مجلس برخاست ہوگئی!

---

(۴)

دوسرے سالوں کے برعکس اس مرتبہ کی تقریب سالگرہ بڑی پھیکی اور بدمزہ رہی۔ نسیم کی جرأتِ رندانہ نے سارا کھیل بگاڑ دیا، غزالہ پر ایسی اوس پڑی کہ پھر کئی روز تک وہ کھوئی کھوئی سی بجھی بجھی سی رہی، سلمیٰ نے اُسے بہلانے پھسلانے اور ہنسانے کی بہتیری کوششیں کر ڈالیں، لیکن وہ ایک پژمردہ پھول بن چکی تھی —— نہ رعنائی نہ اُمنگ!

سالگرہ کے بعد بھی دو تین روز تک امجد میاں کی شفقت کا جہاں تک تعلق تھا وہ موسلا دھار بارش کی طرح جاری تھی، وہ اب تک نہیں سمجھ سکے تھے کہ غزالہ کا رویّہ یک بیک اتنا پُراسرار کیوں بن گیا ہے؟ کئی بار چاہا، اس گتھی کو سلجھائیں، لیکن چور کی داڑھی میں تنکا، ہمت نہ پڑی، دل میں بیٹھا ہوا کوئی زور زور سے پکارے کہہ رہا تھا"

"ہو نہ ہو حضرت نسیم نے کوئی بے ڈھنگی بات کی ہے!"

لیکن اس فضا میں نہ غزالہ سے پوچھ گچھ مناسب تھی، نہ نسیم سے دریافت احوال کا امکان تھا۔

آخر امجد میاں کا جی اُکتایا، اور انہوں نے رختِ سفر باندھا۔ بس پر بیٹھنے کے بعد، وہ طوفان جو امجد میاں کے سینہ میں انگڑائیاں لے رہا تھا پوری آب و تاب کے ساتھ نمودار ہوا، انہوں نے تیکھی نظروں سے بیٹے کو دیکھا

اور سوال کیا۔

"کیا غزالہ کو پھر خفا کر دیا تم نے؟"

نسیم نے بے پروائی سے باپ کو دیکھا، پھر پوچھا۔

"کچھ کہہ رہی تھی ——"

امجد میاں کو اس سوال پر تاؤ آگیا، انہوں نے کہا۔

"اس نے تو کچھ نہیں کہا، لیکن اس کے اداس چہرے اور تمہارے اس بانکے سوال سے مجھے یقین ہو گیا کوئی بات ضرور ہوئی ہے!"

نسیم نے سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہوئی ہوگی!"

بہت جھلا کر امجد میاں بولے۔

"کچھ بتاؤ بھی تو خدا کے بندے —— آخر کیوں ناک کٹانے پر تلے ہو؟ کیوں اپنے ہاتھ سے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہے ہو؟ کیوں اپنے شاندار اور روشن مستقبل کا گلا گھونٹ رہے ہو؟"

نسیم زیادہ نہ سُن سکا۔

"ان نازک دماغیوں کے ساتھ میرا نباہ نہیں ہو سکتا! وہ کوئی ملکۂ معظمہ ہیں کہ اُن سے دبوں، اور جھکوں؟"

امجد میاں کو یقین ہو گیا، ضرور اس ننگ خاندان نے کوئی ایسی حرکت کی ہے، جس سے غزالہ کا رنگِ مزاج بدلا ہے، کہنے لگے۔

"لیکن بتاؤ تو ہوا کیا ہوا، تاکہ میں کچھ لیپ پوت کر سکوں، تم تو اپنے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہو، میں کب تک بگڑی بناتا رہوں گا؟"

نسیم بھڑک اُٹھا۔

مجھے لیپ پوت، خوشامد و آمد اور غرض و التجا کی ضرورت نہیں۔ عورت سے دبنا، عورت کے سامنے جھکنا میں نے نہیں سیکھا ہے، مرد اس لئے ہیں کہ عورت پر حکومت کریں، عورت کو اگر زیادہ سر چڑھایا جائے، تو وہ بس میں نہ رہے گی، مرد اور عورت کا وہی تعلق ہے، جو حاکم اور محکوم کا ہونا ہے، شوہر

کو سجدہ بھی جائز ہے۔ بیوی ایک وفادار لونڈی سے زیادہ کیا ہے؟"
ہر ہر جملہ پر امجد میاں اس طرح سر ہلا رہے تھے، جیسے مرشد برحق کے سامنے کوئی مرید باصفا ادب و عقیدت سے گردن ہلا ہلا کر فرمودات سُنتا ہے، پھر انہوں نے ہاتھ جوڑ کر بڑے ادب سے عرض کیا۔
"قبلہ وکعبہ یہ بندۂ درگاہ بھی کچھ عرض کیا چاہتا ہے!"
نسیم حیرت سے باپ کو دیکھنے لگا، پھر گویا ہوا۔
"آپ نے تو ابھی سے ناز برداریوں اور خاطرداریوں کا سلسلہ شروع کر دیا ہے، شادی کے بعد تو مجھے، آپ کو، اور اماں کو جوتی تلے رکھیں گی!"
امجد میاں نے دست بستہ عرض کیا۔
"حق ہے برحق ہے ——— مستند ہے تیرا فرمایا ہُوا ——— لیکن غلام کی عرض صرف ایک ہے اور اس سے پہلے بھی وہ بارہا عرض کر چکا ہے کہ جب تک چڑیا دام میں نہیں آجاتی ذرا آدمی بنے رہیئے، اس کے اسیر دام ہونے کے بعد شیر، بھیڑیا، لنگور، لومڑی، چنگیز، ہلاکو، جو چاہیئے گا بن جایئے گا۔ پھر اگر یہ غلام قدیم آپ کے کسی معاملہ میں دخل دے تو بے شک اس کے منہ پر تھوک دیجئے گا۔ اس کی داڑھی نوچ لیجئے گا اس کی چندیا پر ایک بال نہ چھوڑیئے گا۔"
نسیم نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔
"لیکن میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا، بھلا اس بددماغی کی کوئی حد ہے، اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی ہوئی تھیں، سب نے باری باری سے گایا، آخر میں خود آپ کی شہزادی صاحبہ نے نغمہ طرازی شروع کی، میں کواڑ سے لگا سُن رہا تھا، جھوٹ کیوں بولوں یوں تو سب ہی نے اچھا گایا، لیکن غزالہ کی بات ہی اور تھی، میں نے دروازہ کے باہر سر نکالا اور تعریف کر دی کہ واہ بھئی تم تو چھپی رستم نکلیں۔ میرا یہ کہنا تھا کہ جس میں کسی نے چنگاری ڈال دی، بھڑک کر کہنے لگیں، پردہ نشینوں میں آپ کا کیا کام؟ میں نے کہا پردہ صرف مجھی سے کرتی ہیں؟ آتی تو بے پردہ ہیں، یہ سُن کر شعلہ بن گئیں، حکم دیا چلے جایئے آپ یہاں سے جی تو چاہا ایسا چانٹا دوں اُس کے کہ منہ پھر جائے، لیکن مہمانوں کی موجودگی میں ضبط سے کام لیا۔ اور

جھوٹ موٹ ہنستا ہوا چلا آیا (دانت پیس کر) اس وقت سے اب تک میرا غصہ اترا نہیں ہے!"

"ان نازک دماغیوں کے ساتھ میرا نباہ نہیں ہو سکتا ——— وہ کوئی

"یہ شک بے شک، غصہ کی بات ہی ہے سہیلیوں کے مجمع میں ایک اور سہیلی کے مجمع میں ایک اور سہیلی کے پہنچ جانے پر غزالہ کی برہمی بالکل بے معنی تھی!"

نسیم نے اس طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"پھر آپ نے غضب یہ کیا کہ صمد چچا کی موجودگی میں مجھے حکم دیا کہ اس چڑیل کو انگوٹھی پہناؤں، میں نے تو پھر گذشتہ را صلوٰۃ، آئندہ را احتیاط کے مصداق تعمیل کرنا چاہی مگر اسے دیکھا آپ نے؟"

"ہاں دیکھا تھا!"

"کس طرح ہاتھ سمیٹے بیٹھی تھی، جیسے میرے ہاتھ میں انگوٹھی نہیں کھنکھجورا ہے!"

میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کوئی بات ہے ضرور!"

"جی تو چاہا انگوٹھی منہ پر جھینک ماروں، لیکن صمد چچا کی وجہ سے خاموش ہو جانا پڑا!"

"شاباش، ——— سعادت مندی اسی کا نام ہے!"

"لیکن میں نے بھی وہ بدلہ لیا ہے کہ زندگی بھر یاد کریں گی؟"

"جی اور کیا نہیں بھی؟"

"وہی ترش کلامی؟"

"جی نہیں، میں نے اس سے بات بھی نہیں کی، نہ اب کبھی منہ لگاؤں گا۔"

"بڑا اچھا کرو گے، لیکن معلوم تو ہو کیا کر آئے ہو بھائی؟"

"نہیں بتانے کا ——— صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ روئے گی اور روتے نہ بن پڑے گا، میں دور سے تماشہ دیکھوں گا، اور لطف لوں گا، بلکہ یہاں بیٹھا دیکھ رہا ہوں، اور لطف لے رہا ہوں!"

یہ کہتے ہوئے نسیم کے چہرہ پر ایسی رونق آگئی، جیسی چوہے کا شکار

کرتے ہوئے بلی کے چہرے پر نظر آتی ہے، امجد میاں کا قلب ضعیف و نحیف کسی نامعلوم خطرہ سے لرز گیا، انہوں نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"خدا خیر کرے!"

پھر کھڑکی سے منہ باہر نکال کر بھاگتے دوڑتے مناظر دیکھنے لگے!

---

(۵)

سالگرہ والا سنیچر ناغہ کر کے دوسرے سنیچر کو فرخ فیروز آباد پہنچ گیا اس مرتبہ وہ پہلے کی طرح چونچال نہیں تھا، چہرہ زرد، آنکھیں حلقوں میں دھنسی ہوئی، کمزوری نمایاں، چونکہ اتنا لمبا سفر سائیکل پر کیا تھا، اس لئے تکان نے اور زیادہ خستہ و مضمحل کر دیا تھا، اس کا یہ حال دیکھ کر سلمٰی اور غزالہ دونوں گھبرا گئیں، غزالہ نے بیتاب ہو کر پوچھا۔

"فرخ بھائی کیا آپ کچھ بیمار ہیں ——؟"

اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ہوں تو نہیں، تھا ضرور!"

سلمٰی بے قرار ہو گئی۔

"میرے لال تجھے کیا ہو گیا تھا؟"

فرخ نے ماں کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"بخار آ گیا تھا، —— ملیریا، کئی دن تک بستر سے اٹھ نہ سکا، بہرحال اب بالکل اچھا ہوں!"

غزالہ نے پوچھا۔

آپ نے ہمیں کیوں نہ اطلاع دی؟"

فرخ نے جواب دیا۔

"واقعی بڑی غلطی ہوگئی، فیروز آباد میں آپ جیسا طبیب حاذق موجود ہو، اور اسے اطلاع نہ دی جائے!"

غزالہ ہنسنے لگی۔

"آپ تو ہر بات کا مذاق اڑا دیتے ہیں، اطلاع مل جاتی تو ہم خود وہاں پہنچ کر آپ کو لے آتے، یہاں بہر حال آپ کو آرام زیادہ ملتا، علاج بھی اچھا ہوتا —— !"

فرخ نے کہا۔

"ہاں بھئی غلطی ہوگئی، آئندہ بیمار پڑتے وقت اس نصیحت کا خیال رکھوں گا!"

سلمٰی نے ڈانٹا،

"اے چل ہٹ —— خدا نہ کرے۔

غزالہ نے چچی سے فریاد کی۔

"سُن لیجیے ان کی باتیں!"

سلمٰی نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"ذرا چائے کو کہہ دوں، ایک پیالی پی لے گا تو ماندگی دُور ہو جائے گی!"

غزالہ نے لقمہ دیا۔

"چچی اماں، چائے نہیں کافی —— !"

فرخ نے جیسے دل کی بات سُن لی،

"ہاں اماں جی —— کافی!"

سلمٰی چلی گئی، اس کے جانے کے بعد غزالہ نے فرخ سے کہا۔

"میں آپ سے بہت خفا تھی، لیکن معاف کر دیا!"

"اس معافی کا بہت بہت شکریہ، لیکن یہ بھی تو معلوم ہونا چاہیے، خفگی کس بات پر تھی؟"

"آپ ہماری سالگرہ پر کیوں نہیں آئے؟"

"میں بخار کی حالت میں بھی آ رہا تھا، لیکن نانا اور نانی نے کسی طرح

سنے ہی نہیں دیا!"

بہر وہ تو آپ نے اچھا کیا کہ نہیں آئے۔ ایسی حالت میں سفر مناسب بھی نہیں تھا، دیکھئے اب اچھے ہو کر آئے ہیں، لیکن چہرہ کتنا اُتر گیا ہے، یہی سب باتیں سوچ کر تو میں نے معاف کیا ہے!"

"بھئی بہت بہت شکریہ ــــ یقین مانو اس تقریب میں شریک نہ ہو سکنے کا مجھے بہت رنج ہے!"

"مجھے بھی بہت تھا ــــ آخر وقت تک آپ کا انتظار کرتی رہی، پھر سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے، اچھا ہی ہوا ــــ جو رنگ میں بھنگ کا تماشہ آپ نے نہیں دیکھا!"

"(چونک کر) یہ کیا کہہ رہی ہو غزالہ ــــ؟"

"ہاں فرخ بھائی واقعی یہی ہوا تھا!"

"ذرا تفصیل تو بتاؤ!"

"کیا کیجئے گا سن کر، آپ کو بھی میری طرح صدمہ ہو گا، آپ بیماری اٹھا کر آئے ہیں، میں آپ کو صدمہ پہنچانا نہیں چاہتی!"

"لیکن اگر تم نے کوئی بات مجھ سے چھپائی تو بہت صدمہ ہو گا۔"

"اب یہ تمہیں اختیار ہے کہ زیادہ صدمہ پہنچا لو یا کم!"

غزالہ نے نسیم کی بیہودگی اور بدتمیزی کا سارا افسانہ کہہ سنایا، فرخ سنتا رہا۔

پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"میں بھی نسیم بھائی کا وہ دلدوز اور جگر خراش واقعہ فراموش نہیں کر سکتا، مجھ پر ان کے ہاتھوں جو کچھ گذری، وہ کسی طرح تمہارے اس واقعہ سے کم نہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی ہے ــــ لیکن خیر ہو گا، تم سن تو چکی ہو!"

غزالہ شاید بھول چکی تھی، کہنے لگی۔

"بتائیے تو سہی کیا کیا تھا نسیم بھائی نے آپ کے ساتھ!"

فرخ نے افسردہ لب و لہجہ میں کہا

"وہی جو برادران یوسف ہمیشہ سے کرتے آئے ہیں!"

غزالہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"فرخ بھائی صاف صاف بتایئے، آپ تو پہیلیاں بجھا رہے ہیں!"
فرخ نے نسیم کے جمال پور پہنچنے، ہیڈ کلرک سے ملنے، اسے رشوت دینے، پھر شراب کے نشہ میں دُھت ایک بالاخانہ سے اتر کر دوسرے بالاخانہ پر جانے اور راستہ میں تصویر گر پڑنے کا سارا قصہ پھر سے سنایا، پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ تصویر سامنے رکھ دی۔

"یہ رہا ثبوت!"

غزالہ نے تصویر پرے پھینک دی۔ نظر تک نہ ڈالی اس پر، پھر بڑی معصومیت سے کہنے لگی۔

"آخر نسیم بھائی، ہم دونوں کے، آپ کے اور میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟ نہ آپ نے ان کا کچھ بگاڑا ہے نہ میں نے!"

"یہی معمہ تو میں بھی اب تک حل نہیں کر سکا ــــــ ذرا سوچو تو سہی، ہیڈ کلرک جو مجھے اتنا عزیز اور محبوب رکھتا ہے، اب میرے اہلِ خاندان کے بارے میں کیا رائے قائم کرے گا؟ کتنا ذلیل سمجھے گا اس خاندان والا شان کو نسیم بھائی اگر مجھے قتل کر دیتے تو اتنا صدمہ نہ ہوتا، جتنا اس ذلیل حرکت سے ہوا ہے۔"

غزالہ نے تائید کی،

"واقعی ــــــ بالکل یہی میری کیفیت ہے، نصرت اور رابعہ وغیرہ سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت نہیں پڑتی!"

"ہاں بے شک!"

میں نے تو چاہا تھا کہ اباجی کو ساری داستان سنا دوں۔ لیکن ہماری چچی اماں کو خاندان میں تفرقہ نہ پڑنے کا اتنا خیال ہے کہ میرے منہ پر تالا لگا دیا ہے، کنجی خود لئے بیٹھی ہیں ــــــ!"

اتنے میں سلمیٰ کافی لے کر آ گئی، اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میری غیبت کیوں ہو رہی ہے بھائی!"

یہ کہہ کر وہ کافی بنانے لگی، غزالہ نے کہا۔

"چچی اماں، یک نہ شد دو شد ــــــ!"

سلمٰی نے پوچھا۔
"کوئی نئی خبر؟"
وہ بولی۔
"جی ـــــ نئی اور بڑی دلچسپ!"
سلمٰی نے چائے کی ایک پیالی فرخ کے، دوسری غزالہ کے، اور تیسری اپنے سامنے رکھتے ہوئے سوال کیا۔
"بتاؤ تو سہی وہ کون سی نئی اور دلچسپ خبر ہے؟"
فرخ کو بولنے کا موقع دیئے بغیر غزالہ نے وہ ساری کہانی سنادی جو اس نے فرخ سے سنی تھی، پھر زمین پر پڑی ہوئی تبسم کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"یہ رہا ثبوت! ـــــ کیا میری طرح آپ فرخ بھائی کو بھی روکیں گی؟ انہیں اجازت نہ دیں گی کہ وہ ابا جی سے یہ سارا واقعہ بیان کردیں؟"
فرخ نے کہا۔
"لیکن میں تو خاموش نہیں رہوں گا، چچا جان کو ضرور اس واقعہ کی خبر دوں گا!"
سلمٰی چپ بیٹھی رہی!

(۶)

بات اتنی سنگین ہو جائے گی، معاملہ اتنی نازک صورت اختیار کرے گا۔ اس کا سلمٰی کو وہم و گمان بھی نہیں تھا، اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"بھئی میں منع نہیں کرتی، تم لوگوں کا جو جی چاہے کرو، لیکن میرے خیال میں تو صبر سب سے اچھا ہے!"

غزالہ نے اُکتاتے ہوئے انداز میں کہا۔

"اب صبر نہیں ہو سکتا!"

سلمٰی پھر خاموش ہو گئی، اور پھر کسی کام سے اُٹھ گئی،

اس بے رنگ فضا میں لطف پیدا کرنے کے لئے فرخ نے موضوع گفتگو بدل دیا۔

"بھئی غزالہ سالگرہ کی تقریب پر تمہیں تحفے بھی تو بہت سے ملے ہوں گے، ــــــ افسوس ہے ہم کوئی تحفہ نہ دے سکے، اس اعتبار سے نہ آنا ہی اچھا ہوا، مفت میں شرمندہ ہونا پڑتا، ہمارے پاس تھا ہی کیا جو دیتے؟ لیکن ایک حقیر سا تحفہ اگر قبول کر لو تو حاضر کیا جا سکتا ہے!"

غزالہ خوش ہو گئی!

"بڑی خوشی سے!ــــــ وہ تو میرے لئے بڑا قیمتی ہوگا!"

یہ کہتے کہتے، غزالہ کے چہرے پر ایک لمحہ کے لئے سُرخی سی دوڑ گئی۔

فرخ نے کہا۔
"قیمتی تو بالکل نہیں ہے ـــــ البتہ خلوص کی اگر کوئی قیمت ہو سکتی ہے تو انمول ہے!"
غزالہ نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔
"لائیے زیادہ تعریفیں نہ کیجئے!"
فرخ نے اپنا ہینڈ بیگ کھولا، اور اقبال کی "بال جبریل" پیش کر دی!
خوشی سے غزالہ کا چہرہ گلنارہ ہو گیا،
"اتنا اچھا تحفہ ـــــ اسے آپ بے قیمت کہتے ہیں؟"
ایک عجیب عالم میں فرخ نے کہا۔
"اگر تمہاری نظر میں یہ بے وقعت نہیں ہے، تو انمول ہے!"
غزالہ نے فخر سے کہا۔
"کیا اس میں کوئی شک بھی ہے؟"
اتنے میں سلمیٰ آ گئی، غزالہ نے جھٹ وہ انمول تحفہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ فرخ نے منع کرنا چاہا، لیکن نہ کر سکا، سٹ پٹا کر رہ گیا، سلمیٰ نے پوچھا۔
"یہ کیسی کتاب ہے غزالہ؟"
وہ خوشی کا جھولا جھولتی ہوئی بولی،
"یہ فرخ بھائی نے سالگرہ کا تحفہ دیا ہے، ہمیں!"
سلمیٰ نے ملامت آمیز نظروں سے فرخ کو دیکھا۔
"شرم نہ آئی، یہ دو روپے کی کتاب دیتے ہوئے؟"
فرخ نے بے بسی سے کہا۔
"لیکن میرے پاس ہے کیا؟ پاس ہو کر ملازم ہو نے دیجئے، پھر سال بھر کی تنخواہ جمع کر کے کوئی قیمتی تحفہ دوں گا، غزالہ کو!"
وہ بولی،
"نہیں فرخ بھائی ـــــ آپ جو کچھ دیں گے، میں شوق سے، مسرت سے

بلکہ فخر سے لوں گی، آپ سے مانگ کر لینے میں، چھین کر لینے میں بھی مجھے تامل نہیں، لیکن آج جو تحفہ آپ نے دیا ہے، یہ میری زندگی کی قیمتی پونجی ہے!"
یہ کہتے کہتے وہ یک دم رُک گئی، جیسے روانی کلام میں کوئی ایسی بات منہ سے نکل گئی۔ جسے کہنا مناسب نہ تھا لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا، شرمندہ سی ہو کر خاموش ہو گئی، سلمٰی نے کہا۔
"غزالہ بیٹی! فرخ کو وہ ہار تو دکھاؤ جو صمد نے تمہیں دیا ہے؟"
فرخ نے غزالہ کی کیفیت بھانپ لی تھی، اس نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا۔
"ہاں بھئی وہ ہار تو ضرور دکھاؤ، بلکہ وہ سارے تحفے جو تمہیں ملے ہیں!"
غزالہ خوش خوش اُٹھی،
"ابھی لائی!"
وہ چلی گئی تو سلمٰی نے کہا۔
"کتنی بھولی اور پیاری لڑکی ہے!"
فرخ نے کہا۔
"شریف اور عالی ظرف بھی کتنی ہے، محض میرا دل رکھنے کے لئے اس معمولی سے تحفہ کی کیسے مبالغہ کے ساتھ تعریفیں کر رہی تھی!"
اتنے میں غزالہ کمرہ میں داخل ہوئی، اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے، سلمٰی یہ کیفیت دیکھ کر بیقرار ہو گئی۔
"خیر تو ہے میری بچّی!"
وہ ردہانسی آواز میں بولی۔
"وہ ہار تو نہیں ہے وہاں!"
سلمٰی کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی، لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔
جائے گا کہاں؟ —— آؤ دیکھیں!"

سلمیٰ اور فرخ عزالہ کے ساتھ اس کے کمرہ میں پہنچے، اس نے اپنی آہنی الماری کھولی، اس کے اندر جو تجوری تھی اسے کھولا، گھڑی رکھی تھی، انگوٹھی بھی موجود تھی، دوسرے تحفے بھی ویسے ہی رکھے تھے، لیکن —— ہار کا ڈبہ خالی پڑا تھا۔

اب تو سلمیٰ بھی گھبرائی،

"غضب ہو گیا —— تین ہزار کا تھا!"

عزالہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اس کی سب سے زیادہ اہمیت یہ تھی کہ ابّا میاں کا دیا ہوا تھا، انہیں کتنا صدمہ ہوگا!"

"ہاں —— وہ تو ہونا ہی چاہیئے!"

فرخ نے سوال کیا۔

"لیکن اس کی کنجی تو تمہارے پاس تھی؟"

فرخ نے سوال کیا۔

"لیکن اس کی کنجی تو تمہارے پاس تھی؟"

"جی ہاں میرے پاس!"

"الماری اور تجوری نہیں بند ملی!"

"جی ہاں بند!"

"اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی نے دوسری چابی بنوائی ہے!"

عزالہ نے سوال کیا۔

"لیکن کون ہو سکتا ہے وہ ——"

مطمئن لہجہ میں فرخ نے کہا۔

ابھی معلوم ہو جائے گا ——"

"کس طرح؟ بتائیے تو سہی!"

"چابی بہر حال یہیں فیروز آباد میں بنوائی گئی ہے، میں جاتا ہوں، ہر قیمت پر سُراغ لگا کر آتا ہوں!"

فرخ چلا گیا، سلمیٰ اور غزالہ ماتمی صورت بنا کر ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھ گئیں، ایک گھنٹہ، دو گھنٹہ، تین گھنٹے گذر گئے، ۹ سے ۱۲ بج گئے، مگر فرخ نہ آیا۔

غزالہ نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"فرخ بھائی نے بڑی دیر کردی کہاں رہ گئے؟"

اس نا خبر سے دل تو سلمیٰ کا بھی دھڑک رہا تھا، لیکن اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"آتا ہوگا!"

ایک بج گیا!

سلمیٰ نے کہا۔

"بیٹی کھانا تو کھالو!"

وہ بولی،

"فرخ بھائی آلیں تب!"

سلمیٰ خاموش ہوگئی،

۲ بجے، ۳ بجے، ۴ بجے، پانچ بجے، سورج غروب ہونے لگا، چھ بجے، سورج غروب ہوگیا، سات بج گئے!

مگر فرخ اب تک نہیں آیا، اب تو غزالہ بے قرار ہوگئی،

"آخر فرخ بھائی کہاں رہ گئے؟ خدانخواستہ ان پر کوئی اُفتاد تو نہیں پڑ گئی؟"

سلمیٰ کا دل بیٹھا جا رہا تھا، غزالہ کے الفاظ گھونسہ کی طرح اس کے سینہ پر لگے، لیکن وہ اپنی بے کلی ظاہر کر کے غزالہ کی پریشانی اور اضطراب میں اضافہ کرنا نہیں چاہتی تھی، اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"آتا ہوگا، آجائے گا!"

غزالہ کی ان الفاظ سے تسکین نہ ہوئی۔

"چچی اماں میرا دل ہول رہا ہے، اگر وہ تھوڑی دیر اور نہ آئے تو میں بیہوش

ہو جاؤں گی میرے ہاتھ پاؤں سنسنا رہے ہیں !"
یہ سُن کر سلمیٰ کا کلیجہ منہ کو آگیا، اس نے پیار کرتے ہوئے کہا۔
" بیٹی اتنی پریشان نہ ہو میرا دل گواہی دیتا ہے، وہ اب آتا ہی ہوگا !"
اتنے میں خستہ اور نڈھال پسینہ میں شرابور فرخ آیا، اور آتے ہی کرسی پر گر گیا، جیب سے رومال نکالا، پیشانی اور چہرہ کا پسینہ پونچھنے لگا، سلمیٰ نے شکایت کی۔
" بیٹے تم کہاں رہ گئے تھے ؟ سارا دن گذار دیا، دیکھو تو غزالہ کی کیا حالت ہو رہی ہے ــــــ صبح سے اس نے کھانا بھی نہیں کھایا !"
فرخ چاق و چوبند ہو کر اُٹھ بیٹھا، اس نے کہا۔
" ارے یہ کیوں ؟"
غزالہ روٹھے ہوئے انداز میں گویا ہوئی۔
" بس رہنے بھی دیجئے، آخر اتنی دیر تک کیا کرتے رہے آپ ؟"
وہ مسکراتا ہوا بولا۔
" سراغ لگاتا رہا !"
غزالہ نے پریشانی کے ساتھ پوچھا۔
" پھر لگا کچھ پتہ ؟"
فرخ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دو کنجیاں اس کے سامنے رکھ دیں۔
" یہ لو !"
سلمیٰ اس اندازِ گفتگو سے تنگ آگئی، اس نے کہا۔
فرخ صاف صاف بتاؤ !"
فرخ نے کہا۔
فیروز آباد میں صرف چار آدمی ہیں، جو قفل سازی وغیرہ کا کام کرتے ہیں۔ باری باری میں سب کے ہاں گیا، سب کو ٹٹولا، ہر جگہ کافی وقت صرف کیا، لیکن کچھ پتہ نہ چلا، آخر مجھے یاد آیا، یہ الماری جس کارخانہ کی بنی ہے، وہاں پہنچنا چاہیئے، اتفاق کی بات پہلے مڈ بھیڑ مسٹری سے ہوئی، وہ مجھے الماریاں دکھانے لگا۔ میں نے معائنہ شروع کر دیا، پھر میں ایک الماری کے سامنے

جا کر کھڑا ہو گیا۔ بالکل ایسی ہی ننھی جیسی عزالہ کی ہے، میں نے کہا۔
"میرے پاس اسی کارخانہ کی ایسی ہی الماری ہے، اس کی کنجی گم ہو گئی ہے وہ بنوانا چاہتا ہوں!"
مستری نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔
"صاحب یہ معاملہ کیا ہے؟"
میں نے پوچھا۔ "کیا ہُوا؟"
کہنے لگا۔
"ابھی چند دن ہوئے ایک صاحب آئے تھے، وہ اسی الماری کی کنجیاں کھڑے کھڑے بنوا کر لے گئے تھے!"
میں نے کہا۔
ہوں گے کوئی صاحب، چابی ایسی چیز ہے کہ لاکھ احتیاط کرو، مگر وہ گم ہو کر رہتی ہے!"
"یہ بھی اچھی کہی آپ نے ——!"
میں نے کہا۔
"اچھا بھئی تو پھر چابی چاہیئے، اور ابھی ابھی!"
وہ ہنسا!
"کھڑے کھڑے؟"
میں نے کہا۔
"ہاں ——"
وہ بولا،
"تو لائیے پچیس روپے دلوائیے!"
میں نے کہا۔
"یہ تو بہت ہوئے!"
وہ کہنے لگے۔
ان صاحب نے بھی پچیس ہی دیئے تھے، اور اتنی آمادگی سے دیئے

کہ میں دل ہی دل میں افسوس کرنے لگا، تیس کیوں نہ مانگے!"

"میں ہنسنے لگا۔"

"نہیں بھائی میں اتنا آمادہ نہیں ہوں' ـــــ یہ لو بیس روپے!" اس نے روپے لے لئے، میں اس کے ساتھ ساتھ اس کے کارخانے پر پہنچا، اس نے کرسی پیش کی، میں بیٹھ گیا، اور وہ چابی بنانے لگا، میں نے اس سے پوچھا۔

"کیوں بھئی وہ کون صاحب تھے؟"

کہنے لگا۔

"نام تو میں نہیں جانتا!"

میں نے پوچھا۔

"حُلیہ؟"

اس نے حلیہ جو بتایا، وہ بالکل نسیم بھائی کا تھا۔

میں دنگ رہ گیا، چابی بنانے کے بعد اس نے ایک رجسٹر میرے سامنے رکھا۔

"لیجئے صاحب اس پہ دستخط کر دیجئے۔"

میں نے پوچھا۔

"اس کی کیا ضرورت ہے؟"

کہنے لگا۔

"ہم غریب لوگ ٹھہرے، کوئی جعلساز یتوا لے جائے، پکڑا جائے تو ہم بھی دھرے جائیں گے، لہٰذا کچا کام نہیں کرتے!"

میں نے دستخط کر دیئے، پھر رجسٹر کے ورق اُلٹنے پلٹنے لگا۔ ایک جگہ نسیم بھائی کے دستخط نظر آئے، آدمی جب کوئی جُرم کرتا ہے تو اس کی مت ماری جاتی ہے، وہ خود سراغ مہیا کر دیتا ہے، کوئی اور نام لکھ دیتے، لیکن بے خیالی میں اپنا ہی نام لکھ گئے، میں نے دستخط پر انگلی رکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہی صاحب تھے؟"

اس نے فوراً کہا۔

"جی ہاں، یہی صاحب ـــــ کیا آپ انہیں جانتے ہیں؟"

میں نے ٹالتے ہوئے کہا۔

"کچھ یاد تو پڑتا ہے!"

مستری بڑا باتونی اور کاہل تھا، اتنی دیر لگادی، اب آنٹیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں، اماں کھانا!

سلمیٰ فوراً کھانا نکلوا کر لے آئی، اس نے، فرخ نے، غزالہ نے ساتھ ساتھ بیٹھ کر کھایا، کھانے کے بعد ایک مرتبہ اور کافی کا دور چلا، پھر گول میز کانفرنس شروع ہوگئی، غزالہ نے کہا۔

"نسیم بھائی کے بارے میں میری رائے کبھی بھی اچھی نہیں رہی انکی گذشتہ دنوں کی حرکتوں نے تو مجھے ان سے بیزار اور متنفر کر دیا ہے، ایک لمحہ کے لئے میں یہ تصور نہیں کر سکتی تھی کہ وہ چوری کر سکتے ہیں، میرے زیور پر ہاتھ صاف کر سکتے ہیں!"

سلمیٰ نے کہا۔

"یہ تو واقعی بڑا اندھیر ہے!"

فرخ نے رائے دی۔

"وقت آگیا ہے کہ چچا جان کو سارے واقعات بتا دیئے جائیں!"

غزالہ نے سلمیٰ سے مشورہ کیا۔

"بتا دیئے چچی؟"

وہ بولیں۔

"کیا بتاؤں؟ —— جو مرضی ہو کرو!"

غزالہ نے کہا۔

"میں تو اب بھی خاموش رہتی، لیکن اتنی بڑی واردات ابا جان سے کر نہیں سکتی، انہیں اگر یہ معلوم ہوا کہ ہار چوری ہوگیا، چور کا حال بھی معلوم ہو گیا۔ اور ان سے ہر بات چھپائی گئی تو انہیں صدمہ بھی ہوگا اور غصہ بھی آئے گا!"

فرخ نے تائید کی،

"یقیناً۔ ——"

(۷)

نسیم ایک بڑے باپ کا اکلوتا اور لاڈلا تھا اس لئے آوارہ اور بدمعاش لڑکا تھا، نہ ماں کا لحاظ، نہ باپ کا ڈر، تعلیم حاصل نہیں کی، ہنر سیکھا نہیں، باپ نے زمین جائیداد، املاک اور زر نقد کی صورت میں اتنا جمع کرایا تھا کہ اس کی ساری زندگی گلچھڑے اڑاتے میں بسر ہو سکتی تھی، یہی بے فکری تھی جس نے اُسے آوارگی اور بدمعاشی کی ڈگر پر ڈال دیا تھا اور اب صورتِ احوال یہ تھی کہ ماں باپ کی بہترین کوششوں کے باوجود لڑکا ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

مریم اور امجد دونوں جانتے تھے، نسیم شراب بھی پیتا ہے۔ جوا بھی کھیلتا ہے اور عیاشی بھی کرتا ہے، دونوں نے روکنے سمجھانے اور راہ پر لانے کی کوشش کی مگر وہ اور زیادہ اپنی حرکتوں میں دلیر اور جری ہوتا گیا، البتہ ایک بات ایسی تھی جس سے امجد قطعاً ناواقف تھا۔ یہ کہ اس کی تجوری سے نوٹوں کے بنڈل غائب ہو رہے ہیں، بنڈل اتنے زیادہ تھے، اور اعتماد گھر والوں پر اس قدر تھا کہ یہ بات ذہن میں آہی نہیں سکتی تھی کہ یہاں کوئی ڈاکو بیٹھا ہے۔

لیکن جس طرح عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے، اسی طرح بدی اور بُرائی بھی لاکھ چھپا کر کی جائے، مگر ظاہر ہو کر رہتی ہے۔

امجد میاں کے گھر میں جو حالت نسیم کی تھی، گلبدن کے گھر میں وہی پوزیشن عنایت کی تھی۔

عنایت گلبدن کا چھوٹا بھائی تھا، گلبدن رحمت پور کی مغنیہ تھی، نوجوان طرحدار حسین، سحر طراز، دشمن ایمان، بظاہر اس کا پیشہ مغنیہ کا تھا، لیکن رحمت پور دولت مندوں، ساہوکاروں اور تجارت پیشہ لوگوں کی وہ منظور نظر تھی، گانے سے زیادہ اپنے عشوہ و ادا، ناز و غمزہ اور حسن و شباب کی قیمت وصول کرتی تھی، اور منہ مانگے دام پاتی تھی، سارا کنبہ اسی کی آمدنی پر بسر کر رہا تھا، کئی پشتوں سے اس خاندان کا یہی پیشہ چلا آرہا تھا، ایک ہی لڑکی تھی جو سارے شہر کی جیب پر ڈاکہ ڈال ڈال کر شاہانہ زندگی بسر کرتی تھی، اور اپنے کنبہ والوں کو بھی گوشت روٹی کھلاتی تھی، گھر والوں کو نہ کبھی لڑکے کی حسرت ہوئی نہ ضرورت محسوس کی گئی، جو کام سعادتمند سے سعادتمند لڑکا نہیں کر سکتا تھا وہ لڑکی کر ڈالتی تھی، پھر وہ لڑکے کی آرزو کیوں کرتے ؟

لیکن قدرت کے ارادوں میں کون مزاحم ہو سکتا ہے ؟ بہت دنوں بعد اور گلبدن کی پیدائش کے کوئی چھ سال بعد عنایت صاحب تولد ہوئے ماں کو خوشی تھی کہ دوسری گلبدن گھر میں جنم لے رہی ہے، لیکن ہوا لڑکا، بہرحال یہ سانحہ کسی نہ کسی طرح برداشت کرنا پڑا۔

لیکن یہ لڑکا بڑا چنچل، بڑا شوخ اور بڑا من موہن تھا، وہی ماں جسے اس کی پیدائش پر صدمہ ہوا تھا، اس پر صدقے قربان ہونے لگی، باپ کا کوئی سوال ہی نہیں تھا، گلبدن کو عنایت کی پیدائش پر نہ صدمہ ہوا تھا نہ خوشی، لیکن بہت جلد عنایت کی بھولی اور شوخ حرکتوں نے اس لڑکی کا دل بھی اپنی طرف کھینچ لیا اور دیکھتے دیکھتے یہ لڑکا ماں اور بہن کی آنکھوں کا تارا بن گیا

اول تو اس گھر میں لڑکا پیدا ہونے کی بدعت پہلی مرتبہ ظہور میں آئی تھی، دوسرے آج تک اسکول اور کالج کا رخ یہاں کے لوگوں میں سے کسی نے نہیں کیا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ جہالت کی گود میں عنایت پروان چڑھتا رہا، جوں جوں بڑھتا گیا، شریر، خودسر، گستاخ، ڈھیٹ اور آوارہ ہوتا گیا۔۔۔

اب رحمت پور کے چھٹے ہوئے غنڈوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔

گھر میں روپے کی کمی تو تھی نہیں، جتنا مانگتا مل جاتا، لیکن جب مصارف

بجلی روشن کئے بغیر اُس نے تجوری کھولی، اور ٹٹولنے لگا کہ کوئی زیور مل جائے تو ہتھیا لے اور اُسے فروخت کر کے یاروں میں اپنی ساکھ قائم رکھے قسمت یاور تھی، سب سے پہلے جو چیز ہاتھ میں آئی وہ ایک ہار تھا۔

اندھیرے میں عنایت اس کی قدر و قیمت کا اندازہ نہ کر سکا، لیکن یہ سوچ کر جیب میں ڈال لیا کہ جس چیز کو گلبدن اتنی احتیاط سے تجوری میں بند کر کے رکھے وہ معمولی نہیں ہو سکتی، دو ہزار کی نہ ہوگی، ہزار کی سہی، باقی کا ہزارہ پھر دیکھا جائے گا ——!

اتنے اطمینان کی نیند بہت دنوں کے بعد عنایت کو آئی تھی، صبح اُٹھتے ہی اس نے ڈٹ کے ناشتہ کیا اور سیدھا نعیم کے ہاں پہنچا، یہ وہی شخص تھا جس سے رات اس نے اٹھارہ سو روپے قرض لے کر جوا کھیلا تھا نعیم نے دیکھتے ہی تقاضا کیا،

"روپے لائے ؟ —— بھئی وہ دوسرے کے تھے، جو میں نے تمہیں دے دیئے تھے، آج واپس کرنا ہیں، ورنہ منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا!"

عنایت نے بے پروائی سے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"روپے لوگے یا کسی کی جان لوگے ؟"

یہ کہہ کر اس نے ایک نہایت خوبصورت اور دیدہ زیب طلائی ہار نکال کر سامنے رکھ دیا۔

ہار رکھتے وقت عنایت کو یاد آیا کہ یہ نسیم نے گلبدن کو دیا تھا، اور تین ہزار روپے اس کی قیمت بتائی تھی، اتنی قیمتی چیز وہ چرانا نہیں چاہتا تھا، خبر ہو گئی تو قیامت آجائے گی اور خبر کیسے نہ ہوگی، جی چاہا واپس لے لے، لیکن نعیم روپے لئے بغیر ماننے والی اسامی نہ تھا، آخر تن بہ تقدیر اس نے کہا۔

"سنتے ہو نعیم بھائی، یہ تین ہزار کا ہے، اٹھارہ سو تم لے لو، بارہ سو یاروں کے ہاتھ پر رکھ دو!"

نعیم کی آنکھیں ہار کو دیکھ کر چکا چوند ہو گئیں، اس نے کہا۔

"ہاں معلوم تو اتنے ہی کا ہونا ہے —— ایسا کرو، قادر ماموں کے ہاں

حد سے بڑھے اور اس نے خود باقاعدہ اوباشی اور عیاشی شروع کی، تو آمدنی کا وہی ذریعہ اس نے بھی اختیار کیا تھا، یعنی چوری ـــــ جب موقع ملتا گلبدن کی تجوری سے نوٹ زیور جو چاہتا اڑا لیتا، اوّل تو گلبدن کو پتہ ہی نہ چلتا، اور چل بھی جاتا، تو چیخ چلا کر بک جھک کر کے چپ ہو رہتی۔
بہن جب محبت کرنے پر آتی ہے تو ماں سے بھی بازی لے جاتی ہے حقیقت یہ ہے کہ عنایت کی آوارگی اور شہدپن کی سرپرست گلبدن ہی تھی۔

ایک مرتبہ جوئے کی ایک محفل میں چند گھنٹوں کے اندر دو ہزار روپے وہ ہار گیا۔ اس کی جیب میں مشکل سے دو سو روپے تھے، باقی روپے اس نے ایک ساتھی سے قرض لے کر داؤں پر لگائے، امید تھی یہیں جیت کر ادا کر دے گا، لیکن قسمت مخالف تھی ہار گیا، دوسرے دن رقم ادا کرنے کا وعدہ کر کے گھر آ گیا۔

راستہ بھر سوچتا رہا، یہ رقم کس طرح ادا کی جائے گی؟
سو دو سو کا معاملہ ہوتا تو چھین جھپٹ کر گلبدن سے لے لیتا، لیکن یکمشت دو ہزار؟ قیامت تک وہ نہیں دے گی، پھر؟
گلبدن کے عاشقان باوفا پر ایک ایک کر کے نگاہ ڈالی، لیکن سوائے مایوسی کے کچھ نہ ملا، اتنی بڑی رقم خود گلبدن کے لئے ایک ہی مرتبہ میں کسی سے جھٹک لینا آسان نہ تھا، نہ کہ عنایت کے لئے جو بہر حال گلبدن نہ تھا، صرف اس کا بھائی تھا!

"پھر ــــــ؟"
راستہ بھر یہی سوچتا وہ گھر پہنچا، یہ دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہو گئی کہ گلبدن گھر میں نہیں ہے اور بارہ بجے رات سے پہلے آنے کی امید بھی نہیں ہے، چودھری فرزند علی صاحب کے غسلِ صحت کی تقریب میں مجرے کی غرض سے بلائی گئی ہے!
ایسا معلوم ہوا کہ جیسے خود قدرت نے یہ موقعہ فراہم کر دیا ہے!
وہ چپکے سے گلبدن کے کمرہ میں داخل ہوا۔ چابی موجود ہی تھی، کمرہ کی

چلتے ہیں ان کا کام ہی سونے چاندی کے زیورات بنانا، اور فروخت کرنا ہے، انہی کے ہاتھ بیچ دیں گے، اپنے روپے میں رکھ لوں گا، ——— باقی تم لے لینا!"

عنایت راضی ہو گیا، نعیم اور عنایت قادر زرگر کے ہاں پہنچے، نعیم نے تعارف کرایا۔

یہ عنایت صاحب ہیں شہر کی مشہور مغنیہ گلبدن کے بھائی، کوئی ایسی ہی ضرورت پیش آگئی ہے، یہ ہار بیچنے لائے ہیں!"

قادر زرگر نے ہار کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا، چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔

"کتنے میں بیچنا ہے؟"

عنایت نے کہا۔

"تین ہزار کا ہے، ابھی چند ہی روز ہوئے ہیں خریدے ہوئے، آپ سو روپے کم دے دیجئے!"

قادر زرگر نے ہار واپس کرتے ہوئے کہا۔

"نا بھائی یہ سودا نہیں ہو سکتا ——— ناممکن!"

عنایت پر اوس سی پڑ گئی، اس نے پوچھا۔

"پھر آپ کیا دیں گے؟"

قادر زرگر نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔

"ایک بات ——— زیادہ سے زیادہ دو ہزار!"

عنایت نے ہار لے کر واپس جانا چاہا، لیکن نعیم نے گھٹنا دبایا، مطلب یہ کہ چلتا ہو چلو، لیکن میرا حساب ابھی بیباق کرنا ہوگا۔ عنایت بے بسی کے ساتھ پھر بیٹھ گیا۔

"لائیے!"

قادر زرگر نے اپنی تجوری کھول کر دو ہزار کے نوٹ نکالے اور ہنستے ہوئے کہا۔

"تمہارے پاس تو سونے کی کان ہے، ایسے ایسے نہ جانے کتنے ہار آتے رہتے ہوں گے!"

عنایت نے کوئی جواب نہیں دیا روپے گن کر جیب میں رکھے، قادر زرگر نے سادہ کاغذ اور قلم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لو بیٹا رسید لکھ دو!"

عنایت کا چہرہ سفید پڑ گیا، وہ متامل نظر آنے لگا، نعیم نے ہمت بندھائی!

"یہ تو قاعدہ کی بات ہے رسید تو دینا پڑے گی!"

قادر زرگر نے پیٹھ ٹھونکی۔

"یہ تو رسمی بات ہے، ورنہ ہمارے پاس تمہاری رسید دیکھنے کون آئیگا!"

"چار و ناچار، عنایت کو رسید دینا پڑی،

عنایت اور نعیم، باہر نکل رہے تھے کہ امجد میاں داخل ہوئے، ان کا قادر زرگر سے پُرانا یارانہ تھا۔ زیورات وغیرہ جب بھی بنوانا ہوتے، قادر ہی سے بنواتے، اندر پہنچے تو قادر کے ساتھ وہ طلائی ہار رکھا ہوا تھا، بے ساختہ ان کا ہاتھ ہار پر گیا،

"ارے یہ ــــــــ"

قادر زرگر نے کہا۔

"ہاں میاں صاحب بڑی موٹی چڑیا پھنسی ہے آج، یہ ہار واقعی تین ہزار سے کم کا نہ ہوگا، لیکن دو ہزار میں لے لیا یاروں نے، بلکہ وہ سالا تو ڈیڑھ ہزار میں بھی دے جاتا۔"

امجد میاں کی نظر ہار پر تھی اور ان کے کانوں میں نسیم کی آواز گونج رہی تھی۔

"میں نے بھی وہ بدلہ لیا ہے کہ زندگی بھر یاد کریں گی!" ــــــــ روئے گی، اور روتے نہ بن پڑے گا، میں دُور سے تماشہ دیکھوں گا، بلکہ یہاں بیٹھے بیٹھے دیکھ رہا ہوں، اور لطف لے رہا ہوں!"

امجد میاں کے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی، آنکھوں کے نیچے اندھیرا آگیا، وہ سوچنے لگے کیا اس ناخلف نے غزالہ کا ہار چُرالیا ہے ــــــــ بالکل وہی، کم بخت ناک کٹا دی تو تے، لیکن سوال یہ ہے قادر کے پاس یہ کہاں

سے ٹپک پڑا،
امجد نے قادر زرگر سے دریافت کرنا چاہا۔

"یہ ہار ———"
قادر ہنسنے لگا۔
"سچ کہنا میاں صاحب کتنے کا ہار ہوگا یہ؟"
امجد کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"تین ہزار ———"
قادر نے ایک قہقہہ لگایا۔
"آپ نے تو اتنی صحیح قیمت بتادی، جیسے آپ ہی نے خریدا ہو اسے، وہ بھی تین ہزار ہی بتا رہا تھا!"
امجد نے لرزتی ہوئی آواز سے پوچھا۔
"کون؟ ——— کسے کہہ رہے ہو تم؟"
قادر زرگر نے کہا۔
"ارے وہی گلبدن ہے نا؟ اس کا بھائی لایا تھا بیچنے، ابھی تو گیا ہے روپے لے کر ——— میاں صاحب ان رنڈیوں کا کیا کہنا ہے، کوئی تماشبین نذر چڑھا گیا ہوگا، یہاں بے قدر ہوئی کہ اونے پونے فروخت کر دیا!"
جیسے امجد میاں کے کان میں کسی نے پگھلتا ہوا سیسہ ڈال دیا، گلبدن کے نام نامی سے وہ واقف تھے، یہ بھی جانتے تھے صاحبزادہ خوش اطوار و بلند اقبال ہزار جان سے اس پر فریفتہ ہیں، دل نے کہا، ضرور یہ ہار نسیم غزالہ کا اڑا لایا ہے، یہاں آکر اس نے گلبدن کو دیا، وہ چوری کا مال اپنے پاس کیوں رکھتی فروخت کر دیا۔
امجد کا جی چاہا جھپٹا مار کر یہ ہار قادر زرگر سے چھین لے، لیکن ہمت نہ پڑی، اس نے دوستانہ لہجہ میں کہا۔
لیکن اگر یہ چوری کا ہوا؟"
قادر نے اطمینان سے جواب دیا۔

" اگر کیا معنی ؟ ـــــــ قطعاً چوری کا ہے ۔"

" اگر تم پکڑے گئے ؟ "

قادر ہنسنے لگا ۔

" میاں صاحب کی باتیں ـــــ میں نے روپیہ دے کر باقاعدہ رسید لے لی ہے اگر پکڑی جائے گی تو گلبدن یا اس کا بھائی عنایت، یا وہ تماشبین جس نے یہ ہار اُسے دیا ہے، بھلا چوری کی رپورٹ کر کے بدنامی کا ٹوکرا اپنے سر کون رکھنے پر آمادہ ہوگا! یہی سوچ کر تو افسوس کر رہا ہوں، دو ہزار کے بجائے ڈیڑھ ہزار کہتا، تو بھی یہ ہار اپنا تھا ۔

بات امجد میاں کی سمجھ میں آگئی، خود ان کا جی چاہا کہ ابھی جائیں، اور پولیس میں رپورٹ کردیں لیکن نگاہِ تصور کے سامنے جب ہتکڑی اور بیڑی میں جکڑے ہوئے حضرت نسیم نظر آئے تو بدن میں تھرتھری پیدا ہوگئی، یہ خیال فاسد دل سے نکال دیا

قادر زرگر نے امجد کو فکر مند دیکھ کر کہا ۔

" میاں کیا سوچ رہے ہیں آپ ـــــ ؟ "

امجد نے اُٹھتے ہوئے جواب دیا ۔

" کچھ نہیں ـــــ اچھا بھئی اب چلتا ہوں، ہاں وہ پازیب کا آرڈر دیا تھا تمہیں، کیا ہوا اس کا ؟ "

قادر نے کہا ۔

" کل مل جائے گی ! "

(۸)

امجد میاں قادر زرگر کی دوکان سے اس طرح لڑکھڑاتے ہوئے اُٹھے جیسے میخانہ سے نسیم نکل رہا ہو، پاؤں رکھتے کہیں تھے، پڑتا کہیں تھا، آنکھوں کے سامنے چنگاریاں اڑ رہی تھیں، سر چکرا رہا تھا، دل دھڑک رہا تھا، ریڑھ کی ہڈی سے سردی کی لہر سی اٹھتی معلوم ہو رہی تھی، اتنی ہی دیر میں وہ کئی دن کے بیمار نظر آنے لگے، گھر پہنچے تو آہ اور کراہ کے ساتھ بستر پر گر پڑے، مریم نے شوہر کا یہ رنگ دیکھا تو اوسان خطا ہو گئے، پوچھنے لگی۔

"یہاں سے تو تم اچھے بھلے گئے تھے، کیا ہوا؟ نصیب دشمنان طبیعت کیسی ہے؟"

امجد میاں نے خشک ہونٹوں پر خشک زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"بتاتا ہوں، پہلے ذرا پانی پلا دو ٹھنڈا ——— آہ!"

مریم لپکی لپکی گئی، اور گلاس میں بھر کر ٹھنڈا پانی لے آئی۔

"لو پی لو ——— (گھبرائے ہوئے لہجہ میں) ہائے انہیں کیا ہو گیا ہے، جیسے کسی نے سارا خون سونت لیا ہو!"

امجد نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گلاس لیا اور منہ سے لگا لیا، پھر مریم کو گلاس دیتے ہوئے دوبارہ دراز ہو گئے۔

"مریم ——— بیگم!"

وہ روہانسی آواز میں بولی۔

"ہاں ــــ کہو میں سن رہی ہوں!"

وہ کراہتے ہوئے بولے۔

"صرف یہ کہنا ہے میری خطائیں معاف کر دو، مہر بھی بخش دو، میں آنکھیں بند کئے لیتا ہوں یٰسین کی تلاوت شروع کر دو، بہت جلد مر جاؤں گا کفن دفن کے جھنجھٹ کی ضرورت نہیں، لاش اٹھوا کر گھورے پر پھنکوا دینا تاکہ چیل کوے کھا جائیں ــــ آہ!"

مریم روتے لگی،

"تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیسی باتیں کر رہے ہو، مریں تمہارے دشمن خدا نہ کرے تمہاری لاش گھورے پر پھینکی جائے۔"

"اچھا بھائی تاج محل بنوانا میری قبر پر، لیکن خدا کے لئے مرنے تو دو مجھ بدنصیب کو! ــــ ہائے!"

مریم نے گلوگیر آواز میں فریاد کی،

"ہائے میں کیا کروں؟ نسیم بھی نہ جانے کہاں مٹر گشت کر رہا ہے، ورنہ ڈاکٹر کو تو بلوا لیتی!"

امجد میاں اٹھ کر بیٹھ گئے، اور کڑاکے دار آواز میں کہا۔

"جس گھر میں ملک الموت آ چکا ہو وہاں ڈاکٹر کیا کرے گا!"

آواز کی یہ کڑک اور گرج دیکھ کر ذرا دیر کے لئے مریم کو ایسا محسوس ہوا جیسے امجد میاں ایکٹنگ کر رہے ہوں، لیکن جب فوراً ہی وہ بستر پر نڈھال ہو کر گر پڑے، اور درد ناک لہجہ میں ان کے منہ سے ہائے کا لفظ نکلا، جس نے اب تکیہ کلام کی صورت اختیار کر لی تھی، تو اسے اپنی غلط فہمی پر ندامت ہوئی، اس نے دلدہی کرتے ہوئے کہا۔

"گھبراتے کیوں ہو؟ اچھے ہو جاؤ گے اختلاج ہو رہا ہے شاید، کبھی کبھی میری بھی یہی کیفیت ہوتی ہے، مرد ہو کر گھبرائے جا رہے ہو!"

امجد میاں پھر تکیہ کے سہارے بیٹھ گئے، فرمایا۔

؎ حضرت ناصح جو آئیں دیدہ و دل فرش راہ
کوئی ہم کو یہ تو بتلا دو کہ سمجھائیں گے کیا؟

ارے بھئی، میرا علاج صرف موت ہے ـــــ موت، موت موت!"

مریم کو یقین ہو گیا، امجد میاں کا دماغ چل گیا ہے، اس نے آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

"یا غوث اعظم ـــــ!"

امجد میاں نے آگے کچھ نہ کہنے دیا۔

"ارے بی بی کیوں بڑھاپے میں اپنی عاقبت خراب کر رہی ہو، خدا کو یاد کرو! خدا کو، ـــــ عزیزو اب اللہ ہے بس اللہ ہے!"

مریم سہم کر چپ ہو گئی اور شوہر کی طرف بے بسی سے دیکھنے لگی، امجد نے کہا۔

"بی بی، تم تو بڑی اچھی ہو لیکن تمہارے پیٹ میں ایسا زہر ہلاہل کہاں سے آگیا؟"

اب تو مریم کو یقین ہو گیا، امجد میاں کا دماغ الٹ گیا ہے، اگر انہوں نے ذاتی حملہ نہ کیا ہوتا تو وہ اس جانگداز منظر کی تاب نہ لاتی، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی، لیکن چونکہ اس پر ذاتی حملہ کیا گیا تھا، اس لئے وہ جواب دیئے بغیر نہ رہ سکی،

"اے خدا نہ کرے میرے پیٹ میں زہر ہلاہل کیوں ہوتا، کچھ ہوش میں بھی ہو!"

امجد میاں نے اپنے دعوے پر اصرار کرتے ہوئے کہا۔

"بی بی میں جھوٹ نہیں کہتا، اگر تم سانپ، بچھو، کھنکھجورے، جن ڈالتیں تو مجھے ذرا شکایت نہ ہوتی، لیکن تمہارے پیٹ سے تو وہ ناخلف پیدا ہوا ہے، وہ اژدہا پیدا ہوا ہے، جس کے کاٹے کا منتر نہیں، جس کا کاٹا پانی نہیں مانگ سکتا ـــــ مجھے اپنا کوئی غم نہیں، میں تو اب مر ہی رہا ہوں، فکر تمہاری ہے۔ میرے بعد یہ لونڈا تمہاری کیسی کیسی گت بنائے گا ـــــ بی بی سُن رہی ہو؟ بتاؤ سُن رہی ہو نا میری بکواس؟"

مریم نے رکھائی کے ساتھ کہا۔

"ہاں سُن رہی ہوں!"

وہ کہنے لگے،

"تو پھر کہیں سے تھوڑا سا زہر لے آؤ، پہلے تم کھالو، تاکہ تمہاری طرف سے اطمینان ہو جائے، پھر میں کھالوں گا، مجھ پر اعتبار کرو، میں وعدہ کرتا ہوں کھالوں گا، قسم کھاتا ہوں ـــــــ"

مریم نے خونخوار نظروں سے شوہر کو دیکھا۔

میں کہتی ہوں اب چپ بھی رہو گے یا نہیں؟ آخر کیا کیا تبسم نے؟"

امجد میاں کے تن مردہ میں تبسم کا نام سُن کر زندگی کی حرارت دوڑ گئی۔ گرج کر پوچھا۔

" بتاؤں کیا کیا ہے اس نے؟"

وہ بولیں،

" بتاتے کیوں نہیں؟ کیا کسی کو قتل کر دیا ہے!"

امجد میاں پھر لیٹ گئے،

کاش قتل کر دیا ہوتا "کسی" کو نہیں، مجھے تمہارے شوہر کو!

بہت سے لوگ ہیں جو لا ولد ہیں، بڑے ٹھاٹھ سے زندگی بسر کر رہے ہیں، میرے ہاں یہ اژدہا پیدا ہوا ہوتا تو کتنے مزے میں گذرتی ہم دونوں کی، لوگ نور جہاں اور جہانگیر کو بھول جاتے، لیکن اس نا شدنی نے پیدا ہو کر کہیں کا نہ رکھا!"

مریم پاس آ کر بیٹھ گئی،

"خدا کے لئے کچھ تو بتاؤ کیا معاملہ ہے؟"

امجد میاں نے ایک آہ سرد کے ساتھ کہا۔

"بس اب پولیس ہی آ کر بتائے گی سب کچھ، جب صاحبزادہ خوش اطوار کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں ہوں گی، اور وہ کشاں کشاں حوالات میں داخل ہوں گے، پھر عدالت سے چوری اور .... نقب زنی کے جرم میں کم از کم پانچ سال کی سزا ہو گی، اعانت جرم کے سلسلہ میں بوڑھی ماں، اور بوڑھے باپ کی گرفتاری بھی عمل میں آئے گی اور پھر ہم دونوں بھی نذر حوالات کر دیئے جائیں گے، آہ ـــــ وہ مرا پہلے پہل زنداں

ہوتا ۔۔۔۔ سجاد تمند بیٹے، خدا تجھے عمر خضر عطا کرے خوب نام روشن کیا تو نے خاندان کا ۔۔۔۔ بی بی سُنا ہے پولیس والے کوڑے مار کر اقرار جرم کراتے ہیں، کیا تو کوڑے کھا سکے گی میری گلبدن ؟ ۔۔۔۔ خدا غارت کرے اس گلبدن کو، سارا فتنہ اسی کا ہے !"

مریم نے دیکھا شوہر صاحب کسی طرح راہِ راست پر نہیں آتے تو اس نے آخری حربہ استعمال کیا ۔۔۔۔ رونے لگی !

لیکن امجد میاں اب بھی راہ راست پر نہیں آئے، البتہ یہ ضرور کیا کہ خود بھی بیوی کے ساتھ رونے لگے ۔

مریم نے دیکھا یہ آخری حربہ بھی ناکام ہوا تو خوشامد پر اتر آئی ۔

" للہ رحم کرو، میں ہول رہی ہوں، میرا دم نکلا جا رہا ہے !"

امجد نے ایک نظر بیوی کو دیکھا اور کہا ۔

" آہ ۔۔۔۔ ہائے !"

اور پھر انہوں نے بڑے دردناک طریقہ پر ساری رام کہانی سنادی ۔ یہ واقعات سُن کر مریم کا بھی خون خشک ہو گیا، اُس نے کہا ۔

" یہ تو بہت بُرا ہوا، اب کیا ہو گا، ایک ہی لڑکا ہے خدا کے لئے اسے سنبھالو، ورنہ بالکل ہاتھ سے نکل جائے گا !"

امجد میاں نے فرمایا ۔

" یہی سوچ کر تو صمد کو جال میں پھنسا رہا تھا کہ غزالہ سے حرامزادے کی شادی ہو جائے مفت میں روپیہ الگ ہاتھ آتا، خوبصورت بیوی الگ ملتی، غزالہ جیسی بیوی پا کر یقیناً سنبھل جاتا، لیکن وہ نا یدان کا کیڑا تو گلبدن پر اس طرح لٹو ہو رہا ہے کہ دیکھ لو، غزالہ کا ہار چرا لایا اور اس کی بھینٹ چڑھا دیا، تمہی بتاؤ کیا منہ لے کر جاؤں صمد کے پاس ؟"

مریم نے ایک نئی روشنی دکھائی،

یہ تو ٹھیک ہے کہ نسیم نے بڑی نالائقی کی، لیکن صمد کو کیا معلوم کہ ہار نسیم نے چرایا ہے، شبہ یا تو گھر کی کسی خادمہ پر ہو گا یا سلمٰی پر، میری رائے تو

یہ ہے کہ تم جاؤ ڈوب مرنے کے لئے، اور سارا الزام سلمیٰ کے سر اس خوبصورتی سے تھوپو کہ جو سر پر منڈلا رہا ہے اس سے بھی نجات ملے، سُنا ہے موا پاس بھی ہو گیا بی اے میں!"

امجد میاں مراقبہ میں بیٹھے مریم کی باتیں سنتے رہے، سر اٹھایا تو چہرہ پر رونق تھی، جیسے کوئی بہت بڑی نعمت مل گئی ہو، سارا غصہ بھول گئے، ساری برہمی کافور ہو گئی ہنستے ہوئے فرمایا،

"بھئی خوب، بہت خوب ——— ہم تو مرشد تھے تم ولی نکلیں! وہ بات سوچی ہے کہ مزا آ گیا، کل ہی فیروزہ آیا دجاتا ہوں، اور کھڑے کھڑے نہ سلمیٰ کو ذلیل کر کے نکلوایا ہو، جب کی بات!"

مریم خوش ہو گئی،

"ہاں یہ ٹھیک ہے! صبح اُٹھتے ہی چلے جاؤ!"

(۹)

اب امجد کے اوسان بحال ہو چکے تھے، اُٹھ کر بیٹھ گئے، پھر رازدارانہ لہجہ میں فرمایا،

"لیکن بات یوں نہیں بنے گی بھائی!"

مریم نے پوچھا،

"پھر کس طرح بنے گی؟"

"کچھ خرچ کرنا پڑے گا!"

"یہ کیوں؟"

"میں چاہتا ہوں سلمیٰ کی تلاشی لوں اور چپکے سے آنکھ بچا کر اس کے بکس میں ہار ڈال کے برآمد کر دوں، گویا چور پکڑ لیا، پھر اسے چلتا کر دینا کیا مشکل ہے؟"

"تدبیر تو بڑی اچھی ہے! —— لیکن ہار کس طرح ملے گا؟ وہ تو بک بھی گیا؟"

"ارے بھئی روپے میں بڑی طاقت ہوتی ہے، ابھی جاتا ہوں قادر زرگر کے پاس، دو ہزار میں اس نے خریدا ہے، سوا دو ہزار میں خوشی سے بیچ دے گا —— لیکن اتنے روپے کہاں سے آئیں گے؟"

مریم بگڑ گئی،

"اب زیادہ مت بنو۔ بڑے کنگال ہو، سوا دو ہزار کے پیچھے لڑکے کی زندگی غارت کردو گے؟ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ سوا دو ہزار خرچ کر کے کتنے لاکھ کما لو گے، صمد کی دولت کی کوئی تھاہ ہے؟"

بات امجد میاں کے دل میں بیٹھ گئی، اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"اچھا میں ابھی آیا!"

تیر کی طرح امجد میاں قادر زرگر کے ہاں پہنچے، اس نے حسبِ عادت ہاتھوں ہاتھ لیا، امجد نے کہا۔

"قادر بھائی، ذرا وہ ہار تو دکھانا جو تم نے آج خریدا ہے!"

قادر نے تجوری سے ہار نکال کر سامنے رکھ دیا۔

امجد میاں نے اُسے اُلٹ پلٹ کر دیکھا، اسے دیکھنے اور محویت برقرار رکھتے ہوئے پوچھا۔

"بیچو گے اُسے؟"

قادر ہنسا،

"پسند آگیا میاں کو؟"

امجد نے اقرار میں گردن ہلائی،

"ہاں بھئی ——— یہ ہار تمہارے بھتیجے تسبیم کی دولہن کو دوں گا!"

قادر نے آمادگی کے ساتھ کہا۔

"خوب سوچا میاں آپ نے، واقعی بڑا اچھا تحفہ رہے گا!"

"تو بتاؤ کیا لو گے؟ ——— یاد رہے تمہارے بھتیجے کے لئے خریدا جا رہا ہے!"

قادر زرگر نے کہا۔

"بھتیجے کا نام لے کر آپ میرا امتحان لینا چاہتے ہیں، جیسا آپ کا لڑکا ویسا میرا، میری طرف سے یہ نذر ہے!"

اگر امجد میاں کو یقین ہوتا قادر کے یہ الفاظ صداقت پر مبنی ہیں تو یہ نذرانہ وہ قبول کر لیتے، لیکن جانتے تھے، خالی خولی باتیں ہیں۔

"تمہاری محبت سے یہ بعید تو نہیں ــــ لیکن بھائی ہم تمہارا نقصان بھی نہیں چاہتے۔ جو کہو وہ دے دوں!"

قادر نے سوکھا سا منہ بنا کر کہا۔

"آپ ہی نے اس کی قیمت تین ہزار لگائی تھی، بس تین ہزار دے دیجئے!

تین ہزار کا نام سُن کر امجد میاں کے سر سے لگی پاؤں میں بجھی، دل ہی دل میں سینکڑوں گالیاں دے ڈالیں، لیکن مسکراتے ہوئے کہا۔

"خود تو دو ہزار میں خریدا ہے، بھتیجے سے ہزار روپیہ نفع کماؤ گے؟ کیوں بھائی؟"

قادر ہنسنے لگا۔

"بخشش سوسو، حساب جو جو، مفت اب بھی دینے کو تیار ہوں، لیکن بیچوں گا تو نفع ضرور لوں گا۔ چلیئے پانچ سو کم کئے دیتا ہوں، ڈھائی ہزار دے دیجئے!"

امجد میاں نے ہار جیب میں رکھ لیا، اور دو ہزار دو سو روپے کے نوٹ قادر کی طرف بڑھا دیئے، قادر نے نوٹ گنے، پھر کچھ احتجاج کرنا چاہا تھا کہ امجد نے ٹوکا۔

"قادر بھائی بس ــــ اب کچھ نہ کہنا، اور اگر کہنا بھی ہے تو لاؤ روپے واپس دو، میں تحفہ کے طور پر یہ ہار قبول کرتا ہوں!"

قادر ہنسنے لگا، روپے اس نے جیب میں رکھ لئے۔

امجد میاں نے ہار لیا اور گھر واپس آئے، اتفاق کی بات نسیم بھی اسی وقت آگیا، امجد میاں نے بڑے پیار سے بلایا۔

"نسیم ذرا سننا تو!"

نسیم آکر سامنے کھڑا ہو گیا، امجد میاں نے جیب سے ہار نکالا اور دکھاتے ہوئے کہا۔

"پہچانا"

نسیم کا چہرہ سفید پڑ گیا، امجد کا مزاج یک دم پلٹ گیا۔

"ناخلف دُور ہو جا سامنے سے!"

نسیم نے کوئی جواب نہ دیا، چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا گیا، اس کے

جانے کے بعد، امجد نے مریم سے کہا۔

"اس کا چہرہ دیکھا تھا تم نے؟"

وہ بولی۔

"ہاں ــــ کیوں؟"

امجد نے پوچھا۔

"پھٹکار برس رہی تھی اس چوٹے کے منہ پر یا نہیں؟"

مریم نے نرم لہجہ میں کہا۔

"اب گڑے مُردے کیوں اُکھاڑتے ہو جو ہوتا تھا ہو گیا، خواہ مخواہ جی نہ خراب کرو، ٹھنڈے ٹھنڈے صبح ہوتے ہی روانہ ہو جاؤ، تمہارے پیچھے میں لڑکے کو اچھی طرح اُونچ نیچ سمجھا دوں گی، جوانی میں سب ہی ایسا کرتے ہیں۔ تم بھی کون سے ولی تھے؟ شادی ہو جائے گی راہِ راست پر آ ہی جائے گا!"

امجد میاں نے لقمہ دیا۔

"جیسے میں آ گیا!"

مریم ہنس دی۔

"ہاں اور کیا!"

(۱۰)

اکیلے میں جا کر مریم نے خوب خوب نسیم کو دھانسا، اسے لعنت ملامت کی، نشیب و فراز سمجھائے اور ہاتھ جوڑ کر آئندہ کم از کم اس وقت تک کیلئے جب تک غزالہ سے شادی نہ ہو جائے، محتاط رہنے کی التجا کی، اور دودھ نہ بخشنے کی دھمکی دے کر فی الحال گلبدن سے دُور رہنے کا مطالبہ کیا "فی الحال" اور "کم از کم" کی رعایت مریم نے اس لئے رکھی تھی کہ جانتی تھیں لڑکا بے قابو ہے، زیادہ اصرار کیا گیا تو وہ ہتھے سے نکل جائے گا، لہذا نہ اس کا رشتہ ماضی سے توڑا، نہ حال کے لئے محتاط رہنے کے سوا کوئی پابندی عائد کی اور مستقبل کا جہاں تک تعلق تھا، خوب سبز باغ دکھائے۔

کوئی اور وقت ہوتا تو شاید نسیم ماں کی التجاؤں کو ٹھکرا دیتا جیسا اس سے پہلے وہ بارہا کر چکا تھا، لیکن اس وقت وہ تعمیل پر مجبور تھا، ہار کا قادر زرگر کے ہاں فروخت ہونا، وہاں سے امجد میاں کا رقم خطیر دے کر خرید لانا، دوسرے الفاظ میں اتنے بھیانک طور پر اس کی چوری کا راز افشا ہونا، ایسا حادثہ تھا جس نے اُسے بہت شرمندہ کر دیا تھا، گلبدن پر بھی اُسے بہت غصّہ آ رہا تھا، چنانچہ ماں کی التجاؤں کے جواب میں ہاں ہوں کر کے وہ کسی بہانہ سے باہر گیا، اور وہاں سے سیدھا گلبدن کے ہاں پہنچا۔

اس موٹی اسامی کی بڑی قدر گلبدن اور اس کے گھر والے کرتے تھے،

چنانچہ جیسے ہی وہاں پہنچا، ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، گلبدن اپنے ڈریسنگ روم میں بیٹھی فتنہ سے قیامت بننے کی تیاری کر رہی تھی، اتنے وقت اور اس طرح بھبوکا بنا اسے آتا دیکھ کر وہ گھبرا گئی، اس نے نسیم کا استقبال کرتے ہوئے تبسم کی بجلیاں گرائیں، پھر ایک ادائے دلنوازکے ساتھ گویا ہوئی۔

"ایسے ناوقت کدھر کا راستہ بھول گئے آپ؟"

نسیم نے کوئی جواب نہیں دیا، اس کی آنکھوں سے خون برس رہا تھا، وہ کرسی پر بیٹھ گیا، اس نے کہا۔

"گلبدن میں نے تمہیں ایک طلائی ہار دیا تھا؟"

گلبدن نے فخر و نشاط کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں —— وہ مجھے بہت عزیز ہے، ایک تو اس لئے کہ آپ کا تحفہ ہے، دوسرے اس لئے کہ بیش قیمت ہے۔ میں نے اسے اپنی خاص تجوری میں حفاظت سے رکھ چھوڑا ہے!"

نسیم کو غصہ آگیا،

"جھوٹ بولتی ہو!"

اس طرح کے لب و لہجہ میں اس عاشق تفتہ جگر نے آج تک اس بت عنانہ سے بات نہیں کی تھی، اس نے حیرت سے نسیم کو دیکھا۔

"کون سا میرا جھوٹ آپ نے پکڑا ہے؟"

نسیم نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"میں اپنی عزت، وقار، ناموس، خاندان کا نام، ہر چیز خطرہ میں ڈال کر تمہیں خوش رکھنے، تمہیں خوش دیکھنے کے لئے نادر اور بیش قیمت چیزیں چرا چرا کر تمہیں بھینٹ چڑھاؤں، اور تم یہ غدر کرو کہ معمولی داموں پر اصل سے کہیں کم قیمت پر قادر زرگر کے ہاں فروخت کرو —— یہی شرط وفا ہے؟ یہی شرافت ہے؟"

جواب سننے کے لئے نسیم نے گلبدن کو تکنا شروع کر دیا، وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی،

"آپ جھوٹ کہتے ہیں میرے منہ پر، آپ کو جھوٹ بولتے شرم نہیں آتی؟ میں کسی طرح بھی اپنی توہین برداشت نہیں کر سکتی!"

ان باتوں میں خود اعتمادی تھی، یقین تھا، صداقت تھی، نسیم کا غصہ متزلزل ہونے لگا، پھر ہار کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔

"میں جھوٹ بول رہا ہوں؟"

"ہاں ـــــ سفید جھوٹ!"

"ہار تمہارے ہی پاس ہے؟"

"نہ کیوں ہوتا؟"

"کیا مجھے دکھا سکتی ہو؟"

"نہ صرف دکھا سکتی ہوں بلکہ واپس بھی کر سکتی ہوں، ایسے چھچھورے آدمیوں کا کوئی تحفہ اپنے پاس رکھنا باعثِ ننگ و عار سمجھتی ہو؟"

یہ کہہ کر وہ غصہ میں کانپتی ہوئی اٹھی، جب تجوری میں اس نے کنجی ڈالی تو نسیم کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

"اگر ہار نکل آیا تو؟"

اتنے میں تجوری کا آہنی دروازہ اُس نے غصّہ کے عالم میں زور سے کھولا، اندر ہاتھ ڈالا، لیکن ہار ہے کہ کسی طرح نکلتا ہی نہیں، ہار کی تلاش میں مصروف و سرگرداں، نسیم دیکھ رہا تھا، جس چہرے پر ابھی غصہ کی سُرخی تھی اب وہ دہشت سے سفید پڑ گیا تھا، وہ سمجھ گیا، یہ حرکت گلبدن کی نہیں کسی اور کی ہے۔ اس نے دل ہی دل میں گلبدن کو معاف کر دیا، نہ جانے اس الھڑ نازنین میں کیا بات تھی کہ وہ اس کے سامنے مرعوب ہو جایا کرتا تھا اس نے کہا:

"واپس آ جاؤ گلبدن ہار گیا!"

گلبدن نے تجوری ویسی ہی کھلی چھوڑی، خستہ اور نڈھال ہو کر کرسی میں دھنس گئی اس کی آنکھیں پرنم ہو رہی تھیں۔

"کیا ہو گیا؟ کون لے گیا؟ میں تو کہیں کی نہ رہی!"

وہ رونے لگی!

نسیم نے اُسے تسلّی دی، اپنی چوری اور آج کی ذلت کی ساری داستان سنائی پھر اس کی دل دہی کرتے ہوئے کہا۔

" روتی کیوں ہو؟ جب تک میں زندہ ہوں، ذرا پروا نہ کرو!! اس سے بہتر ہار لاکر اپنے ہاتھ سے تمہارے گلے میں نہ پہناؤں، تب کی بات ——— غزالہ کے سارے زیور گلبدن کے جسم نازنین پر نظر آئیں گے!"

خوشی سے گلبدن کی آنکھیں چمکنے لگیں، اس کے پژمردہ چہرہ پر رونق آگئی، لیکن اس چوری کی کھٹک دل میں موجود تھی۔ "بہر اع بھی تو لگنا چاہیئے یہ حرکت کس کی ہے؟ ——— مصیبت یہ ہے کہ پولیس میں بھی اطلاع نہیں دے سکتی بدنامی ہے!"

"میری بدنامی کی فکر نہ کرو، چور گھر ہی میں ہے!"

"(چونک کر) کون ہے وہ!"

"عنایت ——— !"

جیسے کسی نے دہکتا ہوا انگارہ گلبدن کے دل پر رکھ دیا۔

" وہ ایسا نہیں ہے!"

نسیم نے خود اعتمادی کے لہجہ میں کہا۔

" اس کے سوا کوئی ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔ اسے بلواؤ میں ابھی قبلوالوں گا!"

"کیا مارو گے اسے؟"

" (ہنس کر) نہیں ——— وہ تو گلبدن کا بھائی ہے، میں گلبدن کے کتے پر بھی ہاتھ نہیں اٹھا سکتا، لیکن تمہاری آنکھیں کھول دینا چاہتا ہوں! دیر نہ کرو اسے بلاؤ!"

گلبدن اُٹھی اور اپنے دروازے پر کھڑے اس نے آواز دی۔

"عنایت ——— "

سامنے کے دوسرے کمرہ سے آواز آئی،

" کیا ہے؟"

گلبدن نے کہا،

"یہاں آؤ، ایک ضروری کام ہے!"

اس نے وہیں سے جواب دیا۔

"شیو کر رہا ہوں!"

نسیم نے یہ سوال و جواب سُن لیا تھا، وہ اُٹھ کھڑا ہوا، اس نے گلبدن کا دستِ نازک اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور گویا ہوا۔

"چلو وہیں چلتے ہیں!"

گلبدن انکار نہ کر سکی، نسیم کے ساتھ عنایت کے کمرہ میں پہنچی، اس نے گلبدن کو دیکھ کر کہا۔

"آتو رہا تھا!"

پھر نسیم کو دیکھ کر چونک پڑا، نسیم کو دیکھتے ہی ایک مجرم کی طرح اس کا چہرہ زرد ہو گیا، نسیم نے بھلمنساہت کے ساتھ پوچھا۔

"کیوں میاں عنایت قادر زرگر کو جانتے ہو؟"

عنایت لرز گیا۔

"قا ــــ در ــــ زرگ ــــ"

نسیم نے کہا۔

"ہاں ہاں وہی ــــ ارے بھئی وہی جس کے ہاں تم نے کل، اپنی بہن کا ہار فروخت کیا تھا جا کر بھول گئے؟"

عنایت پر لرزہ طاری ہو گیا،

"ہا ــــ ہار ــــ"

نسیم نے کہا۔

"ہاں بھئی ہار، وہی جو میں نے گلبدن کو دیا تھا ــــ مالِ حرام بود بجائے حرام رفت، میں نے گھر سے چوری کر کے گلبدن کو دیا تم نے اُسے اُڑا لیا، اور قادر زرگر کے ہاتھ بیچ آئے!"

عنایت کے کاٹو تو لہو نہیں بدن میں!

گلبدن نے زندگی میں پہلی مرتبہ وہ حرکت کی، جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، یک بیک وہ آگے بڑھی اور اس نے تڑاق سے ایک

طمانچہ عنایت کے منہ پہ لگایا، عنایت نے ذرا بھی مزاحمت نہ کی، اس کی آنکھوں میں آنسو ٹپکنے لگے۔

نسیم نے گلبدن کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔

" یہ کیا کرتی ہو!"

گلبدن نے کہا۔

" مر بھی نہیں جاتا، نمک حرام، کام کا نہ کاج کا، موا چور، اُچکا اٹھائی گیرا"

تسیم نے روکا۔

" بس بہت ہولیا، اب ان باتوں سے کیا فائدہ، گئی ہوئی چیز واپس نہیں آسکتی، تم سے زیادہ مجھے صدمہ ہے، میری جو ذلت ہوئی اس کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا، لیکن تمہاری خاطر چپ چاپ میں نے سہ لی، میری خاطر تم عنایت کو معاف کردو!"

پھر اس نے کہا۔

" دیکھو میاں عنایت، یہ لچھن جیل جانے کے ہیں، پولیس کی گرفت میں آگئے، تو جیل میں سڑو گے، کوئی مدد نہ کر سکے گا، گلبدن اگر پولیس کی نظر میں آجائے گی، اس کا اس جگہ ٹکنا محال ہو جائے گا!"

پھر اس نے گلبدن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

" آؤ ــــــ اپنے کمرہ میں چلو!"

(۱۱)

امجد میاں کے لئے رات کاٹنا دو بھر ہوگئی۔ صبح تڑکے ہی وہ پہلی ٹرین سے فیروز آباد روانہ ہو گئے، دو گھنٹہ کا راستہ تھا، کوئی نو بجے کے قریب وہ فیروز آباد میں تھے، صمد دوکان جا چکا تھا، غزالہ کالج جانے کی تیاری کر رہی تھی، سلمٰی گھر کے دھندے میں لگی تھی، یوں اچانک امجد میاں کو آتا دیکھ کر سلمٰی اور غزالہ دونوں کو حیرت ہوئی۔ دونوں اپنے دل میں سہم سی گئیں، ضرور کوئی خاص بات ہے۔ ہمیشہ کے برعکس آج امجد میاں کا موڈ بھی بدلا ہوا تھا اگرچہ اپنی اندرونی کیفیت چھپانے کی پوری کوشش کر رہے تھے، رنگ رُخ بتا رہا تھا، بہت برہم ہیں اور کوئی خاص پروگرام لے کر آئے ہیں۔

غزالہ کو دیکھ کر وہ آگے بڑھے، اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''کیوں بیٹی اچھی تو رہیں؟''

اس نے سر جھکا کر کہا۔

''تایا جی بالکل اچھی ہوں، آپ یکایک کیسے آگئے؟''

امجد نے پیار بھری نظروں سے اُسے اور خوں خوار نظروں سے سلمٰی کو دیکھا، اور بولے۔

''تیرے دیکھنے کو طبیعت بے قرار تھی، میں نے کہا ذرا خبر لے آؤں جا کر صمد میاں دوکان گئے؟''

غزالہ نے جواب دیا۔

"جی ہاں ابھی گئے ہیں، ذرا دیر پہلے!

امجد میاں نے انگرکھا پہنتے ہوئے کہا۔

"ذرا میں بھی بازار تک ہو آؤں، کچھ خریداری کرنی ہے۔ صمد کے آنے تک آجاؤں گا!"

غزالہ خاموش ہو رہی وہ چلے گئے، جاتے جاتے ایک نظر پھر انہوں نے سلمیٰ پر ڈالی، ان نگاہوں میں شعلے ناچ رہے تھے۔

امجد کے جانے کے بعد غزالہ ایک آرام کرسی پر دراز ہو گئی۔ سلمیٰ نے پوچھا۔

"کالج نہیں جاؤ گی؟"

وہ بولی،

"نہیں"

"کیوں؟ ابھی تو جا رہی تھیں!"

"جی ہاں اب ارادہ میں نے بدل دیا ہے!"

"طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

وہ مسکرائی

"جی ہاں ——— لیکن آج خیریت نظر نہیں آتی!"

سلمیٰ سہم گئی،

"سر درد کر رہا ہے؟"

"نہیں چچی ——— آپ بڑی نیک اور بھولی ہیں، آپ نے تایا جی کے چہرے پر بجلیاں چمکتی نہیں دیکھیں، میں نے دیکھی ہیں، آپ نے ان کی آنکھوں میں شعلے ناچتے نہیں دیکھے، میں نے دیکھے ہیں!"

سلمیٰ اور زیادہ پریشان ہو گئی،

"خدا خیر کرے!"

غزالہ نے کہا،

"..یہی دُعا میری ہے ــــــ دو مرتبہ تایا جی نے آپ پر نظر ڈالی آج میں نے اندازہ کیا وہ آپ سے نفرت کرتے ہیں، وہ آپ کے دشمن ہیں ــــــ چچی وہ یقیناً کوئی خطرناک منصوبہ آپ کے بارے میں لے کر آئے ہیں!"

سلمیٰ کا چہرہ زرد پڑ گیا، غزالہ نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن آپ پریشان کیوں ہوتی ہیں؟ ــــــ جس کا حامی ہو خدا اس کو مٹا سکتا ہے کون؟ اب تک میری زبان پر تالے پڑ رہے تھے، لیکن اب میں خاموش نہیں رہ سکتی، اب تک میں نے تایا جی کے سامنے زبان نہیں کھولی تھی، اب کھولوں گی، اور انہیں بتا دوں گی کہ ہمارے ادب اور لحاظ سے انہیں ناجائز فائدہ اٹھانے کی زیادہ اجازت نہیں دی جا سکتی!"

"تایا جی بالکل اچھی ہوں، آپ یکایک کیسے آ گئے؟"

"ایسا نہ کرنا!"

غزالہ نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"کیوں چچی؟"

اس سے تلخی پیدا ہو گی!"

"ہوا کرے!"

"بھائیوں میں تفرقہ پڑ جائے گا!"

"پڑنے دیجئے ــــــ اور میرے خیال میں تو وہ پڑ گیا!"

"(حیرت سے) یہ کیسے جانا تو نے؟"

"اس لئے کہ وہ تفرقہ میں نے ہی ڈالا ہے!"

"کیا تم نے صمد سے بات کی تھی؟ کیا تم نے نسیم کا سارا ماجرا بتا دیا صمد کو؟"

"جی ایک ایک بات بتا دی!"

"لیکن کب؟"

"آج صبح ناشتہ کے بعد!"

"لیکن ناشتہ کے بعد تو تم اپنے کمرہ میں چلی گئی تھیں، صمد میاں دوکان جانے کی تیاری کرنے لگے تھے!"

"جی ہاں ــــ جاتے وقت میں نے ایک خط ابّا میاں کو دیا تھا، اور اس میں سارا کچا چٹھا لکھ دیا تھا، فرخ بھائی سے جو کچھ سنا تھا، وہ بھی اپنی آنکھوں سے، جو کچھ دیکھا تھا وہ بھی، اور نسیم بھائی کا آخری کارنامہ یعنی ڈکیتی بھی!"

"ہائے غضب ــــ"

"ابّا میاں نے وہ خط پڑھا اور میرے پاس آئے!"

"تیرے پاس آئے؟"

"جی میں نے خط میں لکھا تھا، نسیم بھائی کے ہاتھوں جو ذلتیں مجھے سہنا پڑی ہیں، انہیں سوچ سوچ کر میں زندگی سے بیزار ہو جاتی ہوں، جی چاہتا ہے زہر کھا کر مر جاؤں، ابّا میاں جب خط پڑھ کر آئے تو میں ضبط نہ کر سکی، آنسو بہنے لگے، وہ میری طرف بڑھے پیار سے انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا عزالہ تو میری جان ہے، زندگی ہے، روح ہے، تجھے روتا دیکھ کر میں زندہ نہیں رہ سکتا، تو نے جس صبر اور شرافت سے یہ ذلیل حرکتیں برداشت کی ہیں، وہ تیرا ہی حصہ تھا، مجھے تجھ پر فخر ہے تو میری بیٹی ہے، میں آج ہی امجد بھائی کو خط لکھ کر بلاتا ہوں، ان سے صاف صاف گفتگو کروں گا، اور کہہ دوں گا، آپ تو بزرگ ہیں، کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن اگر نسیم نے کبھی اس گھر میں قدم رکھا تو میں اسے نکلوا دینے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

"میں نے کہا ابّا میاں میں بھی چاہتی ہوں، میں نسیم کی صورت دیکھنا نہیں چاہتی اس کے تصور سے میرا خون کھولنے لگتا ہے، ابّا جی نے میری دل دہی کی، مجھے دلاسا دیا، ایسا معلوم ہوتا ہے تایا جی کو بھی سُن گُن مل گئی ہے، ورنہ اچانک نہ آتے، اور آپ کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں خون نہ اُترتا ــــ"

"(ٹھنڈی سانس بھر کر) بھائی صاحب دل کی حسرت نکال لیں، ہمارا بھی خدا ہے!"

"بے شک اُوپر خدا ہے، نیچے ہم لوگ ہیں، ہمارے ہوتے کون آپ کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ سکتا ہے ــــ لیکن کہیں بھائی صاحب صمد میاں سے ملاقات کرنے دوکان پر نہ گئے ہوں؟"

"ہاں وہیں گئے ہوں گے، ورنہ خرید و فروخت کیا رحمت پور میں نہیں ہو سکتی ہے؟"

"پھر ——؟"

"پھر کیا —— ابّا سے ان کی ملاقات ہی نہیں ہوتی کی!"

"یہ کیوں؟"

"وہ مجھ سے کہہ کر گئے ہیں کہ جس مستری سے نسیم نے کنجی بنوائی تھی، اس سے تصدیق کرتے جا رہا ہوں، وہاں سے سیدھا گھر آؤں گا، پھر امجد میاں کو تار دوں گا، پھر دوکان جاؤں گا! وہ سیدھے یہیں آئیں گے!"

"یہ تو ٹھیک ہے، لیکن میرا تو دل ہولا جا رہا ہے!"

"اچھی اماں، آپ ذرا بھی دلگیر نہ ہوں —— تماشہ دیکھنے کا تو اب وقت ایا ہے!"

"بھاڑ میں جائے ایسا تماشہ میں تو در گزری!"

"اب قدرت کا قانون حرکت میں آیا ہے، اب دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو کر رہے گا! آپ دخل نہ دیجئے، صرف بیٹھی دیکھتی رہیئے!"

"لیکن میری بچّی بھڑوں کے چھتے میں تو نے ہاتھ ہی کیوں لگایا ——؟"

"پھر کیا کرتی؟"

"صبر کرتیں، خاموش رہتیں، خدا پر چھوڑ دیتیں!"

"اتنے دنوں سے صبر ہی تو کر رہی ہوں، بہت میں نے سوچا کہ خاموش رہوں، لیکن آخر میں مجبور ہو گئی —— میں نسیم کی ساری باتیں نظر انداز کر دیتی، حتّٰی کہ ہار کی چوری کا واقعہ بھی، لیکن اس کمینے شخص نے فرخ بھائی کے مستقبل پر جس طرح کلہاڑا چلایا تھا، اسے معاف کرنا میرے بس سے باہر تھا، پھر بھی جہاں تک ہو سکا، چپ رہی آپ کی خاطر سے!"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ صمد آیا۔ اسے دیکھ کر غزالہ پھول کی طرح کھل گئی،

"آپ آ گئے؟"

اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں بیٹی آ گیا!"

وہ بولی،

"مستری سے پوچھ آئے؟"

"پُوچھ آیا، دیکھ آیا اپنی آنکھوں سے اس کے دستخط!"

"تایا جی بھی تو آئے ہیں آج!"

امجد بھائی آئے ہیں؟"

"جی ——"

"کب؟ —— کس وقت؟"

"کوئی دو گھنٹے ہوئے، معلوم ہوتا ہے کوئی نئی سکیم لے کر آئے ہیں ——!"

"یہ تم نے کیسے اندازہ کیا بیٹی؟"

"چچی اماں کے سلام کا جواب بھی ٹھیک سے نہیں دیا، اُن پر جو دزدیدہ نظر ڈالی وہ تو نفرت اور غصّہ سے بھری ہوئی تھی!"

سلمیٰ روتے لگی،

صمد نے اُسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"بھابی آپ کیوں اپنا جی تھوڑا کرتی ہیں، رونا تو اس چھوٹے بدمعاش کو پڑے گا، جو یہاں سے ڈاکہ مار کر گیا ہے، رونے کا مقام تو اس اوباش کے بوڑھے باپ اور بوڑھی ماں کے لئے ہے ——"

غزالہ بول پڑی،

"اور کیا —— آپ کا کوئی کیا کر سکتا ہے؟"

صمد نے کہا۔

"میں دوکان جاتا ہوں، کھانا وہیں بھیج دینا، بھائی صاحب اگر وہاں ہوئے تو کسی طرح انہیں یہاں بھیج دوں گا، پھر رات کو اطمینان سے باتیں ہوں گی۔ آج بہر حال فیصلہ کا دن ہے —— مروّت، ادب، لحاظ سب کو بالائے طاق رکھ کر!"

(۱۲)

صمد کے جانے کے تھوڑی دیر کے بعد امجد میاں ہانپتے کانپتے تشریف لائے، چہرے سے فکر و تشویش کے آثار نمایاں تھے، غزالہ سے فرمایا۔

"صمد میاں تو دوکان پر نہیں ہیں، وہیں سے آ رہا ہوں، انتظار کرتے کرتے تھک گیا!"

غزالہ کے ہونٹوں پر تبسم رقص کرنے لگا، اس کا جی چاہا پوچھے، آپ تو کچھ ضروری چیزیں خریدنے تشریف لے گئے تھے، لیکن چُپ رہی، اُس نے کہا۔

"کسی کام سے گئے ہوں گے، شام کو بہر حال آئیں گے۔"

انگرکھا اتارتے ہوئے بولے،

"ہاں شام کو سہی ——!"

انگرکھا اتار کندھے پر ڈالا، اور اپنے کمرہ میں تشریف لے گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد کھانا تیار ہو گیا، جو ان کے کمرہ میں بھیج دیا گیا۔ فکر و تشویش کے ان نمایاں آثار کے باوجود ماشاءاللہ خوش خوری کے معیار میں فرق نہیں آیا، ہر پلیٹ صاف کر دی۔

کھانا کھا کر قیلولہ کے لئے لیٹ گئے، جو ان کی دیرینہ عادت تھی، اور لیٹتے ہی بلّی کی طرح خرخرانے لگے،

شام کو صمد دوکان سے جلد واپس آگیا۔ امجد میاں حسبِ معمول نپاک

اور گرم جوشی سے ملے، لیکن صمد کی سرد مہری وہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکے، دن بھر چپ چاپ رہے تھے، نہ غزالہ سے کچھ زیادہ چاؤ پیار کی باتیں کی تھیں نہ سلمیٰ کو شفقت و بزرگی کے پیرایہ میں مخاطب کیا تھا، لیکن رات کو جب دستر خوان پر سب لوگ یکجا ہوئے تو ان کی بشاشت اور خوش طبعی پھر واپس آگئی، وہی غزالہ سے والہانہ تعلق خاطر، وہی سلمیٰ سے بات بات میں ہمدردی، وہی صمد کی کثرتِ کار اور مصروفیت پر اظہار حیرت و افسوس بار بار صمد کے جی میں آتا تھا کہ سلسلۂ سخن شروع کر دے۔ اصل موضوع زیر بحث لائے، پھر یہ سوچ کر رہ جاتا تھا کہ کھانے پر ایسی ناگوار باتوں کا ذکر مناسب نہیں، تھوڑی دیر کے بعد سہی!

آخر امجد میاں کے طوفان بشاشت میں کھانا ختم ہوا، اور کافی کا دور شروع ہوا، اور اسی موقع پر خود امجد میاں نے صمد کی ذہنی پریشانی رفع کر دی یعنی جس موضوع کو چھیڑنے کے لئے وہ بیقرار ہو رہا تھا، مگر جھجک جھجک کر خاموش ہو جاتا تھا، اسے خود امجد میاں نے چھیڑ دیا،

امجد میاں نے غزالہ کی طرف دیکھا، اور مسکراتے ہوئے کہا۔

"کہو بیٹی کب ہو رہی ہے تمہاری سالگرہ!"

غزالہ نے متبسم ہو کر جواب دیا،

" ابھی تھوڑے دن ہوئے تو ہو چکی ہے!"

امجد میاں نے بچوں کی طرح مچلنے اور اٹھلاتے ہوئے کہا۔

" یہ تقریب سعید جلد جلد سال میں دو تین مرتبہ منعقد ہونی چاہیئے، کیوں صمد میاں؟ —— ہاں بھئی صمد میاں ویسا ہار جو تم نے غزالہ کو دیا تھا، ایک میں بھی خریدنا چاہتا ہوں، کتنے کا تھا بھلا وہ ——؟"

صمد نے مختصر سا جواب دیا۔

"تین ہزار کا!"

امجد میاں گویا خرید ہی تو رہے تھے!

"کوئی مضائقہ نہیں —— بیٹی غزالہ ذرا لانا تو، دیکھوں تو سہی وہ

تین ہزار کا ہار !"

کوئی اور وقت ہوتا، اور امجد میاں نے یہ فرمائش کی ہوتی تو وہ سہم جاتی، لیکن صمد پر وہ انکشاف حال کر چکی تھی، دل مطمئن تھا، اس نے کہا۔

" وہ تو چوری ہو گیا !"

کافی کی پیالی امجد میاں کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی، وہ اپنی نشست سے ایک بالشت اُچھل گئے۔

"کیا کہا چوری ہو گیا !"

غزالہ اور سلمیٰ دونوں نے سمجھ لیا، جس طوفان کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ وہ اب قریب تر آتا جا رہا ہے، بلکہ سر پر منڈلانے لگا ہے، غزالہ نے اپنے اوسان بحال رکھے،

"جی ہاں کسی نامراد نے چرا لیا !"

" لیکن کس نے ؟"

"کیا معلوم ؟ ——— یہ معلوم ہوتا تو چور آج جیل میں نہ ہوتا۔ لیکن خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے، دیر سویر سہی، پکڑا بہر حال جائے گا !"

یہ الفاظ سُن کر ذرا کے ذرا امجد میاں کا رنگ بدلا لیکن آن کی آن میں وہ اپنی کیفیت پر غالب آ گئے، کہنے لگے،

" ہاں ضرور ——— لیکن صمد میاں لڑکی اتنی قیمتی چیز سے محروم ہو گئی، اور تم نے کچھ نہ کیا۔"

"کیا کرتا بھائی صاحب ؟"

"تفتیش کرتے، سراغ لگاتے، پولیس میں رپورٹ کرتے !"

"جی ہاں، جی تو چاہا تھا، لیکن جگ ہنسائی کے خیال سے چھوڑ دیا۔"

"خیر یہ تو اچھا کیا، لیکن سوال یہ ہے کہ چرایا کس نے ؟"

"چور نے !" ——— غزالہ مسکراتی ہوئی بولی،

" اور وہ چور گھر ہی کا آدمی ہو سکتا ہے !" امجد میاں نے فرمایا۔

صمد نے ذرا رکھائی کے ساتھ کہا۔

"لیکن گھر کا آدمی کون ہوسکتا ہے، کس پر شبہ کیا جاتا؟" "کم از کم میں تو کسی پر شبہ کرنا نہیں چاہتا تھا!"

"بس تو پھر، چور کا حوصلہ اور بڑھے گا مزید چیزیں چروانے کے لئے تیار رہو —— (جوش کے ساتھ) مجھے اس پر اصرار ہے کہ چور کوئی گھر کا آدمی ہے!"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں بھائی صاحب؟"

"ہاں میں غلط نہیں کہتا!"

"ممکن ہے آپ کا خیال صحیح ہو!"

"جی وہ اتنا ہی صحیح ہے، جتنا اس وقت رات کا ہونا!"

"ہوگا!"

"مجھے یقین ہے وہ ہار ابھی یہیں ہے، چور کو اسے یہاں سے لے جانے اور فروخت کرنے کا موقع نہیں ملا۔"

غزالہ خوش ہو گئی۔

"پھر تو تایا جی بڑی آسانی سے میرا ہار بھی مل جائے گا اور چور بھی پکڑا جائے گا!"

"بے شک، بلا شبہ، قطعاً!"

"تو پھر دیر کا ہے کی ہے!"

"کچھ نہیں —— میں اپنی کارروائی شروع کرتا ہوں، دیکھو بھئی مروت ہر طرف میں تلاشی لوں گا!"

صمد گھبرا گیا،

"آپ تلاشی لیں گے؟ —— کس کی؟ کس پر شبہ ہے؟"

امجد میاں نے کہا،

"شبہ سب پر ہے اور کسی پر بھی نہیں، لہٰذا تلاشی کسی خاص آدمی کی نہیں سب کی لوں گا!"

"پہلے نوکروں کی باری آئے گی، اور مجھے ان پر اعتماد ہے!"

"مجھے بھی ان پر شبہ نہیں!"

" پھر کس کی تلاشی لیں گے؟ —— کیا میری؟"

" (مسکراتے ہوئے) اصول کا تقاضہ تو یہی ہے، لیکن ظاہر ہے تم خود اپنی چیز نہیں چرا سکتے!

غزالہ بول پڑی،

" چلئے میرا کمرہ دیکھ لیجئے!"

امجد نے بزرگانہ شان سے اُسے ڈانٹا،

" چپکی بیٹھی رہ!"

صمد نے کہا۔

بھائی صاحب مجھے اور غزالہ کو الگ کر دینے کے بعد گھر میں رہ کون جاتا ہے سوا بھابی کے!"

امجد میاں نے فرمایا،

" بس وہیں سے آغاز ہوگا —— !"

سلمیٰ اب تک خاموش تھی، اب اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

" آیئے دیکھ لیجئے، میری ایک ایک چیز!"

امجد میاں اٹھ کھڑے ہوئے، اب ان کا رویہ بالکل بدل چکا تھا —— بشاشت اور مسکراہٹ کی جگہ ایک عجیب بھیانک قسم کی سنجیدگی نے لے لی تھی،

" آؤ —— چوری اور سینہ زوری اسی کو کہتے ہیں —— اُٹھو!"

سلمیٰ اُٹھ کھڑی ہوئی صمد غصّہ سے کانپ رہا تھا، اس نے مداخلت کی۔

بھابی بیٹھئے —— آپ پر کون شبہ کر سکتا ہے؟"

امجد میاں بگڑ گئے،

" بھئی ہمارے معاملہ میں دخل نہ دو —— تلاشی لی جائے گی، مال برآمد ہوگا، اور ——

صمد نے کچھ کہنا چاہا کہ غزالہ اُٹھ کھڑی ہوئی،

" ابا میاں تایا جی کا شبہ رفع ہو جانا چاہیئے —— کیوں چچی آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"

سلمٰی نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"نہیں ـــــــ"

صمد حیرت سے غزالہ کو دیکھ رہا تھا، وہ بولی،

" تو آپ بیٹے پھر ـــــ بسم اللہ کیجئے ـــــ!"

صمد، امجد، غزالہ سب سلمٰی کے کمرہ میں پہنچے اور اس کی ایک ایک چیز دیکھی جانے لگی، غزالہ سایہ کی طرح امجد میاں کے ساتھ لگی تھی، کیا مجال ہے جو تل بھر کو ان سے الگ ہو جائے، یا پلک جھپکا لے غزالہ کو اپنا دم چھلا دیکھ کر امجد میاں کے اوسان خطا ہوئے جا رہے تھے، ان کا سارا پروگرام درہم برہم ہوا جا رہا تھا، وہ تیزی کے ساتھ گھوم گھوم کر صندوق، میز کی دراز، طاقچہ کارنس ہر چیز دیکھنے لگے، پھر مٹھی بند کر کے انہوں نے جیب میں رکھی اور نعرہ لگایا۔

" مل گیا ـــــ میں نہ کہتا تھا، مال یہیں ہے، چُرانے والا یہیں ہے!"

غزالہ مسکرا رہی تھی، سلمٰی کی جان پر بنی تھی، اور صمد پر حیرت کی کیفیت طاری تھی، غزالہ نے تقاضا کیا۔

" مل گیا تو کہاں ہے؟"

امجد میاں نے تمہیدی تقریر میں کہا، چور بڑا چالاک ہے، بیٹی تم نے دیکھا میں جلدی جلدی کونہ کونہ کا مشاہدہ کر رہا تھا!"

اس نے تائید کی۔

"جی میں دیکھ رہی تھی!"

"کیوں بھلا؟"

" آپ ہی جانیں!"

" مجھے یقین تھا، ہار بکس میں نہیں میز میں نہیں، الماری میں بھی نہیں کسی ایسی جگہ پر ہے، جہاں ہر شخص کی نظر پڑ سکے، اور کسی کو شبہ ہی نہ ہو کہ اتنی قیمتی چیز چرا کر یہاں رکھی جا سکتی ہے۔ یہ طاقچہ دیکھ رہی ہو؟"

"جی دیکھ رہی ہوں!"

" میں نے طاقچہ کو ٹٹولا تو کوئی چیز اُبھری اُبھری سی نظر آئی، بالکل کونے میں!"

"تو کیا وہیں ہے میرا ہار ——"

"ہاں بیٹی!"

جیب میں ہاتھ ڈال کر

"یہ دیکھو، یہ ہار!"

لیکن جب ہاتھ جیب سے نکلا، تو وہ خالی تھا، غزالہ کو ہنسی آگئی۔

"کیا اس شاطر چور نے آپ کی جیب پر بھی ہاتھ صاف کر دیا تایا جی!"

"تایا جی کا ایک رنگ آ رہا تھا، ایک جا رہا تھا، ہار واقعی ان کی جیب میں نہیں تھا، مداری کی طرح انہوں نے جیتنے کر تب دکھلائے تھے وہ رائیگاں جا رہے تھے، ایک کراہ کے ساتھ انہوں نے کہا۔

"سازش ——"

صمد اب خاموشی پر قابو نہ رکھ سکا، اس نے کہا۔

"بھائی صاحب ممکن ہے سازش ہی ہو، لیکن وہ ہار اگر ہوگا، تو رحمت پور میں ہوگا، وہاں تلاش کرنا چاہیئے آپ کو ——!"

چونک پڑے امجد میاں،

"رحمت پور میں؟ یعنی میں چرا لے گیا؟"

"نہیں —— تسیم کی حرکت ہے یہ!"

امجد میاں غصّہ سے کانپنے لگے۔

"غلط ——"

صمد نے زور دے کر کہا۔

"مان لیجیے، ورنہ میں ثبوت بھی رکھتا ہوں، وہ مستری جس سے نسیم نے غزالہ کی تجوری کی چابی بنوائی تھی، وہ دستخط جو تسیم نے اس کے رجسٹر پر کئے تھے۔"

امجد میاں سر پکڑ کر بیٹھ گئے —— خاموش ——!

(۱۳)

امجد کچھ دیر سر جھکائے بیٹھا رہا، پھر اس نے ترش لہجہ میں کہا،

" میں سمجھ گیا سازش ہے، یہ ساری شرارت فرخ کی ہے، یہ ماں بیٹے ہم بھائیوں میں پھوٹ ڈالنا چاہتے ہیں، لیکن سلمٰی تم اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتیں، صمد میرا بھائی ہے، میرا چھوٹا ہے، میرا بچہ ہے، وہ مجھ سے ترک تعلق نہیں کر سکتا، وہ کر بھی لے، میں نہیں کر سکتا —— سلمٰی ایک دن تمہیں پشیمان ہونا پڑے گا۔"

سلمٰی نے بے کسی کے ساتھ صمد کی طرف دیکھا، پھر امجد سے کہا،

" بھائی صاحب میں نے تو کچھ نہیں کیا!"

امجد نے سلمٰی کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔

" بھائی صاحب میں نے تو کچھ نہیں کیا، خوب جانتا ہوں تو بس کی پڑیا ہے، یہ سارا پاکھنڈ تیرا ہی پھیلایا ہوا ہے، لیکن میرا نام بھی امجد ہے۔"

اب سلمٰی نے جرح کی،

" مگر میری خطا تو معلوم ہو؟ کیا کیا ہے میں نے؟ آپ نے چوری کا الزام لگایا، میرے کمرہ کی تلاشی لی، ایک ایک کونہ چھان مارا، پھر مٹھی بند کر کے ہاتھ جیب میں ڈالتے ہوئے اعلان کیا کہ ہار برآمد ہو گیا ہے، میرے کمرہ کے طاقچہ سے، لیکن ہاتھ خالی نکلا، میں نہیں سمجھ سکتی یہ کیا معمہ ہے؟ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے آپ گھر سے یہ فیصلہ کر کے

چلے تھے کہ مجھے چور ثابت کریں گے آپ نے نسیم سے ہار لے کر جیب میں رکھ لیا کہ یہاں میرے کمرہ سے برآمد کریں گے لیکن یا تو اگر کھا بدل گیا یا رحمت پور میں بھول آئے۔ جیب خالی تھی، اب کچھ بس نہ چلا تو مجھے صلواتیں سنا رہے ہیں آپ بڑے ہیں، میں کچھ نہیں کہتی، لیکن خدا آپ سے بھی بڑا ہے، سب سے بڑا ہے، یہ فیصلہ میں اسی پر چھوڑتی ہوں وہی ہمارا فیصلہ کریگا!"

سلمیٰ کی یہ کھری باتیں سُن کر امجد کے تن بدن میں آگ لگ گئی اس نے بادل کی طرح گرجتے ہوئے صمد سے کہا۔

"سُن رہے ہو؟ —— یہ تمہارا لحاظ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا، ورنہ ابھی چوٹی پکڑ کر گھر سے نکال دیتا!"

اب صمد کو بھی غصہ آ گیا اُس نے کہا۔

بھائی صاحب حد ہو چکی اس گھر پر بھابی کا بھی اتنا ہی حق ہے، جتنا آپ کا، جتنا غزالہ کا، جتنا میرا، ان سے بڑھ کر شریف نیک اور صابر عورت میری نظر سے نہیں گزری آپ مجھے جو چاہے کہہ لیجئے، میں ان کی توہین نہیں برداشت کر سکتا ——!"

امجد نے اپنا اندرونی چہرہ چھپانے کی اب تک بڑی کوشش کی تھی، لیکن اب وہ بے نقاب ہو گیا، اس نے کہا۔

"وہ تو جس دن اس عورت نے یہاں قدم رکھا تھا، اس دن میں سمجھ گیا تھا کہ کچھ دال میں کالا ہے، بھابی ڈورے ڈال رہی ہیں، اور دیور صاحب ریجھے جا رہے ہیں، تم ایک نہیں دس شادیاں کرو، سلمیٰ کو نہیں کسی عورت کو بھی گھر میں ڈال لو، ہیں اعتراض کرنے والا کون، مجھے تو جو کچھ خیال ہے وہ غزالہ کا ہے، سوچتا ہوں اب اس کی کیا گت بنے گی، اس گھر میں تو دُنیا تاریک ہو جاتی ہے بے چاری عذرا —— قبر میں بھی اسے چین نہ ملا۔"

غزالہ کی آنکھوں میں خون اُتر آیا، اس نے کہا۔

"تایا جی آپ میرے سامنے ایسی باتیں نہ کیجئے، چچی میرے لئے سب کچھ ہیں، مجھے اپنی ماں یاد بھی نہیں، لیکن چچی نے ثابت کر دیا کہ اگر اماں زندہ ہوتیں تو بھی اس سے زیادہ کیا چاہتیں، جتنا چچی چاہتی ہیں مجھے۔"

امجد نے طنز کیا،

"چچی —— ہونہہ!"

سلمیٰ روتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی، اس نے صمد سے کہا،

"بھیّا میں معافی چاہتی ہوں، اب اس گھر میں نہیں رہ سکتی، فٹ پاتھ پر پڑ رہوں گی لیکن یہاں ایک پل نہیں ٹھہر سکتی، بھائی صاحب نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ کالک مل دی میرے منہ پر!"

غزالہ رونے لگی، اس نے سلمیٰ کا دامن پکڑ لیا۔

"چچی ——"

صمد نے کہا۔

"بھابی یہ نہیں ہوسکتا، کوئی کچھ کہے آپ کسی کی بکواس پر کیوں کان دھرتی ہیں خدا جانتا ہے آپ کیسی پاک باز ہیں، میں گواہ ہوں کہ آپ فرشتہ سیرت ہیں، غزالہ معترف ہے کہ آپ کا دامن اس کے لئے دامنِ مادر ہے!"

پھر وہ امجد سے مخاطب ہوا، اس نے کہا،

بھائی صاحب اب مختصر اور صاف الفاظ میں میرا فیصلہ سُن لیجئے۔ ہمارے تعلقات آج سے منقطع ہوتے ہیں، آپ سمجھ لیجئے گا کہ صمد مر گیا، میں سمجھ لوں گا کہ میرا کوئی بھائی نہ تھا، بڑے دُکھ سے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے، لیکن اس پر میں قائم رہوں گا۔ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے!"

امجد میاں کھڑے ہوگئے۔

"تو ہم بھی پیشاب کرتے ہیں اس گھر پر لعنت بھیجتے ہیں اب یہاں آنے والے پر!"

یہ کہہ کر انگرکھا اُٹھایا اور تشریف لے گئے، صمد اپنے کمرہ میں چلا گیا، اس کے جانے کے بعد غزالہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"چچی ادھر دیکھئے ——"

سلمیٰ نے نظر اٹھائی تو غزالہ ہار لئے کھڑی تھی،

سلمیٰ کے منہ سے بے ساختہ نکلا —— "ارے ——"

اتنے میں صمد بھی کسی کام سے آگیا، اس نے دیکھا سلمیٰ تصویرِ حیرت

بنی ہوئی ہے، غزالہ کھڑی مسکرا رہی ہے، اور اس کے ہاتھ میں وہی گمشدہ ہار ہے، اسے بھی بڑی حیرت ہوئی، اس نے پوچھا،

"یہ کہاں سے آگیا تمہارے پاس؟"

غزالہ ہنسنے لگی، اس نے کہا،

"یہ وہی ہار ہے جسے تایا جی گھر سے جیب میں رکھ کر لائے تھے، جو انہیں چچی کے طاقچہ میں مل گیا تھا لیکن جیب میں رکھتے رکھتے غائب ہو گیا تھا۔ ——— آپا جی ہوا یہ کہ تایا جی کو دیکھتے ہی میں سمجھ گئی کچھ دال میں کالا ہے، وہ یکایک کیوں آئے، کھوئے کھوئے سے کیوں ہیں چچی اماں کو قاتلانہ نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہیں؟ دل نے کہا یہ کوئی اسکیم لے کر آئے ہیں، لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا، دوپہر کا کھانا کھا کر تایا جی سو گئے، خرّاٹے لینے لگے، میں کسی کام سے ان کے کمرہ میں گئی، انگرکھا دروازہ پر لٹکا ہوا تھا۔ تنزیب کا انگرکھا تھا جیب پر نظر گئی، تو ہار رکھا ہوا نظر آگیا، چپکے سے میں نے نکال لیا ——— کچھ یہ چوری تھوڑے تھی، تھا تو میرا ہی ——— پھر جب وہ چچی کے کمرے کی تلاشی لینے گئے تو یہ فیصلہ کر کے کہ وہاں سے ہار برآمد کر دیں گے، میں سایہ کی طرح ساتھ ساتھ لگی رہی، جیب میں ہاتھ ڈال کر نکالنے کا موقع نہ ملا، آخر یہ بہانہ کیا کہ طاقچہ میں مل گیا ہے لیکن جیب میں ہاتھ ڈالا تو خالی ——— آپ نے دیکھا نہیں۔ کتنے چکرائے تھے، لیکن اب کرتے کیا؟ ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔"

یہ داستان سن کر سلمیٰ مسکرانے لگی، صمد نے ایک قہقہہ لگایا۔

"شریر کہیں کی!"

---

(۱۴)

امجد رحمت پور واپس پہنچ گیا!

مریم نے صورت دیکھتے ہی اندازہ کر لیا ہارا ہوا جواری سب کچھ کھو کر واپس آیا ہے۔

امجد نے پوٹلی ایک طرف رکھی، چھڑی ایک طرف، انگرکھا یونہی چارپائی پر پھینک دیا، پاؤں لٹکائے لٹکائے تکیہ سے ٹیک لگا کر لیٹ گیا اور چھت کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگا، پھر ایک ایک لفظ پر زور دے دے کر رک رک کر گویا ہوا۔ ؎

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام اک مرگ ناگہانی اور ہے!

بیٹا تسنیم شاباش، کہیں کا نہ رکھا، تم نے اپنے بوڑھے باپ کو، ہم نے تمہارا مستقبل سنوارنا چاہا، تم نے اپنا حال بگاڑ لیا!

مریم نے اس طویل تقریر پر ذرا بھی توجہ نہ کی، پوچھا،

"صمد سے کچھ باتیں ہوئی تھیں؟"

امجد نے کہا۔

"ہاں بھئی وہیں سے تو جوتے کھا کر واپس آ رہا ہوں —— اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی؟"

"کچھ اہی ہوئے ہو؟ کیسی باتیں کرنے لگے!"

"جو کسر رہ گئی ہے، تم پوری کر لو، اُتاروں ٹوپی ؟"

"(ہنس کر) واہ!"

"(اچھلا کر) سبحان اللہ ـــــ کسی کی جان گئی، آپ کی ادا ٹھہری!"

"نہیں بتاؤ گے کیا گزری ؟"

"میں نے تو سب کچھ بتا دیا، تم نے نہ سننے کی قسم کھالی ہے، تو میں کیا کروں ؟"

"ارے بھائی وہاں گیا تو فضا ہی بدلی ہوئی تھی، وہ بالشت بھر کی لونڈیا غزالہ اس صفائی سے اس نے میری جیب سے ہار اُڑا یا ہے کہ میں تو منہ دیکھتا رہ گیا!"

"کیا کہا اس نے ہار اڑا لیا تمہاری جیب سے ؟"

"ہاں ـــــ سارا پروگرام درہم برہم ہو گیا، شرمندگی الگ ہوئی!"

"لیکن کس طرح ؟"

"کیا معلوم ؟ میرے سوتے میں اس نے یہ حرکت کی ہوگی!"

"پھر تو سلمیٰ پر آنچ بھی نہ آسکی ہوگی ؟"

"بالکل نہیں، سارا الزام نسیم پر ثابت ہو گیا!"

"نسیم کا کیا ذکر ؟"

"یہ ہمارے تو یہ تمہارے نسیم صاحب جو ہیں، بنتے بڑے چار سو بیس ہیں، لیکن ہیں بڑے اناڑی، غزالہ کی تجوری کی چابی بنوائی، اور مستری کے رجسٹر پر ازراہ صداقت شعاری اپنا نام نامی و اسم گرامی بھی تحریر فرما آئے تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے، چنانچہ اس سند سے یار لوگوں نے ضرورت کے وقت خوب کام لیا۔"

"(گھبرا کر) اب کیا ہوگا ؟"

"ہوگا کیا ؟ ـــــ ایک گھروندا بنایا تھا امیدوں اور آرزوؤں کا، اس ناخلف کے لئے، وہ اس نے ایک ٹھوکر میں زمین کے برابر کر دیا!"

"صمد نے یقین کر لیا!"

"کیسی باتیں کرتی ہو ؟ مستری کے رجسٹر پر دستخط دیکھ آیا، اور یقین

نہ کرتا ؟"

"تو ـــــ"

"بس اب کچھ نہیں ہو سکتا، غزالہ کی شادی فرخ سے ہو گی، میرا خیال تو یہ ہے خود غزالہ بھی اس کی طرف مائل ہے ـــــ"

"اے ہٹو بھی!"

"تو کیا جھوٹ بول رہا ہوں، یہ بال دھوپ میں سفید کئے ہیں؟ اُڑتی چڑیا کو پہچان لیتا ہوں!"

"پھر تو ایسی آوارہ لڑکی کو اپنی بہو نہ بناؤں گی!"

"جی ہاں، جیسے وہ آوارہ لڑکی مریم زمانی کی بہو بننے کے لئے خوشامدیں کر رہی ہے ـــــ احمق!"

"دیکھو مجھ سے تو تکار نہ کرنا، احمق ہو گے تم خود، میرا غصہ بہت بُرا ہے ہاں!"

"تم خود کب اچھی ہو!"

"ارے واہ تو کیا مجھ سے لڑنے آئے ہو؟"

"آخر دل کی بھڑاس بھی نکالوں کسی طرح!"

"میں ہی رہ گئی ہوں اس کے لئے؟ ـــــ تمہی ذرا دب جاتے، صمد ہے تو بھولا آدمی اسے راہ پر لگا لینا، کچھ مشکل نہ تھا!"

"نہیں بھئی اس مرتبہ وہ بالکل بدلا ہوا تھا، اس نے صاف الفاظ میں کہہ دیا، آج سے ہمارے تعلقات ختم ہوتے ہیں!"

"سچ؟"

اتنے میں نسیم باہر سے خوش خوش آتا دکھائی دیا، امجد نے جل کر مریم سے کہا۔

"صاحبزادہ ولی عہد بہادر کی سواری آتی ہے ـــــ ہوشیار!"

مریم نے پلٹ کر نسیم کی طرف دیکھا۔

"نسیم یہاں آؤ!"

نسیم سامنے آکر کھڑا ہو گیا، مریم نے پوچھا۔

"تم نے غزالہ کے سیف کی چابی مستری سے کیوں بنوائی تھی؟"

اس نے شوخی سے کہا۔

"تو کیا خود بنا لیتا؟"

امجد میاں اچھل پڑے۔

"بیٹے ادھر آؤ، تمہاری پیٹھ ٹھونکوں گا۔" ماشاء اللہ، خدا نظر بد سے بچائے کیسا ذہین بچہ ہے، کیا تڑ سے جواب دیا ہے طبیعت خوش ہو گئی، اللہ کرے زور قلم اور زیادہ!"

نسیم کا چہرہ تمتما اٹھا، وہ زور زور سے پاؤں ٹپکتا اپنے کمرہ میں چلا گیا۔

سارا دن امجد میاں نے بیکلی میں گذارا، رات بھر کروٹیں بدلتے رہے نیند نہ آئی، اب تک ان کی کوئی اسکیم ناکام نہیں ہوئی تھی، لیکن اس غزالہ کی بچی نے وہ شکست دی تھی کہ دل جل کر راکھ ہو گیا، صبح دیر سے اٹھے، ناشتہ کر کے حسب معمول باہر گئے، دوپہر کو آئے کھانا کھایا، پھر قیلولہ کو لیٹ گئے، سہ پہر کی چائے پی کر پھر باہر تشریف لے گئے، اپنے مقروضوں کا گلا گھونٹا، مختلف لوگوں سے روپے وصول کئے، اور مغرب کے وقت گھر واپس آ گئے، اب طبیعت ذرا بحال ہو چکی تھی، خوب ڈٹ کے کھانا کھایا اتنے میں نسیم آ گیا، اس نے ریڈیو کی گوشمالی شروع کر دی، خبریں سنائی جا رہی تھیں، یکا یک اناؤنسر نے اعلان کیا۔

"آج ایشیا ایر لائن طیارہ جب قیض پور کے ہوائی اڈہ سے دارالحکومت جانے کے لئے اڑا تو معاً آگ لگ گئی اور وہ ایک بھڑکتے ہوئے شعلہ کی طرح زمین پر آ رہا، طیارہ کے سب مسافر ہلاک ہو گئے، انہی میں فیروز آباد کے قومی کارکن اور تاجر مسٹر صمد بھی تھے فیروز آباد پر اداسی کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ ہر شخص اس حادثہ کو قومی حادثہ سمجھ رہا ہے۔"

یہ خبر سن کر امجد پر سناٹا چھا گیا، مریم کو چپ لگ گئی، نسیم پیکر بے جان کی طرح خاموش کھڑا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد امجد نے مطمئن لہجہ میں مریم کو مخاطب کیا،

"خدا جو کچھ کرتا اچھا کرتا ہے، صمد کے مرنے کا افسوس ہے۔ یہ اس کے مرنے کے دن نہ تھے، لیکن مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے، سب کو موت کی منزل کی طرف جانا ہے، کوئی آگے چلا گیا، کوئی پیچھے آئے گا۔"

پھر نسیم سے فرمایا۔

"تیار ہو جاؤ، صبح فیروز آباد چلنا ہے، پہلی ٹرین سے پانچ بجے چل کر ٹھیک سات بجے وہاں پہنچ جائیں گے، غزالہ کا اب اس دنیا میں کوئی نہیں صمد کے کاروبار کی دیکھ بھال بھی ضروری ہے، ہماری ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں!"

ایک ایک بات نسیم کے دل میں اتر گئی، وہ اوپر اپنے کمرہ میں گیا اور سامانِ سفر ٹھیک کرنے لگا۔

قفس

مژدہ اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے
دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

(۱)

صمد میاں کی ناگہانی وفات سے واقعی سارا قیصر آباد متاثر تھا، وہ بڑی خوبیوں کے آدمی تھے، ہر ایک کے کام آتے امورِ خیر میں سیر چشمی سے حصّہ لیتے، کسی ضرورت مند کو مایوس نہ واپس کرتے، آج ان کی یہ خوبیاں یاد آ رہی تھیں، اور کوئی ان کا جاننے والا ایسا نہ تھا، جس کی آنکھیں خون نہ رو رہی ہوں، اور" خود صمد لاج" کی حالت تو بیان نہیں کی جا سکتی، عزالہ کی بڑی بڑی آنکھیں روتے روتے سوج گئی تھیں بار بار اس پر بیہوشی کے دورے پڑتے تھے، جب وہ ہوش میں آتی، صرف ایک ہی لفظ اس کے منہ سے نکلتا۔

"میرے ابا میاں!"

اور پھر وہ کچھ نہ کہہ سکتی، رونے لگتی، سسکیاں لینے لگتی، ہچکیاں بندھ جاتیں اور پھر بیہوش ہو جاتی۔

سلمیٰ اگرچہ عزالہ کو بھول پان کی طرح لوٹ پوٹ رہی تھی، اس کے غم کے

سامنے اپنا غم بھولے ہوئے تھی، لیکن خود اس کا دل بھی، اس غم سے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا، وہ لاکھ لاکھ آنسو ضبط کرتی تھی، لیکن آنسو تھے کہ سیلِ رواں کی طرح جاری تھے، صمد سے جو رشتہ داری تھی، اس سے قطع نظر وہ اس کا محسن بھی تو تھا، اگر وہ نہ ہوتا، اگر تاریک ایام میں وہ اُمید کی روشنی بن کر نمودار نہ ہوا ہوتا، اگر اس نے سہارا نہ دیا ہوتا، اگر وہ امجد کے رحم و کرم پر چھوڑ دی جاتی، تو آج اس کا کیا حشر ہوتا؟ آج وہ کہاں ہوتی؟ آج اس کی کیسی گت بن رہی ہوتی؟ —— یہ سب باتیں جب اُسے یاد آتیں، اور اب بار بار یاد آ رہی تھیں تو اس کی حالت غیر ہو جاتی، وہ غزالہ کو ذرا دیر کے لئے بھول جاتی، اس کا جی چاہتا کہ خوب روئے اتنا روئے کہ جل تھل کر دے، لیکن اگر وہ اپنے پروگرام پر عمل کرتی تو غزالہ کا کیا حشر ہوتا؟ یقیناً اس کی حرکتِ قلب بند ہو جاتی، وہ مر جاتی، زندگی سے روٹھ جاتی،

اس وقت اگر فرخ ہوتا تو یقیناً غزالہ اور سلمیٰ کو اس کے وجود سے بڑی تقویت ہوتی، لیکن وہ یہاں سے بارہ سو میل دُور دارالحکومت میں مقابلہ کے امتحان میں شرکت کے لئے گیا ہوا تھا، اطلاع ملتے ہی اگر وہ چل کھڑا ہوتا تو بھی تین دن سے پہلے فیروز آباد پہنچنا ناممکن تھا،

غزالہ پر تو اس غم نے ایسا اثر کیا کہ سلمیٰ کو اس کی جان کی فکر ہو گئی، بار بار وہ ڈاکٹر کو بلواتی اور مسکن انجکشن دلواتی، لیکن حالت سنبھلنے کے بعد بگڑتی ہی چلی گئی، سب جانتے تھے، غزالہ صمد کو بہت چاہتی تھی، لیکن اتنا زیادہ چاہتی تھی، یہ آج معلوم ہوا!

---

(۳)

دوسرے دن صبح صبح امجد میاں اپنے نورِ نظر، لختِ جگر، اور عصائے پیری نسیم کے ساتھ فیروز آباد تشریف لائے، اور آتے ہی "صمد لاج" میں نزول اجلال فرمایا۔

یہ وہی گھر تھا، جہاں کے دروازے ابھی دو دن پہلے ان پر اور نسیم پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیئے گئے تھے، لیکن آج اس طرح کھلے کہ امجد اور نسیم اسی گھر میں ناخواندہ مہمان کی حیثیت سے نہیں مالک اور مختار کی حیثیت سے تشریف لائے تھے۔

امجد نے آتے ہی اس کمرہ میں اپنا بستر لگوایا، جہاں وہ ہمیشہ ٹھہرا کرتا تھا نسیم نے اس کمرہ میں ڈیرہ جما دیا، جو کبھی صمد کا مسکن تھا۔

امجد غزالہ کے پاس آیا اور اسے کلیجہ سے لگا کر چیخ چیخ کر بچوں کی طرح ہاک ہاک کر رونا شروع کر دیا، جیسے واقعی صمد کی موت سے اس کی آنکھوں میں دنیا تاریک ہو گئی تھی، اس نے غزالہ کو کلیجہ سے لگاتے ہوئے کہا۔

"قدرت کے کھیل ـــــ جسے مرنا چاہیئے تھا، وہ زندہ ہے، جسے زندہ رہنے کا حق تھا، وہ موت کی ابدی نیند سو رہا ہے۔"

پھر امجد کے ہونٹ پھڑ پھڑانے لگے، اس نے رومال سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"میں نے ریڈیو پر جس وقت یہ خبر سنی ہے پچھاڑیں کھانے لگا، ڈاکٹر نے آکر کئی انجکشن لگائے تب جاکر ہوش آیا۔ میں تو میں یہ لڑکا نسیم خبر سنتے ہی تیورا کر پختہ فرش پر جو گرا ہے، تو اگر کہیں مریم سنبھال نہ لیتیں تو سر کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ جب سے اس نے جو رونا شروع کیا ہے، تو اب تک آنسو نہیں تھمے ہیں، میں بھی مر جاتا، تو شاید یہ اتنا غم نہ مناتا، جتنا اس نے اپنے چچا کا منایا ہے ——!"

چند لمحوں کے بعد رومال منہ پر رکھ کر امجد نے کندھا اچکایا، گویا خوب رویا، پھر آنسو پونچھتے ہوئے، اس نے کہا۔

"صمد کے بعد یہ دنیا مجھے کاٹنے کو دوڑ رہی ہے، میں اب مر جانا چاہتا ہوں، زندگی میرے لئے بے کیف ہے، بے رنگ ہے، بے مزہ ہے، شاید میں مر بھی چکا ہوتا، لیکن بیٹی، مر بھی نہیں سکتا!"

یہ کہہ کر امجد نے پھر گریہ بے اختیار کا مظاہرہ شروع کیا، اس کے بعد بڑے درد بھرے انداز میں کہا۔

"بیٹی میں تیرے لئے زندہ ہوں —— عذرا مر گئی، صمد بھی مر گیا، اگر میں بھی مر جاؤں تو پھر کس کے سہارے تو زندہ رہے گی؟ —— تیرے لئے زندگی کا ننگ گوارا کرنا پڑ رہا ہے مجھے۔"

غزالہ کے ہوش بجا ہو گئے یہ باتیں سن کر، امجد حقیقت سے عاری، مکاری اور عیاری کی باتیں کر رہا تھا، وہ محسوس کر رہی تھی، یہ الفاظ سچ سے خالی ہیں، لیکن آنکھیں پھاڑے چپ چاپ یہ باتیں سننے پر مجبور تھی۔

امجد بہر حال اس کے مرحوم باپ کا بڑا بھائی تھا!

خاندان میں وہی سب سے بڑا، بزرگ خاندان کی حیثیت صرف اسی کو حاصل تھی۔

وہ کتنا ہی خود غرض، لالچی، حریص، طماع، اور عیار و مکّار ہو، لیکن اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا، اسے ٹھکرایا نہیں جا سکتا تھا، کم از کم فی الحال، یعنی جب تک کوئی قابلِ اعتراض اور ناقابلِ برداشت حرکت اسی

سے سرزد نہ ہو، بہرحال اسے گوارا کرنا ضروری تھا۔
باپ کا بڑا بھائی، اپنے بھائی کے ماتم میں آیا تھا۔ اُسے کس طرح گھر سے نکال دیتی؟ اور اگر وہ ایسا کرتی بھی تو دنیا کیا کہتی؟ وہ اس گھر سے نکالا جا چکا تھا۔ اس کے لئے اس گھر کے دروازے بند کئے جا چکے تھے، اس کے اور صمد کے تعلقات وفات سے ذرا پہلے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکے تھے، ان باتوں کو چھیڑنے کا، ان سوالات کو اٹھانے کا یہ موقع نہ تھا، وہ اگر بزرگ خاندان کی حیثیت سے کچھ دن یہاں رہنا چاہتا ہے، تو اس کا یہ حق چھینا نہیں جا سکتا۔

البتہ نسیم کا سوال ٹیڑھا تھا، ایک لمحہ کے لئے بھی غزالہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس گھر میں رہے، اس کے سامنے آئے، اس سے باتیں کرے، کوئی اور وقت ہوتا تو یقیناً وہ کھڑے کھڑے اُسے نکال دیتی، لیکن موجودہ فضا اور حالات میں وہ نسیم کا وجود بھی برداشت کرنے پر مجبور تھی۔ دل میں اس کے خلاف خواہ کیسا ہی طوفان اُٹھ رہا ہو، نفرت کے کیسے ہی شعلے بھڑک رہے ہوں، لیکن اس کیفیت نہاں کا اظہار کسی طرح بھی ممکن نہ تھا!

(۳۰)

امجد اور نسیم واقعی یہ معلوم ہوتا تھا بالکل بدل گئے ہیں!

امجد کا معمول یہ تھا کہ ہر روز صبح نماز فجر سے فراغت کر کے قبرستان جاتا، صمد کی قبر پر فاتحہ پڑھتا، پھر وہیں بیٹھ کر قرآن کا ایک پارہ پڑھتا، ایصال ثواب کر کے گھر واپس آجاتا، یہاں آکر کسی ملازم کو دس روپے دیتا، اس سے کہتا، اس کی ریزگاری لے آؤ، وہ ریزگاری لے کر آتا تو کہتا، اسے فقیروں میں تقسیم کر دو، شام کو عصر کے بعد پھر قبرستان جاتا، فاتحہ پڑھتا، اور مغرب کے قریب واپس آتا، اپنے اہتمام میں کئی کئی قسم کے کھانے پکواتا، اور فقیروں میں تقسیم کر دیتا۔

ایک ہی ہفتہ میں اس نے آس پاس کے لوگوں میں ایثار اور طرزِ عمل سے وہ شہرت حاصل کر لی، جو دوسرے برسوں میں بھی نہیں حاصل کر پاتے، لوگ احترام اور عزت کے ساتھ اس کا نام لیتے، اور آپس میں جب اس کی باتیں کرتے، تو کوئی کہتا۔

"بھائی ہو تو ایسا ہو!"

کوئی اور کہتا،

"حیرت ہے کہ اس زمانہ میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں!"

کوئی اور صاحب فرماتے۔

"ارے بھئی دنیا ایسے ہی لوگوں پر قائم ہے، ورنہ قیامت نہ آجاتی"۔
کوئی اور صاحب معلومات میں اضافہ کرتے،
"یہ عمر یہ بڑھاپا، مگر ہر روز سویرے سویرے قبرستان جانا، پابندی کے ساتھ وہاں قرآن کی تلاوت کرنا، ہر روز پندرہ بیس روپے کی ریزگاری فقیروں میں تقسیم کرنا، ہر روز ۲۵، ۳۰ ناداروں کو عمدہ سے عمدہ کھانا کھلانا اور وہ بھی اپنے پاس سے کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے؟"
پھر سب لوگ اس پر متفق ہو جاتے کہ
"واقعی امجد میاں انسان کے روپ میں فرشتہ ہیں!"
صمد کی زندگی میں سلمیٰ سے کیسے کیسے معرکے ہو چکے تھے۔ یہ بات تو گویا طے شدہ تھی کہ اس دنیا میں اگر سلمیٰ کا کوئی بدترین دشمن ہے، تو وہ صرف امجد میاں ہیں، لیکن بھائی کی خبر وفات سن کر جب سے تشریف لائے تھے، آج تک سلمیٰ سے کوئی دل شکن یا اہانت آمیز بات انہوں نے نہیں کی تھی، اس سے بات تو زیادہ نہ کرتے، لیکن جب بھی بولتے حد درجہ اپنائیت اور شفقت کے ساتھ، رفتہ رفتہ چند ہی روز میں اس کے دل سے وہ تمام تلخ یادیں محو ہو گئیں، جو امجد کے بُرے برتاؤ اور تکلیف دہ طرز عمل کے باعث اُسے مبتلائے فکر و تشویش کئے ہوئے تھیں، جب بھی اس سے بات کرتے اس لب و لہجہ میں جیسے ایک باپ اپنی بیٹی سے مخاطب ہو، سلمیٰ پر اس طرز عمل کا ایسا اثر ہوا کہ اس نے نہ صرف تمام پچھلی تلخیاں فراموش کر دیں، بلکہ صدق دل سے انہیں معاف بھی کر دیا اور اپنے دل میں پھر ان کی عزت و وقعت محسوس کرنے لگی،
امجد سے زیادہ حیرت انگیز تبدیلی نسیم کی تھی،

وہی نسیم جس کی بے ہودگی کے باعث غزالہ نفرت کرنے لگی تھی، اس سے اب اتنا خاموش، متین سنجیدہ اور ہمدرد شخص بن گیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا، اس کے بارے میں جو رائے قائم کی گئی تھی، وہ غلط فہمی پر مبنی تھی، ورنہ اپنی ذات سے وہ اتنا شریف اور نیک آدمی تھا کہ اس کی صرف تعریف ہی کی جا سکتی ہے۔

وہ سلمٰی کے ساتھ ادب اور لحاظ کا برتاؤ کرتا کوئی اس کا کام ہوتا، چھوٹا بن کر اصرار اور ضد کر کے اسے انجام دیتا۔

غزالہ سے بھی اس کا برتاؤ پہلے سے بالکل مختلف تھا۔

نہ چھیڑ چھاڑ، نہ شرارت اور شوخی، نہ بے تکلفی اور بے حجابی، نہ ہر وقت سر پر مسلط رہتا، نہ للچائی ہوئی نظروں سے گھورنا، جب کبھی سامنا ہو جاتا، آنکھیں نیچی کر کے باتیں کرتا، خود سے کبھی اس کے کمرہ میں نہ جاتا، اس کی مرضی اور اشارہ پر چلتا زیادہ تر اپنے کمرہ میں پڑا رہتا۔

یہ ایسی باتیں تھیں جنہوں نے غزالہ کو بھی اپنی رائے بدلنے اور اپنے فیصلہ پر نظرِ ثانی کرنے پر مجبور کر دیا، امجد اور نسیم دونوں اس کی نظر میں قابلِ احترام و لحاظ تھے،

پہلے وہ چاہتی تھی، جلد از جلد یہ دونوں واپس چلے جائیں، اب ذہنی طور پر وہ آمادہ ہو چکی تھی، کہ اگر یہیں رہ جائیں تو اچھا ہے۔

---

(۳۴)

امجد اور نسیم کو "صمد لاج" میں ڈیرہ ڈالے دس روز ہو چکے تھے، ایک روز یکایک امجد میاں غزالہ کے کمرہ میں پہنچے، وہ بیٹھی کچھ لکھ رہی تھی، امجد نے دروازہ پر کھڑے ہو کر کہا۔

" بیٹی کیا میں آسکتا ہوں ؟ "

وہ کھڑی ہو گئی،

" تایا جی مجھے شرمندہ کیوں کرتے ہیں ؟ آپ کو بھی پوچھ کر آنے کی ضرورت ہے ؟"

تایا جی ہنسے، وہ ہنسی جو خوشی کی نہیں ہوتی، بلکہ چھوٹوں کو خوش کرنے کیلئے بڑے تعظیماً ہنس دیتے ہیں پھر انھوں نے فرمایا۔

" بیٹی میں تیری طبیعت سے واقف ہوں، جانتا ہوں، بڑی نازک مزاج لڑکی ہے تو میں کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتا، جو تجھے ناگوار گزرے ——— کیوں بیٹی، نسیم نے تو کوئی ایسی حرکت نہیں کی، جس سے تجھے غصہ آیا ہو ؟ "

وہ ادب سے بولی۔

" نہیں تایا جی ! "

" تایا جی نے اس کی آنکھوں میں جھانکا پھر فرمایا۔

" میری مروت سے تو نہیں کہتی ؟ "

وہ بولی،

"جی نہیں، واقعی اس مرتبہ تو وہ بہت اچھی طرح رہ رہے ہیں ——— بالکل بھلے مانسوں کی طرح ———!"

امجد میاں ہنس پڑے،

"میں نے اس سے کہہ دیا تھا، غزالہ میری بیٹی ہے، میری روح ہے، میری جان ہے، اس کے لئے تجھے چھوڑ سکتا ہوں، لیکن تیرے لئے اس کا دل میلا نہیں کر سکتا، بہت بیقرار تھا یہاں آنے کے لئے، اپنے چچا کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لئے، اپنے چچا کی غمزدہ بیٹی کو تسکین و تسلّی دینے کے لئے ہاں تو میں نے کہہ دیا۔ رشتہ ایسا ہے کہ میں منع نہیں کر سکتا، چلتے ہو تو چلو لیکن یہ سوچ کر چلو کہ غزالہ کا غلام بن کر رہنا پڑے گا تمہیں، وہ تم سے بہت خفا ہے، نفرت کرتی ہے تمہاری حرکتوں سے، تم میری سفید داڑھی میں اس کا بار چڑا کر کالک لگا چکے ہو، اب اگر تم نے کوئی ایسی بات کی جو اُسے ناگوار گزری تو کھڑے کھڑے چلتا کر دوں گا، اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عاق کر دوں گا، مرتے مر جاؤں گا لیکن تمہارا روئے سیاہ نہ دیکھوں گا!"

اتنی باتیں کر کے امجد میاں نے غزالہ پر ایک نظر اس کا ردِ عمل معلوم کرنے کے لئے ڈالی، شاید مطمئن ہو گئے، پھر سلسلۂ سخن قائم کرتے ہوئے فرمایا۔

"اور رونے لگا، بہت نادم تھا اپنی غلطی پر۔"

غزالہ نے مداخلت کی،

تایا جی اس ذکر کو چھوڑ دیئے غلطی کس سے نہیں ہوتی، مجھے اب وہ باتیں یاد بھی نہیں ہیں، نہ ان کا ذکر پسند کرتی ہوں، مجھے نسیم بھائی سے کوئی شکایت نہیں ہے، آپ بھی خوش ہو جایئے ان سے!"

معلوم ہوا، امجد میاں کو شادی مرگ ہو جائے گا، انہوں نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"تو سفارش کر رہی ہے تاکہ میں اسے معاف کر دوں؟"

وہ کہنے لگی۔

"جی تایا جی!"

تایا جی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر بہت سے نوٹ نکالے اور اس کے

سامنے بکھیرتے ہوئے کہا۔
"بیٹی پانچ ہزار روپے ہیں!"
غزالہ چونک پڑی،
"نانا جی روپے کیسے؟"
امجد میاں نے بتایا۔
"تین ہزار تیرے گمشدہ ہار کی قیمت، اور دو ہزار جرمانہ!"
غزالہ نے نوٹ نہیں لئے، کہا۔
"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا میں ایسی کمینی ہوں کہ یہ روپے لے لوں گی؟"
امجد میاں نے کہا۔
"اگر نہیں لوگی تو مجھے صدمہ ہوگا!"
غزالہ نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔
"کچھ بھی ہو، یہ تو نہیں لے سکتی ہیں!"
امجد میاں نے بتایا۔
"بیٹی یہ میرے روپے نہیں ہیں!"
غزالہ نے پوچھا،
"پھر کس کے ہیں؟"

امجد میاں نے کہا۔
"نسیم کے ——— یہ اس نے مجھے دیئے ہیں کہ تمہیں دے دوں اور تمہاری معافی کی خوشخبری اسے پہنچا دوں!"
وہ بولی،
"نانا جی خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کیجئے ——— یہ روپے نسیم بھائی کو واپس کر دیجئے اور ان سے کہہ دیجئے، میرے دل میں اب اُن کے خلاف کوئی بات نہیں ہے!"
یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ نسیم ادھر سے جاتا ہوا نظر آیا، امجد نے پکارا،
"نسیم ادھر آؤ۔"

وہ آیا اور سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔
امجد میاں نے کہا۔
"لیجیئے، یہ اپنے پانچ ہزار روپے غزالہ بیٹی نے واپس کر دیئے ہیں!"
تسیم نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔
"اس کے معنی یہ ہیں کہ اب تک مجھے معافی نہیں ملی!"
امجد نے قہقہہ لگایا اور بلند آواز سے کہا۔
"وہ میری بیٹی ہے، اس نے یہ روپے بھی واپس کر دیئے، اور معاف بھی کر دیا۔"
نسیم نے روپوں پر ایک پھسلتی نظر ڈال کر کہا۔
"اگر یہ روپے لے لیتیں تو مجھے بہت خوشی ہوتی!"
امجد میاں نے ڈانٹا،
"ابے کیا عورتوں کی طرح لجا لجا کر باتیں کر رہا ہے، خود کیوں نہیں کہتا!"

لیکن خود کچھ کہنے کی ہمت نسیم کو نہ ہوتی۔
امجد میاں نے غزالہ سے کہا۔
"بیٹی تمہارا مجرم سامنے کھڑا ہے، ایک مرتبہ اس کے سامنے بھی کہہ دو کہ معاف کیا!"
غزالہ اس سوال و جواب سے تنگ آ چکی تھی، اُس نے جھینپتے ہوئے کہا۔
"تایا جی بار بار یہ لفظ میرے منہ سے نہیں نکلے گا۔!"
پھر وہ نسیم سے مخاطب ہوئی،
"نسیم بھائی، پچھلی باتیں میں بھی بھول چکی ہوں، آپ بھی بھول جایئے!"
نسیم کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر سی پیدا ہوئی، اس نے کہا۔
"میں بہت نادم ہوں غزالہ!"

وہ بولی،
"لیکن مجھے تو نادم نہ کیجیئے، میں اپنے آپ کو شرمندہ محسوس کرنے لگتی ہوں۔"

شاید نسیم کے الفاظ کا خزانہ خالی ہو چکا تھا، امجد میاں نے سہارا دیا۔
"دیکھا بیٹے؟ ——— اسے کہتے ہیں دل، یہ ہے بڑے باپ کی بڑی بیٹی کا دل؟ ——— اب کھڑا میرا منہ کیا تک رہے ہو، جاؤ خوشی مناؤ دو چار فقیروں کو کھانا کھلاؤ کچھ غریبوں کی مدد کرو، غزالہ بیٹی نے تمہیں معاف کر دیا۔ ——— اگر شریف ابن شریف ہو تو خبردار اب کبھی کوئی ایسی بات نہ ہو جو شکایت کا سبب بنے!"

پھر انہوں نے غزالہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"سلمیٰ کہاں ہے؟"

غزالہ نے بتایا۔

"اپنے کمرہ میں ہوں گی!"

امجد میاں نے کہا۔

"ذرا اسے بلوا لو۔"

غزالہ حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگی، وہ سوچ رہی تھی، سلمیٰ کی یاد امجد کو کیوں آئی ہے؟ ——— اس نے پوچھا۔

"کوئی کام ہے؟"

امجد میاں نے کہا۔

"ہاں بھئی بڑا ضروری کام ہے، اس کی حیثیت تمہاری ماں کی ہے، ایمان کی بات یہ ہے کہ اگر عذرا زندہ ہوتی تو وہ بھی زیادہ سے زیادہ اسی چاؤ اور محبت سے تمہیں اپنے دامن میں پالتی، جس طرح سلمیٰ نے پالا ہے۔"

غزالہ تائید پر مجبور ہو گئی۔

"واقعی تایا جی، سلمیٰ چچی کا شکریہ میرا ہر بُن مو زندگی بھر ادا کرتا رہے گا۔"

عامرانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے امجد نے اسے کہا۔

"جانتا ہوں جانتا ہوں، اسی لئے تو اسے بلوا رہا ہوں، کوئی فیصلہ اس کی مرضی اور منشا کے بغیر نہیں کرنا چاہتا!"

بے ساختہ غزالہ کے منہ سے نکلا۔

"فیصلہ؟ ———"

امجد نے کہا۔
"ہاں بیٹی —— بہت اہم اور ضروری فیصلے کرتے ہیں، لیکن اس کی رائے سے!"
عزالہ نے گھنٹی بجا کر نوکر کو بلایا، اور اس سے کہا۔
"پچی کو بلا لاؤ!"

(۵)

ذرا دیر میں سلمٰی بھی آگئی، امجد میاں نے اُسے پیار بھری نظروں سے دیکھا اور کرسی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

"بیٹھو بیٹی!"

وہ بیٹھ گئی، کہنے لگے۔

"میں نے ایک ضروری کام سے بلایا تھا، کوئی حرج تو نہیں ہوا؟"

وہ کہنے لگی،

"بھائی صاحب آپ بلائیں اور میں اس طرح کی باتیں سوچوں"

شفقت آمیز ہنسی ہنسنے لگے، پھر فرمایا۔

"کیا کہنا ہے ہماری سلمٰی بیٹی کی سعادتمندی کا!"

غزالہ نے کہا۔

"چچی تایا جی کچھ فیصلے کرنا چاہتے ہیں، اس لئے بلایا ہے آپ کو!"

یہ سن کر سلمٰی کو حیرت ہوئی وہ سوالیہ نظروں سے امجد اور غزالہ کو دیکھنے لگی۔

"لیکن کسی طرح کے بھی فیصلوں کا تعلق مجھ سے کیا ہو سکتا ہے؟"

غزالہ بولی،

"یہ تایا جی جانیں!"

امجد نے بڑی آمادگی سے کہا۔

"ہاں بیٹی میں نے بلایا ہے، بات یہ ہے کہ غزالہ کے بارے میں، اس گھر کے بارہ میں کوئی فیصلہ کرنا ہو، تو وہ بغیر تمہاری رائے اور مرضی کے تو نہیں ہو سکتا۔ کیا میں نہیں جانتا، صمد کے دل میں تمہاری کتنی عزت اور تمہاری رائے کی کتنی وقعت تھی؟ خوب جانتا ہوں بیٹی خوب جانتا ہوں، اسی طرح یہ بھی جانتا ہوں کہ غزالہ سے اگر کنوئیں میں چھلانگ لگانے کو کہہ دو تو آنکھ بند کر کے وہ چھلانگ لگا دے گی، تم سے اس درجہ محبت ہے اسے، اور بھئی ایمان کی بات یہ ہے کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے، صمد جو یوں تمہارا لحاظ و احترام کرتے تھے، یا غزالہ جو تم پر جان چھڑکتی ہے، تو کیا خالی خولی؟ نہیں بھائی کوئی دشمن بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ تم نے دیور کی اس طرح خدمت کی کہ کیا کوئی سگی بہن کرے گی، سارا گھر سنبھال لیا، سارا بوجھ اپنے دوشِ ناتواں پر اٹھا لیا، اور غزالہ کو تو تم نے نئی زندگی بخشی ہے تم اس کی چچی ہی نہیں بنی، ماں بھی بنی ہو ——"

غزالہ بول پڑی،

"ماں سے بھی زیادہ!

امجد نے تصدیق کی!

"ہاں بے شک ماں سے بھی کہیں زیادہ!"

اب امجد میاں نے اصل سوال اٹھایا، پہلے غزالہ کی طرف دیکھا، پھر سلمیٰ سے سوال کیا۔

"بیٹی، جیسا کہو ایسا کیا جائے؟ کہو تو رہیں کہو تو چلے جائیں؟"

سلمیٰ اور غزالہ دونوں کو اس سوال پر بڑی حیرت ہوئی، اور دونوں نے تقریباً بیک آواز پوچھا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

دفورِ تاثر سے امجد میاں کی آواز بھرا آئی، انہوں نے کہا۔

"بھئی میری حیثیت کیا ہے، مانو تو دیوتا نہیں تو پتھر چاہو تو بت کی طرح سر پر بٹھا لو چاہو تو پتھر کی طرح ٹھوکر مار کر گھر سے باہر پھینک دو!"

غزالہ نے کہا۔

"واہ تایا جی آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں آپ ہمارے بزرگ ہیں،..... کس کی مجال ہے کہ آپ کی بات دکھل سکے؟"

سلمیٰ نے بھی ہاں میں ہاں ملائی،

"اب آپ کے سوا اور ہے کون؟"

امجد میاں رونے لگے،

"کاش میں مر جاتا اور صمد زندہ رہتا ــــ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ کاش نسیم مر جاتا مگر صمد زندہ رہتا۔"

سلمیٰ نے ٹوکا۔

"نہیں بھائی صاحب ایسی بات نہ کہئے، جو کچھ خدا کو منظور تھا وہ ہوا، خدا نسیم کو زندہ رکھے، وہی تو اب آپ کا عصائے پیری ہے!"

امجد میاں جھلا گئے، انہوں نے تقریباً ڈانٹتے ہوئے سلمیٰ سے کہا۔

"غلط ــــ جھوٹ، دروغ ــــ میری آنکھ کا نور، میرے دل کا سرور، طاقتِ جانِ ناتواں، روحِ رواں پیرِ نیم جاں، نسیم نہیں غزالہ ہے، زندہ رہنے کی اگر آرزو ہے تو اس کے لئے، نسیم کا کیا ہے مرد ذات ہے، کھانے کو گھر میں خدا کا دیا بہت ہے نہ بھی ہو تو کما کھائے گا۔ لیکن غزالہ؟ اس کی ابھی عمر ہی کیا ہے؟ ننھی، نادان سادہ لوح، صاف دل، صاف مزاج، صاف زبان، نہ دنیا کے فریب سے واقف، نہ دنیا والوں کی گھاتوں سے، جب تک اس کی زندگی، ایک ڈھرّے پر نہ آجائے، جب تک یہ اپنا کاروبار سنبھالنے کے قابل نہ ہو جائے۔ میں مریم سے بے تعلق ہو کر، نسیم سے بے پروا ہو کر، گھر سے روگرداں ہو کر، اپنے کاروبار سے قطع تعلق کر کے یہیں رہنا چاہتا ہوں۔"

پھر وہ اس طرح دونوں کی طرف دیکھنے لگے جیسے پوچھ رہے ہوں۔

"اجازت ہے؟"

---

(۶)

غزالہ اور سلمیٰ دونوں پر امجد میاں نے ان چند دنوں میں اپنی شیریں بیانی اور خوش اطواری سے سحر کر دیا تھا، واقعات ماضی پر دونوں کو شرمندگی سی تھی اور یہ خواہش تھی کہ وہ شرمندگی حسن عمل سے رفع ہو جائے، سلمیٰ نے کہا۔

"بھائی صاحب غزالہ بھی آپ کی ہے، یہ گھر بھی آپ کا، کس کی مجال ہے کہ آپ کے یہاں رہنے، اور یہاں کے معاملات نپٹانے، اور صمد میاں کے بعد کاروبار سنبھالنے پر معترض ہو سکے!"

یہ اعتماد بھری باتیں سُن کر امجد میاں کی آنکھیں آب گوں ہو گئیں، انہوں نے محبت بھری نظروں سے سلمیٰ کی طرف دیکھا اور گویا ہوئے۔

"تجھ سے اسی جواب کی توقع تھی بیٹی ـــــ کیوں بیٹی غزالہ تم کیا کہتی ہو؟"

غزالہ نے بھی سلمیٰ کے الفاظ دہرا دیئے اور بولی۔

"تایا جان آپ تو غیروں کی سی باتیں کر رہے ہیں، ان سے مجھے دُکھ پہنچتا ہے!"

امجد میاں نے اپنی بزرگی اور غزالہ کی خوردی کا لحاظ کئے بغیر کہا۔

"میں معافی مانگتا ہوں!"

وہ اور زیادہ شرمندہ ہو گئی، کچھ نہ کہہ سکی، گردن جھکالی،

امجد میاں نے کچھ دیر خاموش رہ کر کہا۔

"میں چاہتا ہوں دوکان کا کام تسنیم سنبھال لے، اسے کاروبار اور تجارت

سے دلچسپی بھی ہے، بلڈنگوں کا کرایہ بھی آسانی سے وصول کر لیا کرے گا، فرخ میاں، خدا انہیں عمر نوح دے اور وہ اتنی ترقی کریں کہ سارے خاندان کا نام ان سے روشن ہو، گھر سے باہر کچھ عرصہ رہنے پر مجبور ہیں، اگر کوئی سرکاری ملازمت مل گئی، تو نہ جانے کہاں کہاں انہیں رہنا پڑے، ان حالات میں ایک عورت اور ایک لڑکی کا اتنے بڑے گھر میں اتنی دولت اور حشمت کے ساتھ تنہا رہنا خطرناک ہے۔ نہ جانے کب نوکروں کی نیت بدل جائے، نہ جانے کب کوئی خطرناک حادثہ ڈاکہ، قتل، یا نقب زنی کا پیش آجائے، ....
کسی مرد کا دن رات گھر میں رہنا ضروری ہے۔ تاکہ دوسرے لوگ محسوس کر سکیں کہ یہ عورتیں تنہا نہیں ہیں ان کا کوئی پشت پناہ ہے، مددگار ہے' اور نسیم تو شریفوں میں شریف اور غنڈوں میں غنڈا ہے، اگر اس سے کوئی نہیں الجھتا تو پھر شریفوں کا شریف ہے' اور اگر اسے کوئی آنکھیں دکھانے کی جرأت کرتا ہے تو انگلی ڈال کر آنکھیں نکال لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رحمت پور کے لوگ بھی اس سے ڈرتے تھے' اور فیروز آباد کے لوگ بھی چند ہی دنوں میں اس سے دبکنے لگے ہیں!"

تجویز بڑی معقول تھی، کسی کو بھی اعتراض کا موقع نہ تھا، غزالہ نے کہا۔

"تایا جان آپ جس طرح مناسب سمجھیں کریں!"

سلمٰی نے بھی تائید کی'

"ہاں بھائی صاحب آپ ہی کو یہ سارے کام کرنا ہیں، جو مناسب سمجھئے کیجئے۔"

امجد میاں نے اپنے پروگرام کی مزید تفصیل کرتے ہوئے فرمایا۔

"تو نسیم دوکان سنبھال لے گا، بلڈنگوں کی دیکھ بھال کرے گا، گھر کے معاملات کی نگرانی رکھے گا، میں ٹھہرا بوڑھا آدمی گھر پر پڑا رہوں گا، یا دیہات جا کر وصولی کر لایا کروں گا۔

غزالہ نے کہا۔

"بالکل ٹھیک ہے!"

امجد میاں نے ایک بھکاری کی طرح ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تو بیٹی کنجیاں دے دو، اتنے دن سے دوکان بند پڑی ہے، سارا کام چوپٹ ہو رہا ہے!"

سلمٰی نے ساری کنجیاں دوکان کو سامنے لاکر رکھ دیں۔

کنجیاں لینے کے بعد امجد میاں نے کہا۔

"دوکان تو آج کھل جائے گی۔ لین دین حسب معمول ہونے لگے گا، لیکن ابھی ایک اور سوال باقی ہے بیٹی!"

غزالہ نے پوچھا،

"وہ کیا تایا جان؟"

امجد نے کہا۔

"زمانہ بہت خراب ہے اور میں دیکھتا ہوں، کچھ درانداز بھی ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں ——"

"وہ کون لوگ ہیں تایا جان؟" —— غزالہ نے پوچھا۔

"میں ان کا نام لینا نہیں چاہتا ضرورت بھی نہیں ہے، میں چاہتا ہوں، جو کام ہو، پختہ ہو تاکہ بعد میں کوئی شوشہ نہ اُٹھ کھڑا ہو!"

سلمٰی نے تائید کی،

"بات تو بالکل ٹھیک ہے بھائی صاحب!"

"غزالہ یوں تو بچہ ہے، الھڑ ہے، نادان ہے۔ دنیا والوں اور دنیا سے ناواقف ہے، لیکن قانون کی نظر میں وہ عاقل و بالغ ہے، لہذا اس کی طرف سے اگر کوئی کام کرنا ہے، تو اُسے اختیار بھی ہونا چاہیئے، کام کرنے کا!"

غزالہ نے کہا۔

"میری طرف سے پُورا اختیار ہے!"

امجد نے کہا۔

"ہاں بیٹی وہ تو ہے لیکن مختار نامہ پر باقاعدہ تمہارے دستخط ہو جاتے چاہئیں نسیم تمہارے مختار کی حیثیت سے کام کرے گا، تمہارا کارندہ، ملازم اور ماتحت بن کر لیکن گھر سے باہر اس کی حیثیت وہی ہوگی، جو ایک با اختیار مختار عام

کی ہوتی ہے۔"

غزالہ بولی،

"ٹھیک ہے۔"

امجد میاں نے ایک ٹائپ شدہ کاغذ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر اس پر دستخط کردو بیٹی۔"

غزالہ نے دستخط کردیئے، امجد نے کاغذ سنبھال کر رکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹی تم نے تو اُسے پڑھا بھی نہیں؟"

وہ بولی،

"پڑھ کر کیا کرتی؟ کیا آپ کا لکھا ہوا کاٹ سکتی تھی؟"

ہنسنے لگے، پھر کھڑے ہوگئے، پھر اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور تشریف لے گئے۔

دورِ ابتلا

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی!
لکھ دیجیو یارب اسے قسمت میں عدو کی

(۱)

ویسے تو امجد میاں واقعی بوڑھے تھے، اور اسی تناسب سے کمزور ناتواں بھی، لیکن نسیم کو سارے گھر، دوکان، عمارات، اور املاک، جائیداد کا چارج دلوانے میں جس مستعدی کا ثبوت دیا، وہ انہی کا حصہ تھا، یہ معلوم ہوتا تھا بجلی چمک رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، ہرن چوکڑیاں بھر رہا ہے۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ آدمی نہیں مشین ہے، آن کی آن میں گھر کے برتنوں کی، دوکان کے ساز و سامان کی عمارات کے کرایہ داروں اور ان پر بقایا رقوم کی، جائیداد و املاک کی، دیہات کی زمین اور باغات کی، کس کا کیا دینا ہے، اور کس سے کیا لینا ہے، انشورنس کی بینکوں میں چلت کھاتے، اور فکسڈ ڈیپازٹ کی، انشورنس کی (غزالہ اور صمد دونوں کے) زرِ نقد کی، جو صمد کی تجوری اور دوکان کے سیف میں تھا، مکمل فہرست تیار کر کے نسیم کے حوالے کر دی، اور ایک اپنے پاس رکھ لی، غزالہ کو آج تک اور اب بھی نہیں معلوم تھا کہ کیا کیا ہے، لیکن امجد میاں کے ہر چیز نوکِ زبان تھی، گھر والوں کو، اور گھر والوں سے زیادہ دوکان کے ملازموں کو حیرت

تھی کہ یہ شخص آدمی ہے یا جن ؟ ویسے دیکھو تو نحیف و ضعیف اور کام پر اُتر آئے تو برق اور چھلاوہ!

گو دوکان کا انچارج نسیم تھا۔ لیکن محض برائے نام، اصل کارفرما اور کارساز امجد میاں تھے، اور صرف دوکان ہی کیا ہے، ہر معاملہ میں ان کا یہی حال تھا، صمد بھی اپنے کام پر اتنا حاوی نہیں تھا، جتنے چند روز میں امجد میاں ہو گئے۔

---

(۲)

حالات پر ہر طرح قابو پانے اور معاملات کو بالکل اپنی مٹھی میں لینے کے بعد امجد میاں اور ان کے ساتھ تسنیم اس طرح بدل گئے، جیسے سانپ کینچلی اُتارنے کے بعد بالکل نیا بن جاتا ہے۔
سب سے پہلا وار سلمٰی پر ہوا گھر کی انچارج اب تک وہی تھی، ملازموں کی تنخواہ، جنس کی خریداری، کھانا پکانے کے انتظامات سب اسی سے متعلق تھے۔ دفعتہً ایک روز امجد میاں صاحب ایک شخص کو لائے، اور سلمٰی کے سامنے اُسے کھڑا کر کے کہنے لگے،
"اس کا نام مرتضٰے ہے!"
سلمٰی نے ایک نظر مرتضٰی کے سراپا پر ڈالی، پوچھا۔
"بھائی صاحب یہ کون ہے؟"
وہ کہنے لگے۔
"بڑا اچھا رکاب دار ہے کھانے ایسے پکاتا ہے کہ انگلیاں چاٹ چاٹ کر کھاؤ کئی سال تک نواب صاحب رام پور کے باورچی خانہ کا مالک و مختار بنا رہا، پھر کسی بات پر خفا ہو گیا، انہوں نے لاکھ لاکھ اضافۂ تنخواہ اور انعام کا لالچ دیا مگر اُسے نہ جانا تھا نہ گیا!"
سلمٰی نے کہا۔
"ہو گا بھائی صاحب!"

وہ بولے،

"ہوگا کیسے؟ کیا میں جھوٹ بولتا ہوں؟"

سلمیٰ ہنسنے لگی۔

"آپ کیسے جھوٹ بول سکتے ہیں، میں نے تو یہ نہیں کہا!"

امجد میاں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"آج سے کھانا یہ پکائے گا، گھی، اناج، شکر، دال گوشت سب چیزیں یہی خرید کر لایا کرے گا ـــــ تم بہت تھک گئی ہو، کیا ضرورت ہے خواہ مخواہ کی ذمہ داری لینے اور متہم ہونے کی یہ تو وہی بات ہوئی، مرغی اپنی جان سے گئی مگر کھانے والے کو سواد نہ آیا، سچ پوچھو تو، کئی دن سے محسوس کر رہا ہوں کہ تمہیں اس ذمہ داری سے دستکش ہو جانا چاہیے، نسیم میاں ہیں وہ اپنے دوستوں کی دعوت کرتے رہتے ہیں اور وقت بے وقت فرمائشوں کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں، غزالہ ہے، وہ بھی اپنی سہیلیوں کو مدعو کرتی رہتی ہے۔ سارا بوجھ صرف تم پر ہی پڑتا ہے ـــــ آخر کیوں کیا کسی کی لونڈی ہو؟"

امجد میاں کی یہ باتیں سُن کر سلمیٰ سناٹے میں آگئی، گھر کا کام وہ اپنے ہاتھ سے تو نہیں کرتی تھی، نگرانی اس کی ہوتی تھی، کام نوکر کرتے تھے، یہ کام وہ آج سے نہیں، صمد کی زندگی سے کرتی چلی آرہی تھی، کبھی اس نے نہ حرفِ شکایت زبان سے نکالا تھا۔ نہ کسی کی گرانی محسوس کی تھی، لیکن اب دفعتہً اسے بے دخل کیا جا رہا تھا، کیا اس کی تہ میں کوئی خاص مقصد پنہاں ہے؟ کیا کسی اسکیم کا پیش خیمہ ہے؟ کیا امجد میاں کا ظاہر کچھ ہے، باطن کچھ ہے؟ ـــــ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ امجد نے کہا۔

"سن لیا بیٹی؟ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"

اگر اعتراض ہوتا بھی تو وہ نہ کرتی، اس نے کہا۔

"نہیں بھائی صاحب مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ ـــــ لیکن یہ آدمی بھروسہ کا تو ہوگا؟"

امجد کے چہرے پر ناگواری کے آثار ظاہر ہوئے، لیکن اپنی یہ کیفیت انہوں نے ظاہر نہیں ہونے دی۔

"بیٹی یہ بال دھوپ میں تو سفید نہیں کئے ہیں میں نے، اعتبار کا نہ ہوتا

تو یونہی سنڈے مسٹنڈے کو گھر میں لے آتا ؟ مجھے اس پر اتنا ہی اعتبار ہے جتنا نسیم پر، رحمت پور ہی کا تو رہنے والا ہے، اتنا بڑا تھا جب سے جانتا ہوں!"

پھر وہ مرتضٰے سے مخاطب ہوئے۔

" تو استاد کل سے کام شروع کر دو!"

وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

" بہت اچھا سرکار!"

امجد نے کہا۔

" اور وہ تمہاری بیوی غوثیہ کہاں ہے ؟ —— اسے بھی لے آئے ہوتے، غزالہ کا کام کاج کر دیا کرے گی ؟ کچھ بھی مل رہے گا!"

مرتضٰے نے پھر ایک مرتبہ ہاتھ جوڑے اور گویا ہوا،

" بہت اچھا سرکار!" —— وہ بھی آتی ہی ہوگی، ذرا دیر میں، میں اسے کہہ آیا تھا!"

امجد نے نصیحت کی،

" شاباش بڑے سمجھدار ہو، لیکن بھئی اس کا خیال رہے غزالہ کو اگر کوئی شکایت ہوئی، تو کھڑے کھڑے چلتے کر دیئے جاؤ گے! ہاں!"

وہ بولا،

" انشاء اللہ ایسا کبھی نہیں ہوگا!"

(۱۳)

سلمیٰ چپ چاپ اپنے کمرہ میں آکر بیٹھ رہی، تھوڑی دیر کے بعد غزالہ کا اُدھر سے گذر ہوا، وہ آکر سلمیٰ کے پاس بیٹھ گئی، اُس نے بڑے بھولے پن سے بالکل بچوں کی طرح کہا۔

"آخر فرخ بھائی کب آئیں گے، امتحان ہی نہیں ختم ہو چکتا، کسی طرح اُن کا!"

سلمیٰ نے جواب دیا۔

"ہاں اس کے اب تک نہ آنے سے میں بھی بہت فکرمند ہوں، دس دن کو کہہ کر گیا تھا، آج مہینہ ہونے کو آیا، اور مزید حیرت یہ ہے کہ اس کا کوئی خط بھی نہیں آیا۔"

غزالہ کہنے لگی!

یہی پریشانی تو مجھے بھی ہے، پتہ نہیں معلوم ورنہ تار دے کر خیریت معلوم کرتی، یہ کہہ کر گئے تھے کہ کسی ہوٹل میں ٹھہریں گے، نہ جانے کس ہوٹل میں ٹھہرے ہوں"

اتنے میں غوثیہ آگئی، اس نے آتے ہی سلمیٰ سے کہا۔

"وہ پوچھ رہے ہیں آج کیا کیا پکے گا!"

سلمیٰ نے غزالہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ان سے پوچھو!"
غزالہ نے سلمیٰ سے دریافت کیا،
"یہ کون ہے؟"
سلمیٰ نے ساری داستان سنادی، غزالہ کا چہرہ گلنار ہوگیا۔ اس نے غوثیہ سے کہا۔
"تایا جی سے پوچھو جاکر"
غوثیہ چلی گئی تو اس نے سلمیٰ سے کہا۔
"یہ کیا بات ہوئی چچی جان؟"
سلمیٰ ٹھنڈی سانس لے کر بولی،
"میں کیا کہہ سکتی ہوں بیٹی!"
غزالہ نے کہا۔
"تایا جی کو نہ یہ کرنا چاہیئے تھا، نہ اس کا انہیں حق تھا —— میں ان سے بات کروں گی!"
سلمیٰ نے روکا،
"نہیں بیٹی اس مسئلہ پر بات کرنا مناسب نہیں ہے —— واقعی میں کچھ تھک بھی گئی تھی، ذرا آرام کا موقعہ مل جائے گا!"
غزالہ خاموش ہوگئی، لیکن چہرے بشرے سے ظاہر تھا کہ امجد میاں کی یہ حرکت اسے بہت ناگوار گذری ہے، وہ تو خیر بہت گذری کہ وہ اس وقت نہیں تھے، ورنہ شاید وہ ان سے جاکر اُلجھ جاتی، کچھ دیر خاموش بیٹھے رہنے کے بعد، وہ اپنے کمرہ میں چلی گئی، سلمیٰ نے بھی روکنا مناسب نہیں سمجھا!

(۴)

دو تین دن اسی طرح گزر گئے، مرتضیٰ نے گھر کا سارا کام سنبھال لیا، سلمیٰ عضو معطل ہو کر اپنے کمرہ میں گوشہ نشین ہو گئی، غوثیہ زیادہ تر، غزالہ کے آس پاس چکر کاٹا کرتی، چاہے کوئی ہو یا نہ ہو، وہ موجود، خاص طور پر اس کے اور سلمیٰ کے درمیان جب بات چیت ہو تو کسی نہ کسی بہانہ سے وہ ضرور حاضر رہتی اور کن سوئیاں لیتی رہتی، اس طرح کی باتیں بہت جلد ظاہر ہو جاتی ہیں، چنانچہ غزالہ نے محسوس کر لیا، یہ میاں بیوی درحقیقت جاسوس ہیں، اور میری اور سلمیٰ کی نگرانی پر مامور ہیں،

ایک روز وہ سلمیٰ سے بیٹھی باتیں کر رہی تھی کہ غوثیہ آئی اور کمرہ جھاڑنے لگی، غزالہ نے تیوری چڑھا کر اسے دیکھا۔

"یہ کمرہ جھاڑنے کا کون سا وقت ہے ۱۲ بجے۔"

"وہ صوفہ صاف کرتی ہوئی بولی،

"آج صبح دوسرے کاموں میں اُلجھی رہی، اس لئے وقت نہ ملا، میں نے کہا اب سہی۔"

غزالہ نے ذرا تلخ لہجہ میں کہا۔

"نہیں کوئی ضرورت نہیں ہے، جاؤ!"

وہ برہم چشم و ابرو سے اپنی مالکہ کو دیکھتی ہوئی چلی گئی، اس کے جانے کے

بعد غزالہ نے کہا۔

"چچی جان میں تو ایسا سمجھتی ہوں جیسے یہ غوثیہ ہماری باتیں سُنا کرتی ہے۔؟"

سلمٰی نے تائید کی،

"ہاں بیٹی محسوس تو میں بھی کرتی ہوں، کل جب شام کو میں تمہارے کمرہ میں گئی ہوں تو آس پاس اس کا کہیں پتہ نہیں تھا، لیکن جب تمہارے کمرے سے نکل کر اپنے کمرہ میں جانے لگی، تو یہ دروازہ سے لگی کھڑی تھی۔"

غزالہ نے پوچھا۔

"پھر آپ نے خبر نہیں لی حرامزادی کی!"

سلمٰی نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے،

"نہیں بیٹی، بیشک وہ تمہاری ملازمہ ہے لیکن میرے لئے قابلِ احترام ہے، میں اگر اسے ڈانٹوں وہ مجھے ڈانٹ دے گی، بھائی صاحب اسی کا پارٹ لیں گے، رہی سہی جو عزت ہے وہ بھی جائے گی!"

غزالہ ان باتوں سے جھنجلا گئی، اس نے کہا۔

"چچی جان نہ جانے آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟"

سلمٰی نے کہا۔

"بیٹی میں جھوٹ نہیں کہتی، ابھی کل ہی کا واقعہ ہے کہ میں نے اس سے کہا کئی دن سے زکام ہو رہا ہے، جا ذرا عطار کے ہاں سے جوشاندہ لا دے ٹال گئی پھر کہا تو بولی،

"اپنے آپ اچھا ہو جائے گا دو ایک دن میں!"

میں نے ذرا بگڑتے ہوئے کہا۔

"زبان کیوں چلاتی ہے؟ جو کام کہہ رہی ہوں وہ کر!"

مجھے نقلانے لگی،

"اے ہے بڑی آئیں کہنے والی، ہمیں کوئی ایک کہے گا دس سنے گا۔!"

"بیٹی میں تو جب سے اس کی عزت کرنے لگی ہوں تاکہ وہ میری بے عزتی نہ کرے۔"

غزالہ نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔
"اور آپ نے مجھ سے کبھی نہیں کہا۔
سلمٰی نے جواب دیا۔
"نہیں —— تم ضرور اس پر خفا ہوتیں، اور پھر تمہارا بھی شاید وہی حشر ہوتا جو بھائی صاحب کے ہاتھوں میرا ہو چکا ہے!"
غزالہ یہ سوال کئے بغیر نہ رہ سکی۔
"کیا ہوا؟"
سلمٰی نے بتایا۔
"نہ جانے اس نے بھائی صاحب سے کیا جا کر لگایا، وہ بھرے ہوئے میرے پاس آتے اور آتے ہی کہنے لگے،!"
"اگر غوثیہ اور مرتضےٰ کا یہاں رہنا کسی مصلحت سے پسند نہیں تو کہہ دو صاف صاف نکال دوں ان دونوں کو!"
میں نے بڑی نرمی سے کہا۔
"میں تو ہرگز یہ نہیں چاہتی کہ کوئی نکالا جائے، لیکن اس عورت کو بات تک کرنے کی تمیز نہیں ہے!"
یہ سنتے ہی آگ بگولا ہو گئے۔
"ہاں بھئی ہم بُرے، ہمارے لاتے ہوتے آدمی بُرے، کسی دن مجھے اور تسیم کو بھی، غوثیہ کی طرح ان فٹ کر دوں گی! —— ارے بھائی غوثیہ خادمہ ہے باندی تو نہیں، ایک سنے گی دس سنائے گی، سچ تو کہتی ہے ہاتھ بیچا ہے، ذات نہیں بیچی ہے، وہ گالیاں کیوں سننے لگی کسی کی!"
میں نے اسی نرمی سے جواب دیا۔
"بھائی صاحب میں نے تو گالی نہیں دی!"
بڑے طنز بھرے لہجہ میں ارشاد فرمایا۔
"تو میں نے دی ہوگی —— بیٹی غوثیہ گالی سلمٰی نے نہیں، میں نے دی تھی تھی، مجھ بوڑھے کھوسٹ کو معاف کر دو۔"

"کیوں غوثیہ اس گھر میں میرا نام بوڑھا کھوسٹ ہی ہے نا؟"

میں ہق دق یہ باتیں سنتی رہی، بھلا کیا جواب تھا میرے پاس، وہ غصہ میں بھرے ہوئے چلے گئے، میں بیٹھی تھی لیکن جیسے میرے پاؤں تلے سے زمین نکلی جا رہی تھی، بیٹی میں نے تو فیصلہ کر لیا ہے کہ فرخ آ جائے تو چلی جاؤں یہاں سے، اب میرا اس گھر میں رہنا ٹھیک نہیں ہے، بھائی صاحب ہرگز نہیں چاہتے کہ میں رہوں —— اور تمہاری محبت میں اگر بے غیرت بن کر رہوں بھی تو دیکھ لینا ایک دن وہ خود کہہ دیں گے کہ بستر اُٹھاؤ اور نکل جاؤ ——"

غزالہ نے کہا،

"اگر وہ ایسا کہیں گے تو آپ ہی سے نہیں مجھ سے بھی کہیں گے۔"

سلمیٰ نے تردید کی،

"تم سے کیسے کہہ سکتے ہیں، تمہارا گھر ہے!" وہ بولی،

"لیکن میں بغیر آپ کے جنت میں بھی نہیں رہ سکتی، جہاں آپ وہاں میں جہاں میں وہاں آپ —— !"

(۴)

رات کا وقت تھا، بارش ہو رہی تھی، بجلی چمک رہی تھی، بادل گرج رہے تھے، —— ہوا کے جھکڑ سائیں سائیں چل رہے تھے، سردی کا یہ عالم تھا کہ دانت سے دانت بج رہے تھے، غزالہ، سلمٰی کے کمرہ میں انگیٹھی کے سامنے بیٹھی تھی، اتنے میں اس کی نظر غوثیہ پر پڑی، جو بالکل سامنے دروازہ کے پاس بیٹھی تھی، غزالہ نے کہا۔

"جاؤ ذرا کافی بنا لاؤ!"

غوثیہ اپنی جگہ بیٹھی رہی اس نے کہا۔

"دودھ نہیں ہے!"

غزالہ کی چتون چڑھ گئی،

"اتنا سا دودھ آتا ہے سب ختم ہو گیا!"

غوثیہ نے وہیں بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔

"تھوڑا سا رکھا ہے چھوٹے صاحب (نسیم) کے لئے اس کی کافی بنا دوں تو وہ کیا پئیں گے؟"

غزالہ نے تحکم کے لہجہ میں کہا۔

"یہ ہم نہیں جانتے، کون کیا پئے گا، تم سے جو کہا جا رہا ہے، اس کی تعمیل کرو!"

غوثیہ اب بھی چٹان کی طرح اپنی جگہ جمی رہی۔

"اے واہ تو کیا میں خود دودھ بن جاؤں !"

غزالہ غصّہ سے کانپنے لگی، اس نے اپنی چپل اٹھا کر دھڑ سے غوثیہ کے ماری پھر لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"تمہیں میرا حکم ماننا پڑے گا ——— ورنہ ابھی اس گھر سے نکل جاؤ، مرتضیٰ کو بھی اپنے ساتھ لیتی جاؤ، اور اگر کسی کی حمایت کا تمہیں غرّہ ہے، تو میں اس سے بھی سمجھ لوں گی !"

سلمیٰ جلدی سے اُٹھ کھڑی ہوئی، اس نے جلدی سے غوثیہ کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا، اور بڑے نرم لہجہ میں اس سے کہا۔

"کچھ پاگل ہوئی ہے، جا ایک پیالی کافی بنا لا !"

"غوثیہ نے باہر جانے کے لئے جنبش کی، غزالہ نے زور سے کہا۔

"ایک نہیں دو !"

وہ چلی گئی، تو سلمیٰ نے ملامت کرتے ہوئے کہا۔

"اتنا غصّہ، کیوں بیٹی ؟"

وہ بولی،

"میں اس سے نفرت کرنے لگی ہوں، یہ اب یہاں نہیں رہ سکتی یہ تایا جی کی اور نسیم بھائی کی جاسوس ہے، یہ میری نقل وحرکت کی نگرانی کرتی ہے۔ یہ آپ کی نشست برخاست پر نظر رکھتی ہے، یہ ہم دونوں کے بارے میں لگائی بجھائی کرتی ہے ———"

"کیسے معلوم ؟"

"میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"نسیم بھائی کو اس کی کوٹھڑی میں جاتے اور اس سے باتیں کرتے تایا جی کو اس کی کوٹھڑی میں جاتے اور کھسر پھسر کرتے، اُسے تایا جی اور نسیم بھائی کے کمرہ میں جاتے اور سرگوشیاں کرتے ——— !"

"سچ ——— ؟"

"جی ہاں سچ ——— ایک دفعہ نہیں کئی دفعہ دیکھ چکی ہوں، آپ تو

اب اپنے کمرہ سے باہر نکلنا گناہ سمجھتی ہیں، لیکن میں تو بہرحال گھر بھر میں اِدھر اُدھر گھومتی رہتی ہوں ——"

"یہ تو واقعی بہت بُری بات ہے!"

"بُری بھی اور ناقابلِ برداشت بھی!"

"تو پھر اب کیا ہوگا؟"

"صبح ہوتے دیجئے، پھر دیکھ لیجئے گا خود ہی!

"(سہم کر) کیا کرو گی بیٹی؟ میرا تو دل ہول رہا ہے؟"

"نہیں آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، گربہ کشتن روزِ اوّل اگر اس لبس کی بڑھیا کو یہاں رہنے دیا گیا، تو نہ جانے یہ کیا گُل کھلائے گی؟"

"لیکن بھائی صاحب مان لیں گے؟ وہ اسے نکالنے پہ رضامند ہو جائیں گے؟"

"کیوں نہ ہوں گے —— ؟ اگر انہیں یہ اتنی ہی پسند ہے تو اپنے گھر رحمت پور میں رکھ لیں، میں اپنے سینہ پر کودوں دلنے کی انہیں یا اسے کیوں اجازت دوں؟"

اتنے میں غوثیہ کی بجائے مرتضےٰ کافی کی ٹرے لے کر حاضر ہوا، اس نے ٹرے سامنے رکھ دی، اور چلا گیا۔

۵۱

وہی رات کا وقت ہے، موسم آج بھی ویسا ہی تکلیف دہ اور ناخوشگوار ہے جتنا کل تھا، سلمٰی اور غزالہ آمنے سامنے بیٹھی انگیٹھی تاپ رہی ہیں آج غوثیہ موجود نہیں ہے، وہ کل سے بخار کا بہانہ کر کے اپنی کوٹھری میں جو گئی ہے، تو آج دن بھر نہیں نکلی، کچھ اس لئے، کچھ سلمٰی کے سمجھانے کی وجہ سے اور زیادہ تر یوں کہ اب غصّہ ذرا ٹھنڈا پڑ چکا تھا، آج اس نے غوثیہ کو برخاست کرنے کے پروگرام پر عمل نہیں کیا تھا۔

سلمٰی نے کہا۔

"تم نے بہت اچھا کیا، جو غوثیہ کو جواب نہیں دیا ——— خواہ مخواہ ایک فتنہ کھڑا ہوتا۔"

وہ بولی،

"یہ تو ٹھیک ہے چچی جان، لیکن بکری کی ماں کب تک خیر منائے گی، ایک نہ ایک دن یہ اقدام کرنا ہی پڑے گا، میں محسوس کر رہی ہوں، پانی سر سے اونچا ہوتا جا رہا ہے۔"

سلمٰی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیوں ری لڑکی، مجھے بکری کی ماں کہہ رہی ہے؟"

غزالہ ہنسنے لگی،

" واہ ——— میں تو غوثیہ مردار کو کہہ رہی تھی!"
سلمیٰ نے کہا۔
" بے شک تم اسی کو کہہ رہی تھیں، لیکن اس کی خبر کون منا رہا ہے ؟
میں! لہٰذا بکری کی ماں میرے سوا اور کون ہے ؟"
غزالہ نے ہنستے ہوئے کہا۔
" توبہ کیجئے، بھلا میرے منہ سے آپ کے لئے کچھ نکل سکتا ہے!"
اتنے میں زور سے بجلی چمکی غزالہ سہم کر سلمیٰ کے اور قریب ہو بیٹھی،
سلمیٰ نے چھیڑتے ہوئے کہا۔
" بڑی ڈرپوک ہو!"
وہ کہنے لگی،
" کیا کروں چچی جان، بچپن سے بجلی سے ڈرتی چلی آرہی ہوں،
ادھر وہ کڑکی، ادھر میری جان نکلی!"
" پھر تو کل رات تمہیں نیند ہی نہیں آئی ہوگی، کیونکہ رات بھر بادل گرجتے
رہے۔ بجلی چمکتی رہی ——— ؟"
" جی بالکل نہیں آئی ——— اور شاید یہ اچھا ہی ہوا، ورنہ خدا معلوم
کیا ہو جاتا!"
سلمیٰ چونک پڑی،
" کیا ہو جاتا ؟"
غزالہ نے سہمے ہوئے لہجہ میں کہا۔
" ہاں چچی اماں، نہ جانے کیا ہو جاتا، خدا نے بڑا فضل کیا!"
" لیکن کچھ معلوم بھی تو ہو!"
" چچی جان، یا تو آپ میرے کمرہ میں سوئیں گی، یا پھر میں ہی یہاں سو رہوں گی!"
" دونوں باتیں ممکن ہیں، لیکن کیوں یہ ضروری ہو گیا ہے کہ یا تم یہاں سوؤ ؟
یا میں وہاں ؟"
غزالہ نے بیکلی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ہے"

سلمیٰ نے پوچھا۔

"لیکن وجہ نہیں بتاؤ گی؟"

غزالہ چپ ہو گئی،

ذرا دیر کے بعد سلمیٰ نے اُسے مخاطب کیا۔

"غزالہ میں کیا پوچھ رہی ہوں تم سے؟"

غزالہ نے افسردہ لہجہ میں کہا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ کیا ہو رہا ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا ہونے والا ہے؟ میرے خیال میں تو نہ تایا جی بدلے ہیں نہ نسیم بھائی، دونوں نے ابا جان کی جائیداد اور املاک اور مکان و دوکان پر قبضہ کرنے کے لئے نقاب اوڑھ لیا تھا، جب اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تو نقاب اُتار پھینکا اور پھر وہی بن گئے جو تھے؟"

یہ باتیں سُن کر سلمیٰ پریشان ہو گئی، اُس نے بڑے ہراس انگیز لہجہ میں کہا۔

"یہ میں کیا سُن رہی ہوں؟"

غزالہ نے بتایا۔

"چچی جان میں غلط نہیں کہتی، دونوں باپ بیٹے رنگے سیار ہیں یہ وقت خاموش بیٹھنے کا نہیں، کچھ کرنے کا ہے ورنہ ——"

"ورنہ کیا؟"

"ورنہ یہ بازی لے جائیں گے اور ہم ہار جائیں گے۔"

ہم کہیں کے نہ رہیں گے چچی جان ——"

یہ کہتے کہتے غزالہ کی آواز بھرا گئی، سلمیٰ نے اسے گلے سے لگالیا،

"لیکن میری بچی کچھ معلوم بھی تو ہو یہ رائے تم نے کیوں قائم کی ہے؟ اس کی بنیاد کیا ہے؟"

وہ بولی،

"میرا مشاہدہ!"
سلمیٰ نے پوچھا۔
"کیا دیکھا تو نے؟"
"جس کے تصور سے اب بھی ۲۴ گھنٹے گزر جانے کے بعد رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں!"
"کیا تو نے کوئی خواب دیکھا تھا؟"
"کاش وہ خواب ہی ہوتا ــــ چچی جان رات نسیم بھائی میرے کمرہ میں آئے تھے!"
یہ سُن کر سلمیٰ اپنی جگہ سے ایک بالشت اُچھل پڑی۔
"کیا کہا؟ ــــ نسیم آیا تھا تیرے کمرے میں کل رات ــــ؟"
"جی ہاں!"
"کس وقت؟"
"دو بجے!"
"دو بجے!"
پھر سلمیٰ لرز اُٹھی، اس کا چہرہ سفید پڑ گیا،
"سچ؟ ــــ واقعی؟"
"ہاں چچی جان، میں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھا!"
"لیکن دو بجے رات کو کیا کرنے آیا تھا۔"
"تم تو کمرہ کا دروازہ اندر سے بند کر کے سوتی ہو؟"
"ہاں ہمیشہ!"
"پھر بھی وہ آگیا ــ کیا کوئی جنات تھا؟"
"میں نہیں جانتی، انہوں نے دروازہ کس طرح کھولا، لیکن وہ آئے ــ"
"ہاں کہے جاؤ، سن رہی ہوں!"
"یہاں سے گئی تو بڑی دیر تک تو فرخ بھائی کا خیال آتا رہا، ان کی یہ مسلسل اور طویل غیر حاضری اور خاموشی اور آپ کا اضطراب و قلق رہ رہ کر بھی یاتیں دماغ میں آرہی تھیں، ایک تو نیند یوں اُڑ گئی، دوسرے کڑک اور گرج نے

اُڑادی ——"

"ہاں پھر ——"

"اتنے میں گھڑی نے دو بجائے کیا دیکھتی ہوں، میرے کمرہ کا دروازہ جیسے آہستہ آہستہ کوئی کھول رہا ہے، لرز ہی تو گئی، یقین ہوگیا ہو نہ ہو کوئی جنات ہے۔"

"(مسکراتے ہوئے) بیگل —— ہاں!"

دروازہ کھل گیا اور کوئی دبے پاؤں کمرہ میں داخل ہوا، اور میری چار پائی کی طرف آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا بڑھا ——"

ہائے غضب ——"

میں بستر پر پڑے تھر تھر کانپنے لگی، کبھی خیال آتا چور ہے، کبھی وہم ہوتا جنات ہے، لیکن جان سے زیادہ آبرو کا خطرہ تھا، بقول آپ کے حد درجہ ڈرپوک ہوتے کے باوجود اس وقت نہ جانے کہاں سے ہمت آگئی میں جلدی سے اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی اور میں نے زور سے کہا۔

"کون ہے ——؟"

"میری آواز سنتے ہی وہ شخص اُلٹے پاؤں بھاگا، روشن دان میں ہمیشہ کھلے رکھتی ہوں، یکایک زور سے بجلی چمکی، میں نے اچھی طرح دیکھ لیا وہ نسیم بھائی تھے، انکے جانے کے بعد میں اٹھی، اندر سے دروازہ کا کھٹکا لگایا، بجلی جلا دی اور کتاب لے کر بیٹھ گئی ——"

"کمال ہے بھئی ——"

"پہلے تو خیال آیا، غل مچا کر سارے گھر کو جگا دوں، پھر سوچا پہلے آپ سے مشورہ کرلوں!"

"بہت اچھا کیا!"

"تو بتایئے پھر کیا کرنا چاہیئے؟"

"واقعی بہت بڑا اہم اور قابلِ غور مسئلہ ہے —— اس معاملہ پہ چُپ نہیں رہا جا سکتا، ضرور ایسا انتظام کرنا چاہیئے کہ اب ایسی حرکت کا اعادہ نہ ہو سکے!"

"وہی تو آپ سے دریافت کر رہی ہوں!"

"بیٹی تم نے تو بم کا گولہ کھینچ مارا —— ذرا حواس درست ہو لینے دو، پھر سوچوں گی۔"

"لیکن آج رات کا کیا ہوگا؟ میں اکیلی تو وہاں نہیں سو سکتی ——"

"یہی ٹھیک ہے ——بہرحال آج تو میں چلتی ہوں وہیں سو رہوں گی، پھر کل کوئی بات سوچی جائے گی!"

"تو چلیے، رات بھر کی جاگی ہوئی ہوں، نیند آرہی ہے بڑے زور کی ——!"

(۶)

سلمیٰ غزالہ کے ساتھ اس کے کمرے میں جاکر سو رہی، رات آرام اور اطمینان سے گزر گئی، کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا۔ صبح غوثیہ پھر اپنے کام پر آگئی، اور اسی طرح کام کرنے لگی، جیسے نہ وہ پٹی تھی، نہ اس کے ساتھ سخت برتاؤ کیا گیا تھا غزالہ بیٹھی کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی، اتنے میں غوثیہ ایک لفافہ لئے ہوئے اس کی طرف آئی، کہنے لگی،

" بیگم صاحب یہ خط کیا آپ کا ہے؟ یہاں پڑا تھا دروازہ کے پاس!"

غزالہ نے لفافہ ہاتھ سے لے لیا اور جب جواب دینے کے لئے نظر اٹھائی تو غوثیہ جا چکی تھی، سواد خط سے اندازہ ہو گیا تھا کہ خط نسیم کا ہے، چاہا تھا۔۔۔۔ بے پڑھے واپس کر دے، لیکن غوثیہ جا چکی تھی، اس نے وہ خط میز پر رکھ دیا۔ پہلے جی چاہا کہ اسے پھاڑ کر پھینک دے، پھر خیال آیا، دیکھ لینا چاہیئے۔ اس نے لفافہ کھولا خوشبو میں بسا ہوا ایک خط اس کے اندر سے برآمد ہوا نسیم نے لکھا۔

ے " پڑھنا ہمارا خط یہ ذرا دیکھ بھال کے
کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے!

جان سے زیادہ عزیز محبوب پیاری دلاری غزالہ!

سمجھ میں نہیں آتا تم مجھ سے اتنی کھنچی کھنچی کیوں رہتی ہو؟ جب ہمیں تمہیں زندگی ایک ساتھ بسر کرنی ہے، ایک دوسرے کا رفیق زندگی بن کر رہنا ہے، پھر

یہ دُور دُور سہاگن کیا معنی رکھتا ہے؟ شاید یہ بھی ایک انداز محبوبی ہے، اگر یہ بات ہے تو خدا کے لئے اب میرا زیادہ امتحان نہ لو۔ رات اسی مسئلہ پر تم سے بات چیت کرنے کے ارادہ سے آیا تھا لیکن تم ڈر گئیں اور اس طرح چیخیں کہ مجھے اُلٹے پاؤں واپس جانا پڑا۔

تم سلمٰی کے پھندے میں بہت زیادہ پھنس گئی ہو، تم بھولی اور نادان ہو، نہیں جانتیں، یہ عورت زہر کی بجھی ہوئی ہے۔ منحوس تنی ہے کہ اپنے شوہر کو کھا گئی، اس گھر میں آئی تو صمد چچا کو بے ڈ کار لئے ہضم کر لیا، میں نے اور ابا نے غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ شادی سے پہلے پہلے اُسے چلتا کر دیں گے۔ اگر یہ ہماری شادی پر اس گھر میں موجود رہے گی تو ضرور اس کی نحوست کا سایہ ہم پر پڑ کر رہے گا۔

تمہیں ایک خوشخبری بھی سنا دوں، میں نے اور ابا جان نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اگلے مہینے ہماری شادی ہو جائے، ساری تیاریاں مکمل ہیں، یہاں بھی اور رحمت پور میں بھی ایسی شاندار بارات آئے گی کہ لوگ پکار اُٹھیں گے ہاں بھئی شادی ہو تو اس دھوم دھام کی، ابا میاں مجھ سے زیادہ تمہیں چاہتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے انتہائی کنجوس ہونے کے باوجود بڑی شاہ خرچی سے سارے انتظامات کئے ہیں، اب ہماری زندگی کا نیا دور شروع ہوگا۔ اب تک تم صرف اس گھر کی مالک تھیں۔ اب میرا دل بھی تمہاری حکومت میں شامل ہو جائے گا۔ اور شامل کیا ہو جائے گا وہ تو اس وقت سے ہے، جب پہلی مرتبہ تمہیں دیکھا تھا، وہ پہلی نظر جو میری تم پر، اور تمہاری مجھ پر پڑی تھی، زندگی کا ایسا قیمتی سرمایہ ہے، جو کبھی فراموش نہیں ہو سکے گی!

ہاں! ــــــ تم نے یہ کیا حماقت کی کہ سلمٰی چڑیل کو رات اپنے پاس سلایا؟ کیا تم سمجھتی ہو، وہ میرا کچھ بگاڑ سکتی ہے؟ یا اگر میں آنا چاہوں تو روک سکتی ہے۔ یہ تو تم بھی نہیں کر سکتیں وہ کیا کرے گی؟ یہ ایسی باتیں ہیں جو مجھے ناگوار ہیں۔ اور بیوی کو شوہر کی رضامندی کا ہر حالت میں خیال رکھنا چاہیئے اسی میں اس کے دین اور دُنیا کا بھلا ہے۔ امید ہے میری اس نصیحت پر

عمل کرو گی، اور سلمیٰ کو آج اپنے ہاں نہیں سلاؤ گی۔ تم جانتی ہو میرا غصہ بہت بُرا ہے، ابا اور اماں تک میرے غصے سے کانپتے ہیں، اگر مجھے غصہ آگیا، تو جہاں سلمیٰ کو خیر بہت نہیں ہو گی، وہاں خواہ مخواہ مجھے بھی بعد میں تم سے شرمندہ ہونا پڑے گا!

ایک بات اور کہہ دوں!

مرتضیٰ اور غوثیہ کے ساتھ تمہارا طرزِ عمل بہت ناپسندیدہ اور ناخوشگوار ہے۔ کل رات کو تم نے اُس سے جو سلوک کیا، اس سے مجھے بہت غصہ آیا، اور شاید مجھ سے کچھ ناشائستہ حرکتیں اسی وقت سرزد ہو جاتیں، جب وہ روتی ہوئی میرے پاس آئی تھی، لیکن ابا جان نے مجھے ٹھنڈا کیا۔ اس طرح کی باتوں کا اعادہ اب نہ ہونا چاہیئے، مرتضیٰ اور غوثیہ ہمارے خاص آدمی ہیں، ان کے ساتھ وہی برتاؤ ہونا چاہیئے، جس کے وہ مستحق ہیں۔

اور پھر ایک اور بات بھی سوچنے کی ہے۔

تمہیں اس گھر میں کچھ ہمیشہ تو رہنا نہیں ہے، شادی کے بعد رحمت پور چلی جاؤ گی اور مستقل طور پر وہیں مقیم رہو گی، مرتضیٰ اور غوثیہ کو بہرحال یہیں رہنا ہے، تو چند روز کے لئے بگاڑنے سے کیا فائدہ؟ ویسے میں نے مرتضیٰ اور غوثیہ کو بھی سمجھا دیا ہے کہ وہ تمہارا کہنا مانا کریں، اور انہوں نے وعدہ بھی کر لیا ہے۔

امید ہے میرا مطلب تم نے اچھی طرح سمجھ لیا ہو گا، پھر بھی اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئی ہو، یا میری پیش کردہ باتوں میں سے کسی پر تمہیں اختلاف ہو تو تمہیں سمجھانے، اور تمام پہلو ذہن نشین کرنے کو میں تیار رہوں، آج رات کو میں پھر آؤں گا ——— ڈر مت جانا، دو بجے نہیں، نو، دس بجے ——— اور ان مسائل پر اور بعض دوسری باتوں پر گفتگو کروں گا۔ لیکن واضح رہے کہ اس موقع پر سلمیٰ وہاں موجود نہ ہو، اگر وہ ہوئی تو پھر میں ہوش میں نہیں رہوں گا، اور اسی وقت کھڑے کھڑے اسے چلتا کر دوں گا، مجھے اس سے اتنی نفرت ہے کہ اسکی صورت دیکھنا بھی پسند نہیں،

ہزار جان سے تمہارا
نسیم

غزالہ نے یہ خط پڑھا اور بار بار پڑھا، جب پڑھا، ایک نئی دنیا، ہولناکی، بربادی اور دہشت کی سامنے آگئی۔

اب تک وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ صمد کے مرنے کے بعد خدا نے ان دونوں کو راہِ راست دکھائی ہے، اور یہ سنبھل گئے ہیں، اب اندازہ ہوا کہ انہوں نے اپنے خبث نفس، بد باطنی اور بدنفسی پر نقاب ڈال لیا تھا، اور جب ضرورت نہ رہی تو اُسے نوچ کر پھینک دیا۔

وہ سوچنے لگی۔

"اب کیا ہوگا؟"

"اگر آج رات کو وہ میرے کمرہ میں آیا تو میں کیا کروں گی؟ —— کیا کر سکوں گی؟ —— کیا کراوں گی —— ؟"

پھر وہ سوچنے لگی،

"اگر سلمیٰ چچی کو اپنے کمرہ میں رکھتی ہوں، تو ایک قیامت برپا ہو جائے گی۔ اور نہیں رکھتی ہوں تو پھر میری خیر نہیں؟"

انسان جب بالکل بے بس ہو جاتا ہے تو رونے لگتا ہے۔ غزالہ کو جب ان حالات سے فرار کی کوئی صورت نظر نہ آئی، تو وہ رونے لگی۔

آج اسے اپنا باپ یاد آرہا تھا —— اگر وہ زندہ ہوتا، تو یہ باپ بیٹے اس گھر میں قدم بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔

آج اسے فرخ یاد آرہا تھا —— اگر وہ ہوتا تو کتنا بڑا سہارا ثابت ہوتا۔ ان مشکلات اور حوادث کا کتنے اعتماد اور اطمینان کے ساتھ وہ مقابلہ کرتی۔

آج اسے اپنے اوپر غصہ آرہا تھا —— اگر گربہ کشتن روزِ اوّل کے اصول پر اُس نے امجد اور نسیم کو پہلے ہی دن اس گھر سے رخصت کر دیا ہوتا، جب یہ مگرمچھ کے آنسو بہاتے ہوئے آئے تھے تو آج یہ دن کیوں دیکھنا پڑتا؟

وہ یہی سوچ رہی تھی کہ سلمیٰ آگئی، اس نے جو دیکھا غزالہ کی آنکھوں میں آنسو

بھرے ہوئے ہیں اور وہ افسردہ اور مضمحل نظر آرہی ہے تو بیتاب ہوگئی۔ اس نے کہا،

"میری بچّی ———"

اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ پائی تھی کہ غزالہ سسکیاں لے لے کر رونے لگی!
سلمیٰ اس کے پاس بیٹھ گئی، نسیم کا خط سامنے پڑا تھا، اس نے اُسے اٹھایا اور پڑھنے لگی ———!

(۷)

سلمیٰ نے خط پڑھا اور وہیں رکھ دیا، غزالہ اب تک سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی، سلمیٰ نے خود ہی تقریباً روتے ہوئے کہا۔

"بیٹی مت رو!"

غزالہ کی ہچکیاں اور سسکیاں اور زیادہ تیز ہوگئیں اس نے اپنے آنسو پونچھے لیکن وہ رکنے کا نام نہ لیتے تھے، اس نے روتے ہوئے کہا۔

"چچی جان، خدا سے دُعا کیجئے، مجھے موت دے دے!"

سلمیٰ لرز گئی۔

"خدا نہ کرے!"

غزالہ نے کہا۔

"مجھے بددعا نہ دیجئے چچی جان —— میں زندہ نہیں رہنا چاہتی، کیا کروں گی زندہ رہ کر؟ کیا ان ذلتوں اور خواریوں کے بعد بھی مجھے زندہ رہنا چاہیئے؟"

سلمیٰ نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"خدا کوئی سبیل نکالے گا!"

غزالہ نے پوچھا۔

"کب؟ —— کیا جب ذلت کے ساتھ آپ اس گھر سے نکالی جا چکی ہوں گی؟ جب وہ سفاک درندہ مجھے برباد کر چکا ہوگا، جب یہ بہروپیا (امجد)

اس گھر کا صحیح معنٰی میں مالک بن چکا ہوگا۔"

سلمٰی نے سوچا، غزالہ کے دلائل وزنی ہیں، تاہم وہ بولی،

"یہ کچھ نہیں ہوگا؟"

غزالہ کو یقین نہ آیا، اس نے اعتراض کیا۔

"کیسے؟ کیونکر؟"

"سلمٰی نے اپنے عقیدے کا اظہار کیا۔

"مجھے خدا پر بھروسہ ہے، وہ ہمیں تنہا نہیں چھوڑے گا، وہ تمہیں رسوا نہیں ہونے دے گا!"

بڑی بے بسی کے ساتھ غزالہ گویا ہوئی۔

"مجھے طفل تسلیوں میں اُلجھانے کی کوشش نہ کیجئے! —— یہ بتایئے، اگر نسیم نے یا امجد نے، میں اسے اب نانا نہیں کہوں گی، آپ کے ساتھ بدتمیزی کی تو کیا طرزِ عمل ہوگا آپ کا؟"

وہ بولی،

"چلی جاؤں گی، خالی کر دوں گی یہ گھر؟"

"کہاں جائیں گی؟"

"جدھر منہ اُٹھے!"

"آخر پھر بھی؟"

"کیا بتاؤں بیٹی، میرا گھر تو کرایہ پر اٹھا ہوا ہے، زبردستی کرایہ دار سے خالی نہیں کرا سکتی، سوچتی ہوں ——"

"ہاں بتایئے کیا سوچا ہے آپ نے؟"

"سوچتی ہوں اماں، آپا کے پاس چلی جاؤں، میں اپنا بوجھ ان پر بھی ڈالنا نہیں چاہتی، لیکن ان حالات میں کچھ دنوں تک بہرحال وہیں پناہ لینی پڑے گی!"

"ہاں چچی یہ ٹھیک ہے، وہیں چلی جایئے!"

"ہاں چلی جاؤں گی بیٹی!"

"لیکن کب؟ —— دیر کیوں کیجئے، آج ہی چلی جایئے؟"

"اچھا تم کہتی ہو تو آج ہی چلی جاؤں گی!"

"لیکن میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی؟"

"تم ——"

"ہاں چچی، اگر آپ اکیلی گئیں تو میں یہاں زہر کھا کر مر جاؤں گی، جان دے دوں گی اپنی —— اپنے ہی لئے تو میں نے آپ کو مشورہ دیا ہے یہاں سے جانے کا!"

"بیٹی میں تو تمہیں سر آنکھوں پہ لے چلوں، لیکن کیا یہ ممکن ہے؟"

"کیوں ممکن نہیں ہے؟"

"ناممکن —— تم سمجھتی ہو یہ لوگ تمہیں جانے دیں گے؟"

"کیا نہیں جانے دیں گے؟"

"ہرگز نہیں —— قیامت برپا کر دیں گے!"

"میں عاقل و بالغ ہوں، مجھے کون روک سکتا ہے؟"

"اگر عاقل و بالغ ہو کر تم نے اتنے اختیارات حاصل کر لئے ہیں، تو خود جانے کے بجائے انہیں کیوں نہیں نکال دیتیں؟"

"اس طرح فساد اٹھ کھڑا ہوگا چچی جان!"

"چچی جان کی زندگی، جو تمہاری تجویز ہے، اس طرح فساد بھی اٹھ کھڑا ہوگا اور طوفان بھی!"

"بے بسی کے ساتھ، پھر کیا کیا جائے؟"

"ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتی، لیکن اتنا کہہ سکتی ہوں اور کر سکتی ہوں کہ سایہ کی طرح تمہارے ساتھ لگی رہوں، ایک پل کے لئے بھی تمہیں اپنے سے جُدا نہ ہونے دوں، نسیم ہوں یا امجد بھائی جو تمہیں ٹیڑھی نظر سے دیکھے اسکی آنکھیں نکال لوں، اب تک میں خاموش رہی، اب نہیں رہ سکتی میں تمہارے ساتھ سوؤں گی، تمہارے ساتھ رہوں گی، تمہیں ذرا دیر کے لئے بھی اپنی آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دوں گی —— میں جانتی ہوں یہ گھر، یہاں کے در و دیوار

یہاں کے ملازم، یہاں کے نئے آقا، اور خاص طور پر مرتضے اور غوثیہ میرے دشمن ہیں، تمہارے لاگو ہیں، یہ زہر ہلاہل دے سکتے ہیں، گلا بھی گھونٹ سکتے ہیں، خنجر بھی گھونپ سکتے ہیں، سب کچھ کر سکتے ہیں۔ مگر میں اُن کا مقابلہ کروں گی، صمد بھیّا کی یادگار کو اپنے جیتے جی برباد نہ ہونے دوں گی۔ ہاں میں مر جاؤں تو پھر چاہے جو کچھ ہو!"

---

(۸)

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ نسیم کسی طرح ادھر آ گیا، وہ سیدھا کمرہ میں چلا آیا۔
نسیم نے پوچھا۔
"غزالہ میرا خط تمہیں مل گیا تھا؟"
وہ بولی۔
"ہاں مل گیا تھا!"
نسیم نے پوچھا،
"تم نے اُسے پڑھا؟"
اس نے جواب دیا۔
"ہاں پڑھ لیا!"
نسیم نے پھر سوال کیا،
"پھر ——؟ —— میں اس کا جواب چاہتا ہوں۔"
غزالہ نے بڑی بے پروائی اور پندار کے ساتھ کہا۔
"جواب یہ ہے کہ میں نے اسے پھاڑ کر پھینک دیا!"
یہ الفاظ نہ تھے، ایسا معلوم ہوا جیسے بارود میں کسی نے فتیلہ لگا دیا،
ایک دم وہ بھڑک اُٹھا،
"جواب یہ ہے کہ تم نے میرا خط پھاڑ دیا!"

عزالہ نے جھلّائے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"ہاں ——— اور میرا حکم یہ ہے کہ اس کمرہ سے نکل جائیے دوسرا حکم یہ ہے کہ آئندہ نہ کبھی مجھے خط لکھئے، نہ مجھ سے بات کیجئے۔"

نسیم غصہ سے تھر تھر کانپنے لگا۔

"حرامزادی یہ تیرا حکم ہے؟ تو سمجھتی ہے میں تیرے حکم کا بندہ ہوں؟ تو نے مجھے انسان کے روپ میں دیکھا ہے، اس لئے اتنی گستاخ ہوگئی ہے۔ جس روز مجھے درندے کے روپ میں دیکھے گی، اس روز ہاتھ جوڑے گی، قدموں پر سر رکھے گی، التجائیں کرے گی، مگر میں ٹھکرا دوں گا، تو مجھے سمجھتی کیا ہے؟ تو یہ کیوں فراموش کئے ہوئے ہے کہ میرے سامنے تیری ہستی ایک مچھر سے زیادہ نہیں ہے؟"

نسیم کے یہ الفاظ سُن کر عزالہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے، ان الفاظ کا جواب ایسے ہی الفاظ میں وہ نہیں دے سکتی تھی، اس نے کچھ کہنا چاہا، لیکن زبان نے یاری نہ دی۔ اس نے جواب دینا چاہا، لیکن کچھ نہ کہہ سکی، لیکن سلمیٰ نے اس کی مشکل آسان کردی، اس نے نسیم سے کہا۔

"بیٹے لڑکی سے اس طرح کی باتیں کرتے تمہیں شرم نہیں آتی! اگر وہ اس گھر کی مالک نہ ہوتی تو بھی تمہارے چچا کی لڑکی اور تمہاری بہن ہے۔ بھلا بھائی بہنوں سے اس طرح کی باتیں کرتے ہیں؟ ——— جاؤ اس وقت چلے جاؤ۔"

"نسیم تو موقع ڈھونڈھ رہا تھا کہ اُسے سلمیٰ سے دو دو باتیں کرنے کا موقع ملے، اب خوبیٔ قسمت سے خود سلمیٰ نے یہ موقع خود فراہم کر دیا تھا، اس نے کہا۔

"تم چپ رہو ورنہ اچھا نہ ہوگا!"

سلمیٰ نے بڑے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

"تم گالی دو، میں سُن لوں گی، مارو مار کھالوں گی، جتنی ذلت چاہو کر ڈالو میں سہہ لوں گی، لیکن عزالہ کو کچھ نہ ہو اس کا دل نہ دکھاؤ، اس کی توہین نہ کرو۔"

نسیم نے اور زیادہ جھنجلا کر کہا۔

"میں کہتا ہوں تم چُپ رہو، ورنہ ———"

سلمیٰ نے اسی شفقت اور پیار کے لہجہ میں کہا۔

" ورنہ کے بعد جانتی ہوں تم کیا کہنے والے ہو۔ لیکن بیٹے میں نے کہا تھا میں تمہاری ہر بات کو شیر و شکر سمجھوں گی۔ مجھ پر اپنے دل کی بھڑاس نکال لو لیکن میری بچی کو کچھ نہ کہو۔ یہ میں کسی طرح اور کسی قیمت پر برداشت نہیں کرسکتی "

نسیم نے بہت بلند آواز سے چیختے ہوئے کہا۔

" حرامزادی چلتی ہے یا جوتا اُتار کر تیری مرمت شروع کردوں ؟ "

سلمیٰ اک دم چپ ہوگئی۔ اتنے میں امجد میاں تشریف لائے۔ سلمیٰ پر سکتہ کی سی کیفیت طاری تھی۔ امجد میاں کو آتا دیکھ کر وہ اور زیادہ سہم گئی۔ کہیں یہ تشریف آوری، کسی نئے فتنہ کسی نئے حادثہ کا پیش خیمہ تو نہیں ؟

(۹)

امجد نے آتے ہی نسیم سے پوچھا،
"یہ کیا ہو رہا ہے؟" ــــــ کیوں چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اُٹھا رکھا ہے؟
کسے گالیاں دے رہے تھے ابھی ــــــ؟"
سلمٰی نے بتایا،
"مجھے! ــــــ اور غزالہ کو بھی!"
امجد نے نہایت حقارت سے سلمٰی کی طرف دیکھا، پھر غزالہ سے پوچھا۔
"کیوں بیٹی نسیم تجھے کچھ کہہ رہا تھا؟"
غزالہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور رونے لگی، امجد نے ڈپٹ کر نسیم سے کہا۔
"بتاؤ ــــــ؟"
نسیم خاموش کھڑا رہا۔ سلمٰی نے پھر زبان کو جنبش دی اور ساری داستان از اول تا آخر سنا دی اور وہ خط بھی جو نسیم نے جو غزالہ کو لکھا، امجد کو تھما دیا۔
"یقین نہ ہو تو آپ خود ہی پڑھ لیجئے!"
امجد نے وہ خط تو جیب میں رکھا، پھر سلمٰی سے کہا۔
"خدا احمد کی مغفرت کرے
نہ جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی، جب وہ تمہیں بیاہ کر لایا تھا، دنیا میں ایک سے ایک عورت دیکھ ڈالی لیکن ایسی زہر میں بجھی ہوئی عورت آج

تک نظر سے نہیں گذری، صورت دیکھو تو ایسی معصوم، جیسے فرشتہ، باتیں سنو تو ایسی نیک جیسے مخلوق جنت، کرتوت دیکھو تو ڈائن، چڑیل "

پھر نہایت بپھرے ہوئے لہجہ میں فرمایا۔

" میں تم سے کچھ نہیں پوچھ رہا ہوں —— میری سمجھ میں نہیں آتا، باپ بیٹی کی گفتگو کے موقع پر دوسرے لوگ کراماً کاتبین بنے کیوں موجود رہتے ہیں؟"

پھر انہوں نے نسیم کی طرف دیکھا اور کہا۔

" تشریف لے جایئے، زیادہ غور نہ کیجئے، فوراً تشریف لے جایئے، ورنہ میرا ڈنڈا ہوگا اور آپ کا سر"

نسیم برہمی کی حالت میں کمرہ سے نکلا چلا گیا۔

اب امجد میاں سلمیٰ سے مخاطب ہوئے۔

" زندگی بھر احسان مانوں گا، اگر آپ بھی تشریف لے جائیں —— میں غزالہ سے کچھ باتیں اکیلے میں کرنا چاہتا ہوں!"

سلمیٰ بھی چپ چاپ چلی گئی۔

سلمیٰ کے جانے کے بعد، امجد نے سر سے ٹوپی اُتاری اور غزالہ کے قدموں پر ڈال دی، اور کہا۔

" بیٹی —— یہ ٹوپی نہیں میرا سر ہے تمہی اٹھاؤ گی تو اُٹھے گا، ورنہ اسی طرح تمہارے قدموں پر پڑا رہے گا!"

غزالہ نے وہ ٹوپی اُٹھائی اور امجد کو دے دی، امجد نے کہا۔

" میں نے ایک ایک لفظ سُنا جو وہ ناخلف (نسیم) بک رہا تھا، اس خط میں اس نے جو کچھ لکھا ہے اسے بھی پڑھ لوں گا، وہ انتہائی نالائق، شودہ پشت، اور بیہودہ لڑکا ہے، میں نے طے کر لیا ہے کہ اسے عاق کر دوں گا، یہ بھی طے کر لیا ہے کہ اس گھر میں اب وہ کبھی قدم نہ رکھ سکے گا، رحمت پور جائے اور ڈنڈے بجائے —— لیکن بیٹی کیا اس بوڑھے کو بھی، اپنے تایا کو، اپنے باپ کے بڑے بھائی کو جو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے، معاف نہ کرو گی —— ؟ —— میں یہ نہیں کہتا، کہ نسیم کو معاف کر دو، اس کی معافی کا

تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ سوال مجھ بدبخت کا ہے، اگر تم نے معاف نہ کیا، اور میں مر گیا تو قبر میں بھی میری بیٹھ نہ لگے گی ——— موت بھی میرے اس صدمہ کو کم نہ کر سکے گی! ——— بیٹی جواب دو، بتاؤ جب تک تم معاف نہیں کر دو گی، جب تک تمہارے منہ سے معافی کا لفظ نہیں سن لوں گا یونہی کھڑا رہوں گا ——— "

یہ کہتے کہتے امجد میاں سر جھکا کر غزالہ کے قدموں کی طرف لپکے۔ وہ لاکھ خفا تھی۔ بیزار تھی، برہم تھی، مشتعل تھی، لیکن خاندان کے سب سے معمر اور بزرگ شخص کو، اس کی خود غرضیوں، سفاکیوں اور مکاریوں کے باوجود اپنے قدموں پر سر رکھتے کو نہیں دیکھ سکتی تھی،

وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گئی،

" تایا جی آپ یہ کیا کرتے ہیں ——— ؟"

امجد میاں نے ایک ٹھنڈی سانس لی:

" تایا جی ——— تو مجھ بدبخت اور کمینے کو اب تک تایا جی سمجھتی ہے؟"

یہ کہہ کر وہ بچوں کی طرح بلبلا کر رونے لگے، ایسا معلوم ہوتا تھا روتے روتے ابھی اور یہیں دم دے دیں گے۔

جب اچھی طرح رو چکے تو ارشاد فرمایا۔

" بیٹی تو نے میرے کانوں میں ٹپکا دیا ——— بس اتنا اور کہہ دے کہ تو نے مجھے معاف کر دیا، پھر میں چلا جاؤں گا، اگر تو کہے گی تو نسیم کے ساتھ میں بھی اس گھر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاؤں گا لیکن اس طرح نہیں جا سکتا کہ تو مجھ سے خفا ہو؟"

غزالہ نے کہا۔

" میں آپ سے تو خفا نہیں ہوں!"

امجد کے چہرے پر رونق آ گئی،

" تو مجھ سے خفا نہیں ہے ——— کیا واقعی؟ "

وہ بولی،

" آپ نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی جو میرے لئے تکلیف دہ ہو، ہاں نسیم بھائی نے ضرور میرا دل بہت دکھایا ہے، انہیں میں اب کبھی اور کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتی۔ اس گھر میں یا وہ رہیں گے یا میں!"

امجد نے غزالہ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پیار اور محبت کے لہجہ میں کہا۔

" جتنی تجھے نسیم سے نفرت ہے، اس سے زیادہ مجھے ہے، جتنی تو اس سے بیزار ہے، اس سے زیادہ میں ہوں، جس طرح تو یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ وہ اس گھر میں رہے۔ اسی طرح میں بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کا روئے نحس اس گھر میں مجھے دکھائی دے۔"

غزالہ نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

" ہاں —— تو بس انہیں رخصت کر دیجئے، آپ ہمارے بزرگ ہیں شوق سے رہیئے۔!"

امجد نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

" ہاں بیٹی تو سچ کہتی ہے، نسیم کو اب یہاں نہیں رہنا چاہیئے، اسے قطعاً یہاں سے چلا جانا چاہیئے، مجھے رہنے کی اجازت دے کر تو نے از سر نو جلا لیا اس بوڑھے کو، بیٹی تیرے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا، نسیم میرا بیٹا نہیں، تو ہے میری بیٹی، میری لخت جگر، میری نور نظر!"

غزالہ نے پھر وہی بات کی،

" بس تو تایا جی آپ شوق سے جس طرح رہتے تھے، اسی طرح رہیئے لیکن نسیم بھائی کو فوراً رخصت کر دیں ——"

بڑی آمادگی سے امجد نے کہا۔

" ضرور ایسا ہی ہوگا —— لیکن بیٹی کیا میری ایک بات مان لو گی؟"

غزالہ نے سوالیہ نظروں سے امجد کو دیکھا اور خاموش ہو گئی۔

امجد نے کہا۔

" یہ تو اسی طرح یقین ہے جس طرح اس وقت میرے سامنے تمہارا موجود

ہوتا کہ نسیم اب یہاں نہیں رہ سکتا ، اُسے بوریہ بستر اٹھانا پڑے گا ، لیکن بہرحال وہ تمہارا بھائی ہے ، کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اس طرح جائے کہ اس کی ذلت نہ ہو ؟ نوکر اس کا مذاق نہ اڑائیں ، لوگوں میں اس کی رسوائی کا چرچا نہ ہو ؟ "

غزالہ نے کہا ۔

" یہ تو میں نہیں چاہتی ، کسی کی ذلت و رسوائی سے مجھے کیا سروکار ؟ "

امجد میاں اچھل پڑے ،

" بے شک یہ الفاظ غزالہ ہی کے منہ سے نکل سکتے تھے ، یہ تو ہی کہہ سکتی تھی ، اتنا ظرف اتنی فطرتِ عالی اور کون لا سکتا ہے ——— تو ہاں بیٹی ، اگر نسیم آج کے بجائے ، دو تین دن کے بعد چلا جائے تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا ؟ "

غزالہ نے پوچھا ۔

" اس میں کیا مصلحت ہے ؟ "

امجد نے بتایا ۔

" میری بچی اس میں مصلحت فقط اتنی ہے کہ پھر اس کے جانے کا چرچا نہیں ہوگا ، ہنسی نہیں اڑے گی ، وہ اس طرح جائے گا ۔ جیسے نکالا نہیں گیا ہے حالانکہ جائے گا اسی لئے کہ نکالا گیا ہے ، لیکن یہ بات کہ وہ نکالا گیا ہے ، ہمارے تمہارے سوا کوئی اور کیوں جانے ؟ "

غزالہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ۔

" مجھے اس میں اعتراض نہیں ہے لیکن ——— "

امجد نے پیار بھری نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا ۔

" لیکن کیا ؟ ——— وہ بھی کہہ ڈالو ! "

غزالہ نے کہا ۔

" لیکن اس دو تین دن کے عرصہ میں نہ وہ مجھ سے بات کریں نہ میرے کمرہ میں قدم رکھیں نہ میرے کسی معاملہ میں دخل دیں ——— "

امجد میاں غزالہ کی باتیں سُن رہے تھے ، اور جس طرح بعض بڑے بوڑھے اپنے چہیتے اور لاڈلے بچوں کے منہ سے نکلے ہوئے ہر لفظ پہ ہونٹ اس

طرح ہلاتے رہتے ہیں گویا ان الفاظ کا تلفظ بھی ساتھ کرتے جاتے ہیں۔ اسی طرح غزالہ کے الفاظ زیر لب دوہراتے ہوئے سراپا مہر و محبت بن کر انہوں نے فرمایا۔

"اگر وہ تیرے کمرہ میں قدم رکھے گا تو میں اس کے پاؤں توڑ دوں گا۔ اگر وہ تجھ سے بات کرے گا تو میں اس کی زبان کاٹ لوں گا، اگر اس نے تیرے کسی معاملہ میں دخل دیا تو میں اس کا گلا گھونٹ دوں گا، مجال ہے کہ ایسا کرے۔"

غزالہ بالکل مطمئن ہو گئی اُس نے کہا۔

"پھر وہ شوق سے دو دن نہیں چار دن رہیں! مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے!"

امجد میاں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"میری بیٹی، میری بچی!"

پھر فرمایا۔

"خدا کی قسم تو ہیرا ہے ہیرا!"

پھر ذرا دیر خاموش رہ کر ارشاد فرمایا۔

"میں خوب جانتا ہوں اپنی طبیعت سے تو کتنی نیک، شریف، اور اونچی ہے، یہ سلمیٰ اگر تجھے نہ بھڑکائے اور لگائی بجھائی نہ کرے تو اس گھر میں کوئی فتنہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا!"

غزالہ نے سلمیٰ کی صفائی دیتے ہوئے کہا۔

"...! ابا جی چچی جان کو کچھ نہ کہئے، وہ بہت اچھی ہیں، وہ تو یہ چاہتی ہیں کہ فتنہ فساد سر نہ اٹھانے پائے، گھر میں امن و سکون کی فضا قائم رہے، انہوں نے آج تک مجھے نہیں بھڑکایا، بلکہ ہمیشہ میرے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی، آپ ان سے اتنے بدظن کیوں ہیں؟"

امجد نے پوری توجہ سے غزالہ کی یہ بات سُنی پھر کہا۔

"اگر تیرا یہ خیال ہے تو پھر واقعی میری غلط فہمی ہے ——— میں اس سے بھی معافی مانگ لوں گا ——— لیکن بیٹی اب یہ بات اسی طرح ختم ہونی چاہیئے

جس طرح میں نے کہا ہے۔"

غزالہ نے اطمینان دلایا،

" اگر مرتضےٰ کو آپ رکھنا چاہتے ہیں تو شوق سے رکھئے، غوثیہ بھی اگر صرف آپ کی خدمت کرے تو مجھے اعتراض نہیں، لیکن میں اسے سخت ناپسند کرتی ہوں، میں نہیں چاہتی کہ وہ میرے پاس آئے!"

امجد میاں نے سینہ ٹھونک کر کہا۔

" دونوں کو کل ہی چلتا کردوں گا۔ اگر تو انہیں ناپسند کرتی ہے تو وہ ایک لمحہ بھی یہاں نہیں رہ سکتے، تیری خاطر جب نسیم کو نکالے دے رہا ہوں، تو غوثیہ اور مرتضیٰ کیا چیز ہیں؟"

(۱۰)

رات کو سلمیٰ غزالہ کے کمرہ میں رہی دونوں میں بہت دیر تک امجد کی باتیں ہوتی رہیں، غزالہ نے ایک ایک بات اُسے بتادی، جو کچھ امجد نے کہا تھا سب دوہرا دیا، پھر کہا۔

" نسیم کی بدمعاشیوں اور بیہودگیوں پر جتنا غصہ آتا ہے، تایا جی کے بڑھاپے اور خوشامد پر اتنا ہی ترس آجاتا ہے۔ اور بعض باتیں مرضی کے خلاف بھی ان کی مان لینی پڑتی ہیں، مثلاً نسیم کا اس گھر میں ایک پل رہنا بھی مجھے گوارا نہیں لیکن ان کے کہنے سے دو چار دن کی مہلت دینی پڑی۔"

سلمیٰ غور سے غزالہ کی باتیں سنتی رہی، پھر بولی،

"ہاں بیٹی یہ اچھا تو ہے کہ بزرگوں کی عزت کی جائے، اور ان کی بات مانی جائے لیکن خدا مجھے معاف کرے۔ شاید میری اس رائے میں ذاتی غصہ اور نفرت بھی شامل ہو، مجھے اب بھائی صاحب اور نسیم سے یکساں نفرت ہے"

غزالہ نے اس کے خیال کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

" چچی جان نفرت تو مجھے بھی ہے، فرق یہ ہے کہ نسیم پر ترس نہیں آتا تایا جی پر آجاتا ہے، —— یہ باتیں چھیڑنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اُن کی طرف سے مطمئن ہوگئی ہوں، یہ ہے کہ ہمیں سوچنا چاہیئے، اس مصیبت سے گلو خلاصی کی تدبیر کیا ہے ؟ "

"کہہ تو رہی ہو نسیم دو چار دن میں یہاں سے چلا جائے گا!"

"ہاں تایا جی نے وعدہ تو بڑا پختہ کیا ہے!"

"بس پھر کیا فکر؟"

"فکر یہ ہے کہ نسیم تو دفع ہو جائے گا، مرتضیٰ اور غوثیہ کے بارے میں بھی میں نے کہہ دیا ہے، طے ہو چکا ہے، دونوں ہی رخصت کر دیئے جائیں گے لیکن اگر تایا جی یہاں رہے تو پھر ــــــ"

"پھر تمہیں اندیشہ ہے کہ کوئی گل ضرور کھلائیں گے؟"

"ہاں چچی ــــــ دیکھئے نا اوّل تو ان کے مزاج کا کچھ ٹھکانہ نہیں، گھڑی میں کچھ گھڑی میں کچھ، دوسرے اگر وہ یہاں رہے تو لاکھ نسیم کو عاق کر دیں، نکال دیں، خفا ہو جائیں، مگر اس کی آمدورفت کسی نہ کسی بہانہ اور کسی نہ کسی صورت سے جاری رہے گی، اور میرا یہ حال ہے کہ اس کا نام سُن کر نفرت کی لہریں اُٹھنے لگتی ہیں میرے دل میں!"

"تو بیٹی اس مصیبت سے نکلنے کی کیا صورت ہے؟"

"کیا بتاؤں؟ ــــــ فرخ بھائی تو ایسے جا کر بیٹھے ہیں کہ کسی طرح آنے کا نام ہی نہیں لیتے!"

"وہ ہوتا تو کیا کر لیتا؟"

"واہ ــــــ وہ سب کچھ کر لیتے، ان کی موجودگی میں نسیم کو اتنی جرأت ہو سکتی تھی؟ ــــــ کوئی خط بھی نہیں آیا، میرے خیال میں ان کی نوکری لگ گئی ہے، سوچتے ہوں گے، دو تین مہینہ کی تنخواہ جمع کر کے جاؤں اور اپنی اماں جان کے قدموں پر لے جا کر ڈال دوں، اور ان کی دعائیں لوں!"

"نہیں بیٹی، میں بہت پریشان ہوں!"

"کیوں چچی؟"

"نہ وہ آیا نہ اس کا خط آیا، آخر بات کیا ہے؟"

"کوئی خاص بات نہیں، وہ یہ بھی تو کہہ رہے تھے کہ امتحان سے فارغ ہونے کے بعد بعض تاریخی شہروں کی سیر کرتے ہوئے آئیں گے، اور اس پروگرام میں

مہینہ ڈیڑھ مہینہ کی مدت لگ جائے گی ـــــ اس شوق کو پورا کرنے کے لئے ابا جان نے انہیں ڈیڑھ ہزار روپیہ بھی الگ سے دیا تھا۔

" واقعی ؟ "

" ہاں چچی جان !"

" لیکن نہ بھیا (صمد) نے کبھی ذکر کیا نہ فرخ نے، نہ تو تے ! ـــــ یہ تو آج سُن رہی ہوں !"

" ابا بھلا کیوں ذکر کرتے ؟ ان کے لئے تو یہی کافی تھا کہ فرخ یہ چاہتا ہے خود فرخ بھائی نے یوں ذکر نہیں کیا کہ آپ اتنے لمبے پروگرام کی اجازت نہ دیتیں، رہی میں تو ان کی رازدار جو تھی ـــــ"

" کیا اس نے تجھے منع کر دیا تھا !"

" (مسکراتے ہوئے) جی ـــــ انہوں نے کہا تھا، اماں کو ہرگز بھنک نہ لگے میرے تاریخی شہروں کے تفریحی پروگرام کی !"

" اچھا تو یہ بات ہے !"

" جی اسی لئے تو میں پریشان نہیں ہوں، انشاءاللہ چند روز میں ضرور آجائیں گے !"

" لیکن اس کا خط بھی تو نہیں آیا ـــــ اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے ؟"

" مسافرت ـــــ آج یہاں کل وہاں، بھلا مسافرت کے عالم میں خط و کتابت جاری رکھنے کا ہوش رہتا ہے کسی کو !"

" یہ تو ٹھیک ہے ـــــ لیکن غضب خدا کا، یہاں اتنا بڑا سانحہ ہو گیا، اور وہ سیر گشت کر رہا ہے ؟"

" میرے خیال میں اب تک انہیں ابا جان کے حادثۂ وفات کی اطلاع نہیں ملی، اخبارات اور ریڈیو سے انہیں کوئی خاص دلچسپی نہیں، ہوائی حادثہ کا یونہی کسی سے ذکر سُن لیا ہوگا، اور بھول گئے ہوں گے کہ کیا ہوا ؟"

" ہاں یہ ہو سکتا ہے، لیکن بیٹی میں چاہتی ہوں وہ جلد آئے میں یہاں سے نکلوں ؟"

غزالہ بگڑ گئی، " چچی جان آئندہ ایسی بات نہ کیجئے گا ؟"

(۱۱)

دوسرے روز غوثیہ اور مرتضیٰ اس گھر سے رخصت کر دیئے گئے۔

تیسرے دن نسیم کا بستر بندھا اور وہ چپ چاپ روانہ ہو گیا، بغیر کسی سے ملے اور کسی سے کچھ کہے ہوئے۔

نسیم کے جانے کے بعد امجد میاں غزالہ کے کمرے میں پہنچے، انھوں نے کہا "بیٹی غوثیہ اور مرتضیٰ کو میں نے چلتا کر دیا، جو تنخواہ ان کی نکلتی تھی وہ ہاتھ پر رکھی اور کہا جاؤ بھئی ٹھنڈے ٹھنڈے چلے جاؤ!"

غزالہ بولی۔

"کسی آدمی کو نکالتے ہوئے بڑا دکھ ہوتا ہے مجھے سچ پوچھئے، تو اب میرا دل کڑھ رہا ہے، ان دونوں کے لئے، لیکن ان کے لسور طریقے اتنے غیر مہذب اور ناپسندیدہ تھے کہ مجبوراً یہ فیصلہ کرنا پڑا۔"

امجد میاں نے پھر اسے محبت بھری نظروں سے دیکھا اور فرمایا۔

"ماشاءاللہ —— خدا نظر بد سے بچائے تجھے، تیرے یہ خیالات تیرا یہ سبھاؤ، تیری یہ آن، شان، تیرا یہ وقار اور دبدبہ، تیرا یہ جلال و جمال —— خدا کی قسم تجھے تو کسی بادشاہ کے گھر میں پیدا ہونا چاہیئے تھا —— اور یوں تو کسی شہزادی سے کم کب ہے؟"

غزالہ بھلا اس قصیدہ کا جواب کیا دیتی،

ذرا دیر خاموش رہ کر امجد میاں نے کہا۔

" ہاں بیٹی، وہ پاپی نسیم بھی چلا گیا —— تیرا مجرم!"

غزالہ نے کہا۔

" مجھے افسوس ہے —— لیکن تایا جی اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ تھا، ان کا یہاں سے جانا تو ان کے اور میرے اور دونوں کے لئے مفید ہوا۔"

امجد میاں نے ایک ٹھنڈی سانس لی،

" مفید ہو یا مضر، سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ تجھے جس کا وجود ناپسند ہو، وہ اس گھر کے احاطہ میں قدم نہیں رکھ سکتا، اگر تو چاہے تو مجھے کھڑے کھڑے نکال سکتی ہے!"

غزالہ کو شرم آنے لگتی ان باتوں پر،

" اپنا نام بیچ میں نہ لے آیا کیجئے تایا جی! —— آپ ایسی باتیں کرتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے، میں زمین میں گڑی جا رہی ہوں!"

امجد میاں ہنستے ہوئے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھتے چلے گئے!

(۱۲)

حالات پھر اپنے معمول پر آ گئے، گھر کا چھنا ہوا سکون پھر اسے واپس مل گیا نسیم اور غوثیہ کی وجہ سے جو ہنگامہ آرائیاں اس گھر کا معمول بن گئیں تھیں، وہ یک لخت بند ہو گئیں، دو ہی روز میں ایسا معلوم ہوا، جیسے یہاں کسی طرح کی بدمزگی اور بے لطفی کبھی سرے سے ہوئی ہی نہیں تھی۔

جب سے صمد کا انتقال ہوا تھا۔ عز الہ، گھر سے گویا باہر نہیں نکلی تھی، اس کی سہیلیاں کبھی کبھی آ جاتیں، لیکن وہ نہ جاتی آج بہت دنوں کے بعد وہ توقیر کے ساتھ اس کی ضد سے مجبور ہو کر اس کے گھر ذرا دیر کو چلی گئی تھی۔ واپسی پر اس کی نظر اس شاندار بورڈ پر پڑی، جو اس کی دوکان کی پیشانی پر نصب تھا جس کا انتظام صمد کے بعد سے اب تک نسیم کرتا چلا آیا تھا، اور اب۔ براہِ راست امجد میاں اس کے انچارج تھے۔

جی میں آئی کہ چلو، ذرا دیکھو تو سہی دوکان کی کیا حالت ہے؟ روبہ ترقی ہے یا مائل بہ زوال؟

اندر داخل ہوئی تو ملازموں نے ہاتھوں ہاتھ لیا، پیشوائی کرتے ہوئے اسے لائے اور اس کمرے میں بٹھا دیا، جہاں کبھی صمد اپنی زندگی میں بیٹھا کرتا تھا۔

دوکان کے مینجر کا نام توکل حسین تھا، یہ صمد کے معتمد آدمیوں میں تھا اور جب سے دوکان قائم ہوئی تھی۔ نہایت وفاداری، محنت اور فرض شناسی کے ساتھ

کام کر رہا تھا، صمد اکثر کہا کرتا تھا، اس دوکان کی ترقی درحقیقت توکل کی محنت اور دیانت کا نتیجہ ہے۔

غزالہ نے سیلز مین سے کہا۔

"توکل صاحب کہاں ہیں انہیں بلاؤ۔"

سیلز مین نے حیرت سے غزالہ کی طرف دیکھا اور گویا ہوا۔

"وہ تو الگ کر دیئے گئے!"

غزالہ چونک پڑی،

"الگ کر دیئے گئے؟ —— کب؟ کس نے نکالا انہیں؟"

اس نے جواب دیا۔

"پندرہ دن ہو گئے نسیم میاں خفا ہو گئے ان سے اور کھڑے کھڑے چلتا کر دیا —— !"

"کس بات پر نسیم میاں خفا ہوئے تھے؟"

"دوکان میں جو ریفریجریٹر تھا وہ بڑا قیمتی تھا، صمد میاں نے ولایت سے منگوایا تھا، اس میں خاص خاص دوائیں اور دوسری خراب ہونے والی قیمتی چیزیں رکھ دی جاتی تھیں تو وہ اپنی حالت پر رہتی تھیں، اور اچھے داموں پر فروخت ہوتی تھیں۔! نسیم میاں ایک روز ٹرک لے کر آئے اور وہ ریفریجریٹر اٹھوا کر اس میں رکھ دیا اور اسے رحمت پور بھیج دیا توکل صاحب نے کہا۔ یہ ہزاروں روپیہ کی چیز جس کی دوکان کو ضرورت بھی ہے۔ آپ کیوں رحمت پور بھیجے دے رہے ہیں ——"

"ٹھیک کہا، پھر؟"

"پھر نسیم میاں نے انہیں گالیاں دیں اور نکال دیا۔"

"لیکن وہ مجھ سے کیوں نہیں ملے!"

"ارادہ تو تھا ان کا وہ کہہ بھی رہے تھے۔ ——"

"پھر ——؟"

"نسیم میاں نے کہا، اگر گھر کے احاطہ میں تم نے قدم رکھا تو شکاری کتوں سے نچوا دوں گا، پھر نہیں گئے بیچارے!"

"وسیل روز کے روز بنک میں جاتی ہے؟"

"ایک دن بھی نہیں گئی!"

"پھر کیا ہوتی ہے؟"

"پہلے تسنیم میاں لے جاتے تھے، اب امجد میاں ——— بہت سے بل چڑھے ہوئے ہیں ان کی ادائیگی نہیں ہوئی۔ لوگ تقاضہ کو آتے ہیں، اور جھڑکیاں کھا کر واپس چلے جاتے ہیں، وہ کہتے ہیں ایسا تو صمد صاحب کی زندگی میں کبھی نہیں ہوا۔"

"آخر یہ چیزیں میرے علم میں کیوں نہیں لائی جاتیں؟"

"کس میں اتنی ہمت ہے کہ شکاری کتوں کا مقابلہ کرتا ہوا، آپ کی خدمت میں حاضر ہو؟"

عزالہ اٹھ کھڑی ہوئی اس نے چلتے ہوئے کہا۔

"توکل صاحب کا گھر جانتے ہو؟"

وہ بولا،

"جی ہاں جانتا ہوں!"

عزالہ نے ہدایت کی،

"ان سے کہو، کل ٹھیک گیارہ بجے یہاں پہنچ جائیں میں ان کا انتظار کر رہی ہوں گی، دیکھوں گی میرے سامنے کون انہیں روکتا ہے!"

---

(۱۳)

دوسرے روز ٹھیک وقت پر غزالہ دوکان پر پہنچ گئی اور صمد والے کمرہ میں جاکر بیٹھ گئی، اس کے آنے کے تھوڑی دیر بعد توکل بھی آگیا۔ غزالہ نے اس سے کہا۔

"ابا جی آپ کو کتنا مانتے تھے، لیکن آپ نے ان کی وفات کے بعد جھانکا بھی نہیں آکر ——— !"

توکل کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے کہا۔

"میں تو ہزار مرتبہ آتا، کئی دفعہ میں نے آنے کی کوشش بھی کی، لیکن مجھے روک دیا گیا، منع کر دیا گیا ——— !"

غزالہ نے پوچھا۔

"کیوں ؟"

وہ بولا،

"رموز مملکت خویش خسرواں دانند ——— مجھ سے تو یہ تک کہا گیا کہ اگر تم نے گھر کے احاطہ میں قدم رکھا تو شکاری کتے تمہارا استقبال کریں گے !"

"اور آپ ڈر گئے ؟"

"نہیں ڈرا تو نہیں، لیکن میں نے سوچا، ایسی بات کرنے سے کیا حاصل جس کا نتیجہ کچھ نہ ہو، امجد میاں اور نسیم صاحب دوکان کے اور تمام چیزوں

کے مالک بن ہی چکے ہیں!"

غزالہ نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا۔

"یہ غلط فہمی کیوں ہوئی آپ کو؟"

توکل نے کہا۔

"صاحب اس میں غلط فہمی کا کیا سوال ہے۔ یہاں کا روپیہ بینک کے بجائے اُن کی جیب میں جائے۔ یہاں کی قیمتی چیزیں رحمت پور بھیج دی جائیں، جب تک صمد میاں زندہ رہے کبھی بھولے سے بھی بلیک نہیں ہوئی، اس دوکان پر اب دھڑلے سے ہوتی ہے ——— یہ اختیارات کیا مالک کے سوا کسی اور کو بھی ہو سکتے ہیں!"

غزالہ نے کہا۔

"میں حساب کتاب سمجھنا چاہتی ہوں، جب سے اب تک کا!"

توکل اکاونٹنٹ کو بلا لایا، توکل کی مدد سے غزالہ نے ڈیڑھ دو گھنٹہ کی جدوجہد کے بعد اندازہ لگایا کہ صمد کے انتقال کے وقت دوکان میں ڈھائی لاکھ روپیہ کا مال تھا، اب مشکل سے چالیس ہزار کا ہے، نقد روپیہ تجوری میں پینتیس ہزار تھا، اب کچھ نہیں ہے۔ شہر کے مختلف قابلِ اعتماد اشخاص پر سات آٹھ ہزار روپے اُدھار تھے اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا تھا، یہ رقم تمنی سے وصول کی گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں نے دوسری دوکان میں کھاتہ کھول لیا۔ دوکان میں دوسری جگہوں سے جو مال آتا تھا، وہ ہمیشہ نقد آتا تھا، اب ہر جگہ سے اُدھار آتا ہے، اور اس کی مجموعی میزان تقریباً ستّر ہزار روپے، گویا وصول کچھ نہیں کرنا ہے اور دینا ستّر ہزار ہے اور مالیت صرف چالیس ہزار کی ہے اور نقد ایک پیسہ نہیں!"

غزالہ نے حساب سمجھنے کے بعد کہا۔

"اس کے معنی تو یہ ہیں کہ بہت جلد دوکان کا دیوالہ نکلنے والا ہے!"

توکل نے بتایا۔

"جی ہاں تسنیم صاحب کہہ بھی رہے تھے!"

غزالہ نے پوچھا
"کیا کہہ رہے تھے ؟"
توکل نے کہا۔
"کہہ رہے تھے یہاں سے کاروبار سمیٹ کر رحمت پور میں باقاعدہ کام کریں گے۔ بلکہ دو چار دلالوں کو بھی چھوڑ رکھا ہے کہ وہ کوئی اچھا گاہک اس دوکان کا تلاش کریں! ـــــ اور میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ ـــــ"
غزالہ نے پوچھا،
"کیا سُنا ہے ؟"
ذرا جھجکتے ہوئے توکل نے کہا۔
"یہ کہ آپ بھی وہیں آباد ہوں گی!"
یہ سُن کر غزالہ کا چہرہ سُرخ ہوگیا،
"اس طرح کی واہیات باتیں کیوں سنتے ہیں آپ ؟ ـــــ بہرحال دوکان کی حالت سنبھلنی چاہیئے!"
توکل نے پُرجوش طریقہ پر کہا،
"اگر آپ چاہیں گی تو ضرور سنبھل جائے گی، لیکن ایک شرط ہے!"
"وہ کیا ؟"
"آپ خود سنبھالیں ـــــ گری ہوئی ساکھ اسی طرح لوٹ سکتی ہے!"
"ہاں یہ ہوگا ـــــ میں روز آیا کروں گی!"
"بس تو پھر سب ٹھیک ٹھاک ہوجائے گا!"
"آپ اسی وقت سے حسبِ سابق کام شروع کر دیجئے!"
"شروع تو کر دوں لیکن امجد میاں ؟ ـــــ"
"دوکان کی مالک میں ہوں امجد میاں نہیں، ملازموں کا تقرر اور تنزل میرے حکم کا تابع ہے، میں خود روز آؤں گی، دیکھ بھال کروں گی، جو مشکل پیش آئے مجھ سے بیان کی جائے تمام لین دین میری اجازت اور میرے دستخطوں سے کیا جائے!"
توکل نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

"ایسا ہی ہوگا!"

کچھ سوچتی ہوئی غزالہ بولی، لیکن اسٹاک بڑھانے اور مال خریدنے کے لئے کچھ روپیہ بھی تو چاہیئے، وہ کہاں سے آئے گا۔"

توکل نے کہا۔

"اس کی فکر نہ کیجئے، ایک پیسہ بھی لگانا نہیں پڑے گا، کون ہے، جو صمد میاں کے نام پر قرض نہ دے؟ ہم قرض مال لائیں گے اور اس کو بیچ کر نیا اور پرانا قرضہ ادا کریں گے، بس شرط یہ ہے کہ سیل بنک میں جائے جیب میں نہیں!"

غزالہ جانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی اس نے کہا۔

"ایسا ہی ہوگا!"

(۱۴)

دوسرے دن غزالہ جب دوکان پر جانے لگی تو امجد میاں سامنے آ کر کھڑے ہو گئے، انہوں نے شفقت کے لہجہ میں پوچھا۔
"بیٹی کل تم دوکان گئی تھیں ——!"
غزالہ نے مختصر سا جواب دیا،
"جی گئی تھی!"
امجد نے پھر سوال کیا،
"آج بھی جاؤ گی؟"
غزالہ نے کہا۔
"وہیں جا رہی ہوں!"
امجد کے چہرے پر کسی طرح کی برہمی، خفگی، ناراضگی یا غصہ کے آثار نہیں تھے، انہوں نے دریافت کیا۔
"کیا توکل کو تم نے پھر ملازم رکھ لیا؟"
غزالہ نے اقرار کر لیا،
"جی ہاں —— وہ ابا میاں کے زمانہ کا آدمی ہے، ایماندار بھی ہے اور وفادار بھی!"
امجد میاں نے بڑے زور سے تائید میں گردن ہلائی،

'ہاں بیٹی میں جانتا ہوں، خوب جانتا ہوں ـــــ وہ پاپی نسیم ہے نا، وہی اُلجھ پڑا تھا اس مردِ شریف سے، میں خود بھی سوچ رہا تھا کہ توکل کو بلا لوں گا، نسیم نے سارا کام چوپٹ کر دیا، توکل انشاءاللہ سنبھال لے گا، اچھا ہوا میرے بلانے سے پہلے تم ہی نے بلا لیا۔

غزالہ نے ان باتوں کے جواب میں کچھ نہیں کہا، امجد اپنے کمرہ میں واپس جانے لگا، لیکن جاتے جاتے اُسے کچھ یاد آیا، پھر واپس آگیا۔

"ہاں بیٹی تو اب میں بھی رحمت پور چلا جاؤں ؟"

غزالہ نے پوچھا۔

"کیوں ؟ ـــــ آپ کیوں جانا چاہ رہے ہیں ؟"

بڑے نرم اور ملائم لہجہ میں امجد نے کہا۔

"اب میری کیا ضرورت ہے ؟ جس مقصد کے لئے میں نے یہاں کا قیام اختیار کیا تھا، الحمدللہ وہ پورا ہو گیا، تم اس قابل ہو گئیں کہ اپنا کام سنبھال سکو، رہ گیا میں تو ویسے ہی بوڑھا اور از کار رفتہ تھا، یہاں نہ پڑا رہا، رحمت پور پڑا رہوں گا ـــــ باقی اگر کبھی میری ضرورت ہو تو آدھی رات کو بھی تمہاری آواز سن کر دوڑا آؤں گا ـــــ میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر کبھی آ نہ سکوں !"

غزالہ اب امجد سے بھی تنگ آچکی تھی، دوکان کا حالِ زار دیکھ کر تو اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی تھی، ان باپ بیٹوں نے مل کر ستیاناس کر دیا تھا اس کا لاکھوں روپیہ کا یہ نقصان تو صرف دوکان میں ہوا تھا، اس کے علاوہ بلڈنگوں، باغوں، کھیتوں، اور دوسری جائیداد و املاک کا ان لوگوں نے نہ جانے کیا حال بنا دیا ہوگا ؟ اس نے کہا۔

" اپنے مصالح اور ضروریات آپ خود ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں، اگر آپ واقعی رحمت پور جانا چاہتے ہیں تو میں کیسے روک سکتی ہوں ـــــ لیکن جانے سے پہلے مجھے صحیح حالات تو معلوم ہو جانے چاہئیں، دوکان تو بالکل چوپٹ ہو گئی رہی دوسری جائیداد و املاک اس کا کیا حال ہے ؟ فائدہ ہے یا نقصان ہے ؟ آمدنی ہوئی

یا نہیں ؟ ہم پر دوسروں کی رقمیں چڑھی ہیں یا دوسروں پر ہماری رقمیں باقی ہیں ؟ یہ ساری تفصیلات بتائیے اور دوسرے آدمی کو سمجھائے بغیر آپ کیسے چلے جائیں گے ـــــ؟"

امجد نے ایک مرتبہ پھر بڑے زور سے اپنا کمزور اور بوڑھا سر ہلایا پھر کہا۔

"میں سمجھا، میں سمجھا ـــــ بیٹی تمہارا مطلب یہ ہے کہ باقاعدہ چارج دیکر جاؤں، بات تو تم نے بڑی قانونی کی ہے، میں قدر کرتا ہوں، اس صاف گوئی کی ـ!"

پھر ذرا رُک کر امجد میاں نے کہا۔

"دراصل میں فرخ کا انتظار کر رہا تھا !"

غزالہ نے پوچھا۔

"ان کا انتظار کیوں کر رہے تھے آپ ؟"

امجد میاں نے کہا۔

"اس لئے کہ چارج اسی کو دیتا تو زیادہ بہتر تھا ؟"

غزالہ کی بھنویں تن گئیں۔

"جی نہیں ـــــ اپنے معاملات کی میں ذمہ دار ہوں نہ آپ، نہ فرخ بھائی، نہ کوئی اور !"

(۱۵)

غزالہ دوکان چلی گئی، اس کے جانے کے بعد امجد میاں نے سلمیٰ کے کمرہ میں قدم رکھا، وہ ان حالات سے قطعاً لاعلم تھی جو کل اور آج پیش آئے تھے۔ امجد میاں کا اس کے کمرے میں آنا یقیناً کسی غیر معمولی حادثہ کا پیش خیمہ تھا، بہرحال وہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی، امجد میاں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کیوں بھائی صاحب!"

امجد میاں نے زہرخند کرتے ہوئے اس کے الفاظ دہرائے،

"کیوں بھائی صاحب!"

پھر نہایت اطمینان سے اس ڈنڈے کے سرے پر جو ان کے ہاتھ میں تھا، انہوں نے اپنی مٹھی رکھی اور اس مٹھی پر ٹھوڑی ٹیکتے ہوئے اس طرح اسے گھورا جیسے کوئی فوٹو گرافر تصویر اُتارتے وقت دیکھتا ہے، پھر پان کی پیک تھوکتے ہوئے فرمایا۔

"سلمیٰ ـــــ"

وہ بولی،

"جی بھائی صاحب!"

فرمایا۔

"میں ہار گیا!"

سلمیٰ نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا اور کہا۔
" یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ؟ کس سے ہار گئے آپ ؟"
اسی طرح بیٹھے بیٹھے امجد میاں نے کہا۔
" تم جیت گئیں میں ہار گیا !"
سلمیٰ کے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی یہ سُن کر،
" نہ جانے کیا کہہ رہے ہیں آپ ؟"
امجد نے بڑے ٹھنڈے لہجہ میں کہا۔
" اتنی بھولی نہیں، ہو جتنی نظر آتی ہو، بس کی پڑیا جو مشہور ہے، وہ تم ہی ہو بس کی گانٹھ جسے کہتے ہیں وہ بھی صرف تم ہو، عیار، مکّار، غدار جسے کہتے ہیں، وہ تمہارا ہی دوسرا نام ہے، خدا نے وہ ساری خوبیاں جو ایک انتہائی کمینی اور رذیل عورت میں ہوتی چاہئیں، بڑی فیاضی سے تمہاری ذات میں بھر دی ہیں۔"
سلمیٰ کا چہرہ سُرخ ہو گیا، یہ باتیں سُن کر اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔
"کیا آپ اسی لئے آئے تھے ؟"
امجد میاں نے پہلو بدلتے ہوئے فرمایا۔
" یہ باتیں تو روانی سخن میں نکل گئیں میرے منہ سے، ورنہ آیا تو تھا تم سے صلح کرنے۔ اب میں تمہاری طرف صلح کا ہاتھ بڑھا رہا ہوں، چاہو اسے قبول کر لو، چاہو جھٹک دو !"
سلمیٰ کو ان باتوں پر بڑی حیرت ہوئی، وہ سوچنے لگی۔
"کیسی صلح ؟ کیسی جنگ، آخر آج بھائی صاحب کو ہو کیا گیا ہے ؟"
امجد نے اُسے غرق تفکّر دیکھ کر کہا،
" صلح کر لو گی تو فائدہ میں رہوں گی، دشمنی قائم رکھو گی تو یقین کرو۔ تمہارا ،ور فرخ کا اس دُنیا میں پتہ نشان بھی نہ ہو گا، خود بھی ڈوبو گی، اپنے ساتھ فرخ اور غزالہ کی جان بھی لو گی۔"
سلمیٰ سہم گئی،
" بھائی صاحب آپ کیا کہہ رہے ہیں ؟"

نہایت اطمینان سے امجد نے کہا۔

" یقین رکھو نہ پاگل ہوں، نہ سٹھیا گیا ہوں، ہوش میں ہوں اور بڑے پتہ کی باتیں کہہ رہا ہوں!"

بے بسی کے ساتھ سلمیٰ نے کہا۔

" لیکن میں تو کچھ نہیں سمجھی!"

امجد نے کہا۔

" ابھی سمجھائے دیتا ہوں، چٹکی بجانے میں ——— پہلے یہ بتاؤ ہمارے درمیان صلح رہے گی یا جنگ؟"

سلمیٰ نے کہا۔

" جنگ کا کوئی سوال ہی نہیں، اور صلح بھی اس وقت ہوتی ہے جب پہلے جنگ ہو چکی ہو، میں نے کبھی آپ سے جنگ کی نہیں، پھر بھی اگر میرے جواب کا انحصار انہی دونوں الفاظ میں سے کسی ایک پر ہے تو صلح ———"

امجد میاں خوش ہو گئے انہوں نے کہا۔

" ٹھیک ہے، معاملہ فہم معلوم ہوتی ہو، کیا لوگی؟ بے تکلف کہہ دو، پانچ ہزار، دس ہزار، بیس ہزار ——— یہ پچاس ہزار تک دے دوں گا!"

اب تو واقعی سلمیٰ کو امجد کی سلامتی ہوش و حواس پر شبہ ہونے لگا، وہ سوچنے لگی ضرور بڑے میاں کا دماغ چل گیا ہے، لیکن وہ جواب لینے پر تلے بیٹھے تھے، اور جو بات سمجھ ہی میں نہ آئے اس کا جواب کیا ہو سکتا ہے؟

امجد نے کہا۔

سلمیٰ جلدی فیصلہ کر لو، اگر پچاس ہزار سے زائد چاہئیں تو پھر صلح کے بجائے جنگ کو ترجیح دوں گا!"

سلمیٰ نے جواب دیا۔

" لیکن بھائی صاحب آپ پچاس ہزار کہہ رہے ہیں، مجھے پیسہ بھی نہیں چاہیئے!"

امجد نے پوچھا،

"ایک پیسہ بھی نہیں چاہیئے؟"
سلمیٰ نے جواب دیا۔
"جی ہاں ــــ کچھ نہیں چاہیئے!"
امجد گویا ہوا،
"اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ تم صلح نہیں چاہتیں؟"
سلمیٰ نے کہا۔
"یہ تو اچھی زبردستی ہے بھائی صاحب ــــ آخر آپ کس طرح راضی ہوں گے؟ جو کہیئے میں وہی کہہ دوں!"
امجد سلمیٰ سے ذرا اور قریب آگیا، اس نے کہا۔
تمہیں روپیہ چاہیئے میں دیتا ہوں لے لو، اس روپیہ سے گلچھرے اڑاؤ، مزے کرو، فرخ کو تجارت کراؤ، جو چاہو کرو ــــ لیکن ایک شرط ہے!"
سلمیٰ بولی،
"وہ بھی کہہ دیجئے۔"
امجد نے کہا۔
"وہ شرط یہ ہے کہ غزالہ کا خیال دل سے نکال دو!"
سلمیٰ چونک پڑی،
"جی بھائی صاحب؟ ــــ کیا کہا آپ نے؟"
امجد نے کہا۔
"غلط نہیں کہا ــــ غزالہ تمہیں نہیں مل سکتی، وہ نسیم کی بیوی بنے گی، خوشی سے بن جائے تو ٹھیک ہے، نہ مانی تو مجھے زبردستی کرنی بھی آتی ہے، تم راستہ سے ہٹ جانے کا اقرار کر لو تو پچاس ہزار روپے اسی وقت دینے کو تیار ہوں، اگر اس کے خیالِ خام میں مبتلا رہیں تو ــــ ایک پیسہ تمہیں ملے گا بلکہ تمہاری اور فرخ کی ایسی عبرت انگیز گت بنے گی کہ عمر بھر یاد رکھو گی!"
سلمیٰ حیران پریشان امجد میاں کو تک رہی تھی،
"سوچ لو، خوب سوچ لو، اچھی طرح سے غور کر لو، میں تمہیں مہلت دے سکتا

ہوں، لیکن یہ بات طے ہے کہ تم غزالہ کو نہیں پا سکتیں، وہ فرخ کی دلہن نہیں بن سکتی، خون کی ندیاں بہ جائیں گی ——— ہاں !"

سلمیٰ نے کہا۔

"لیکن بھائی صاحب اگر آپ نسیم کی شادی غزالہ سے کرنا چاہتے ہیں تو ہم کو کیا عذر ہو سکتا ہے؟ اگر غزالہ اس سے شادی کرنے پر رضامند ہے تو مجھے خوشی ہی ہوگی ———"

"سچ کہتی ہو تم؟"

"بالکل سچ!"

"پھر کہو ایک دفعہ؟"

اگر نسیم اور غزالہ کی شادی ہو جائے، تو مجھے کوئی عذر نہیں سمترالہ ماشاءاللہ خود جوان اور ہوشیار ہے، وہ اپنے بارے میں جو فیصلہ چاہے کر لے "

امجد میاں نے ٹوکا،

"پھر آ گئیں حرامزادگی پر ——— ؟ غزالہ کی رضامندی کی رٹ کیوں لگا رہی ہو؟"

"تو کیا بغیر رضامندی کے وہ کسی سے شادی کر لے گی؟ ——— میں نے جہاں تک اس کے مزاج اور طبیعت کو سمجھا ہے، وہ جبر و جور سے تو کوئی بات بھی نہیں مان سکتی؟"

"تمہاری اور غزالہ دونوں کی ایسی تیسی، غزالہ کے اچھوں کو شادی کرنا پڑے گی نسیم سے ——— وہ پیدا نسیم کے لئے ہوئی تھی، مجال ہے اس کی کہ نسیم کو ٹھکرا دے!"

"خیر، ہوگا ——— آپ جانیں اور غزالہ مجھے اس سے کیا سروکار ——— رہا فرخ کا معاملہ تو بھائی صاحب ہم ٹھہرے غریب لوگ، ہم اتنے اونچے نہیں اڑ سکتے کہ غزالہ کا خواب دیکھیں، نہ کبھی فرخ ایسی جرأت کر سکتا ہے، نہ میں!"

"(خوش ہو کر) سچ کہتی ہو؟"

"غلط کیوں کہوں گی؟"

"ٹھیک ہے میں تمہاری بات کا اعتبار کرتا ہوں؟"

"شکریہ!"

"اب معاملہ کی بات کرو!"

"جی فرمایئے!"

"بتاؤ ــــ کیا چاہیئے تمہیں؟"

"کچھ نہیں!"

"اس کے معنی یہ ہیں کہ تم مجھے فریب دے رہی ہو؟"

"یہ کیوں؟"

"ظاہر یہ کر رہی ہو کہ غزالہ کا خواب نہیں دیکھ سکتیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اپنے داؤں پیچ سے غافل نہیں ہو!"

"آج تو آپ عجیب قسم کی باتیں کر رہے ہیں!"

"بات یہ ہے کہ آج میں تم سے ہر حالت میں فیصلہ کر لینا چاہتا ہوں یا ادھر یا اُدھر!"

"میں نے کہہ تو دیا کہ میں غزالہ کو اپنی بہو بنانے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتی!"

"یہ فیصلہ بہت دُور اندیشی پر مبنی ہے، میں مبارکباد دیتا ہوں!"

"پھر اس کے بعد اور کیا چاہیئے آپ کو؟"

"سودا پختہ کرنا چاہتا ہوں!"

"میں کسی طرح کا سودا کرنا نہیں چاہتی!" ــــ میں نے اپنے خیالات ظاہر کر دیئے، اور یقین کیجئے ان میں کسی طرح کا دغل فصل نہیں ہے ــــ"

"یقین تو اسی وقت کروں گا، جب معاہدہ ہو جائے گا!"

"تو کیا آپ مجھ سے کوئی تحریر لینا چاہتے ہیں؟"

"نہیں ــــ تحریر کی کیا ضرورت ہے؟"

"پھر کیا مقصد ہے آپ کا کچھ معلوم تو ہو!"

"یہ کہ جو کچھ تم کہہ رہی ہو، وہ صحیح ہے!"

"کہیئے تو قسم کھالوں!"

"نہیں قسم کی بھی ضرورت نہیں ہے!"

"پھر ——— ؟"

"بس صرف یہ کہ اپنے اس عہد پر قائم رہنے کی قیمت مجھ سے وصول کر لو، ابھی میں نے کہا تھا کہ پچاس ہزار سے زیادہ ایک پیسہ بھی نہیں دوں گا، اب تمہاری باتوں سے متاثر ہو کر میں دس ہزار اور بڑھائے دیتا ہوں، ساٹھ ہزار دے دونگا!"

سلمیٰ نے ذرا جھلاتے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"آپ کا شکریہ کہ آپ مجھے ساٹھ ہزار دے رہے ہیں، لیکن میرے گلے پر چھری پھیر دیجئے، جب بھی میں یہ رقم نہیں لوں گی، ساٹھ ہزار تو ساٹھ ہزار، لاکھ کر دیجئے، جب بھی میں نظر تک نہ ڈالوں گی، آپ کے سونے کے توڑوں پر!

میں اگر غزالہ کا خواب نہیں دیکھ سکتی تو اس لئے نہیں کہ آپ سے ڈرتی ہوں، آپ سے خائف ہوں، اس لئے کہ میں اس قابل نہیں ہوں، فرخ اس کا اہل نہیں ہے، وہ ہیرا ہے، میں خاک ہوں، وہ موتی ہے، فرخ ذرّۂ بے مقدار ہے، باقی رہا آپ کا اور نسیم کا اور غزالہ کا معاملہ تو اس میں اس صورت میں تو بے شک دخل نہیں دوں گی کہ غزالہ اس رشتہ پر رضامند ہو ———"

"(غصہ سے) اور اگر رضامند نہ ہو!"

"اور اگر رضامند نہ ہو تو پہلے میری جان اس پر قربان ہو گی، پھر اُسے کوئی آنچ پہنچ سکے گی، میں اسے تنہا اور بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتی!"

"یہ تمہارا فیصلہ ہے؟"

"جی ہاں، بالکل اٹل!"

"اس پر نظر ثانی کرنے کا کوئی امکان نہیں۔"

"بالکل نہیں!"

امجد نے سلمیٰ کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا، پھر سر پر دستِ شفقت پھیرا، پھر ایک قہقہہ لگایا اور کہا۔

"تو امتحان میں کامیاب رہی، میں تیرا امتحان لے رہا تھا!"

پھر فرمایا۔

"بیٹی تیرے ہاتھ کے پان میں بڑا سواد ہوتا ہے، ایک پان لگا دے ...!" سلمیٰ پان لگانے لگی، وہ حیران تھی کہ یہ پیر تسمہ پا ہے کیا چیز؟ اس کی کس بات کو سچ سمجھا جائے؟ اس کا اصلی روپ کیا ہے؟ یہ آج تک نہ معلوم ہو سکا!

(۱۶)

اب یہ روز کا معمول ہو گیا تھا کہ غزالہ باقاعدہ دوکان جاتی، وہاں کافی وقت صرف کرتی، تمام معاملات کی دیکھ بھال اور نگرانی براہ راست اس نے اپنے ذمہ لے لی تھی، توکل پرانا اور معتمد آدمی تھا، اس کی مدد سے بہت جلد حالات پر اس نے قابو پالیا، امجد میاں نے اب دوکان کا آنا جانا بالکل ترک کر دیا تھا، وہ گھر پر بیٹھے رہتے، یا شہر میں چند دوست جو انہوں نے پیدا کر لئے تھے، ان کے ہاں قصہ کہانی بیان کیا کرتے، گھر میں کسی سے بات چیت نہ کرتے، ہاں اگر غزالہ خود کوئی بات دریافت کرتی، یا سلمیٰ کسی کام کو کہتی تو انتہائی محبت و شفقت اور مستعدی کے ساتھ، جواب بھی دیتے اور کام بھی کر دیتے، صاف ظاہر ہو رہا تھا اپنے کئے پر نادم ہیں، ان کی یہ ندامت دیکھ کر غزالہ نے اس نقصان عظیم کے بارے میں کچھ پوچھ گچھ نہیں کی، جو نسیم کے ہاتھوں امجد میاں کی سرپرستی میں پہنچ چکا تھا۔

ایک روز اس نے سلمیٰ کو جب یہ ساری داستان سنائی تو سلمیٰ نے کہا۔

"بیٹی بڑا دل ہے تمہارا جو اتنا بڑا نقصان یوں چپ چپاتے برداشت کر لیا ــــ کوئی اور ہوتا تو قیامت برپا کر دیتا، اور دونوں باپ بیٹے کو ناکوں چنے چبوا دیتا!"

غزالہ نے جواب دیا۔

"چچی جان یہ سب کچھ کر تو میں بھی سکتی ہوں، آج اشارہ کر دوں تو دونوں بندھے بندھے پھریں بلکہ جیل ہو جائے دونوں کو، لیکن مجھے تایاجی کی سفید داڑھی پر ترس آجاتا ہے وہ کیسے بھی ہوں، بہرحال میرے باپ کے بڑے بھائی ہیں، ہمیں کوئی ایسا کام کرنا نہیں چاہیئے، جس کا انجام اُن کے حق میں بُرا ہوا۔ ایک لڑکا ہے۔ وہ ویسے ہی نالائق نکل گیا، انہوں نے جتنی بے ایمانیاں کیں سب اسی کے لئے کیں ــــ بیچارے کو یہ غم کیا کم ہے کہ میں دوسرا پہنچا دوں!"

سلمیٰ نے تائید کی،

"ہاں بیٹی کہتی تو سچ ہو بھائی صاحب کو دیکھ کر دل میرا جی بہت کڑھتا ہے ان بیچارے کو نہ یہاں چین ہے نہ وہاں!"

غزالہ بولی،

"لیکن چچی اماں ان باپ بیٹے نے جس طرح صفایا بولا ہے اس کی داد بھی نہیں دی جا سکتی، بالکل جھاڑو پھیر دی، وہ تو کہو خدا بھلا کرے توکل کا، اس نے بگڑے ہوئے معاملات کو پھر سے سنبھال لیا ہے، اور اب خدا کا فضل ہے بہت اچھی طرح کام چل رہا ہے، ہزار بارہ سو روپے روز کی سیل ہو جاتی ہے۔ کم سے کم ڈیڑھ دو سو روپے نفع کا اوسط ہے، تمام مصارف وضع کرنے کے بعد اور اس سے زیادہ کیا چاہیئے!"

سلمیٰ نے شکر گزار نظروں سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اللہ تیرا شکر ہے! ــــ لیکن بیٹی تمہاری یہ دلچسپی قائم رہنی چاہیئے!"

"آپ اطمینان رکھئے ــــ گھر پر تو مجھے کچھ کرنا نہیں پڑتا سب کچھ آپ نے سنبھال رکھا ہے، اطمینان سے اپنا سارا وقت کاروبار کی دیکھ بھال پر صرف کر رہی ہوں ــــ جب تک فرخ بھائی نہیں آجاتے، اسی طرح کرتی رہوں گی، وہ آجائیں پھر وہ جانیں اور ان کا کام!"

اس بات سے سلمیٰ خوش تو ہو گئی، لیکن اس نے کہا۔

"تمہیں نسیم اور امجد بھائی کے تجربہ کے بعد اب کسی نئے تجربہ کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، اپنا کام آپ ہی خوب ہوتا ہے!"

غزالہ مسکرانے لگی۔ اس نے کہا۔

"اچھا۔ چچی جان، آپ یہ کہہ رہی ہیں —— ذرا فرخ بھائی کو آجانے دیجئے، ان سے کہوں گی، چچی اماں آپ کو نسیم اور تایا کی صف میں رکھ رہی تھیں!"

سلمیٰ ہنس پڑی،

"تو وہ کیا کر لے گا میرا؟ کچھ اس سے ڈرتی ہوں!"

مسکراتے ہوئے غزالہ نے کہا۔

"ڈریں گی کیوں —— لیکن ذرا ماں بیٹے کی لڑائی کا تماشہ دیکھوں گی!"

(۱۷)

رات کا وقت تھا، سب لوگ ڈرائینگ روم میں بیٹھے تھے، امجد میاں بھی خلاف معمول تشریف رکھتے تھے، اور سلمٰی و غزالہ سے خوب خوب باتیں کر رہے تھے، داستانیں، لطیفے، کہانیاں ــــــ نہ جانے کیا کیا!

یکایک فون کی گھنٹی بجی، امجد میاں، فون کے پاس ہی بیٹھے تھے، انہوں نے "اونھ" کہہ کر ریسیور اٹھایا۔

"ہلو ــــــ"

"ہاں یہ صمد لاج ہے۔"

"میرا نام؟ ــــــ میں امجد بول رہا ہوں!"

"خضر پور؟ ــــــ آپ خضر پور سے بول رہے ہیں؟"

"اچھا اچھا کہیئے۔"

"(چونک کر) کیا کہا؟"

امجد نے جواب دیا۔

"خضر پور کے سول ہسپتال کے ایڈمنسٹریٹر صاحب کا ہے فرخ خضر پور کے تاریخی مقامات دیکھنے پہنچا تھا، کسی اونچی عمارت پر سے پاؤں پھسلا، سر کے بل گر پڑا، سخت زخمی ہوا ہے، خون بہت زیادہ نکل گیا ہے، بیہوش پڑا ہے کبھی کبھی ذرا دیر کو ہوش آجاتا ہے، تو تم

لوگوں کو یاد کرنا ہے، ڈاکٹر کا خیال ہے حالت نازک ہے، خدا خیر کرے۔"

"میرے مالک، اس یتیم بچہ کا تو ہی حافظ و ناصر ہے ——— آہ میرا بچہ!"

غزالہ کا سارا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا لیکن اس نے اپنا حوصلہ قائم رکھا،

"چچی جان آپ پریشان کیوں ہوتی ہیں، کیا خدا سے مایوس ہو رہی ہیں؟ میرا دل کہتا ہے، فرخ بھائی اچھے ہو جائیں گے، اور بہت جلد ہم سے آملیں گے!"

امجد میاں نے کہا،

"میں ابھی موٹر پر خضر پور جاتا ہوں، یہاں سے زیادہ سے زیادہ ۸۰ میل کا فاصلہ ہے۔ چار پانچ گھنٹے میں کار پہنچ جائے گی، اگر اس کی حالت ذرا بھی اچھی ہوتی تو اُسے ساتھ لیتا آؤں گا، اگر خدا نخواستہ ٹھیک نہ ہوتی تو میں وہیں رہ جاؤں گا اور تمہیں فون کر دوں گا، پھر تم لوگ چلی آنا ———"

سلمیٰ نے کہا،

"بھائی صاحب میں آپ کے ساتھ چلوں گی، ان پانچ گھنٹوں میں میری جان نکل جائے گی!"

امجد نے ترس اور رحم کی ایک نظر اس پر ڈالی اور کہا،

"ہا ——— عجیب چیز ہوتی ہے ماں کی ممتا بھی! ——— ٹھنڈی سانس لے کر) چلو!"

سلمیٰ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلئے ———!"

امجد نے ٹوکا،

"کیا اسی طرح؟"

وہ بولی،

"بھائی صاحب کسی تقریب میں تو نہیں جا رہی ہوں، خدا میرے بچہ کو سلامت رکھے ———"

اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی، رونے لگی،

غزالہ اس سے لپٹ گئی، اس نے خود بھی روتے ہوئے کہا،

"میری چچی جان روئیے نہیں!"

امجد نے کہا۔

"میں فون کر کے ٹیکسی بلائے لیتا ہوں!"

امجد میاں نے ٹیکسی یونین کو فون کر کے فوراً خضر پور تک آنے جانے کے لئے تین سو روپے کی ایک ٹیکسی طلب کی، ذرا دیر میں وہ آگئی، اس کے ہارن کی آواز سُن کر امجد نے کہا۔

"آگئی ٹیکسی اب دیر نہ کرو، جلد چلو، رات کا وقت ہے!"

سلمیٰ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"چلیئے!"

غزالہ بھی آکر سلمیٰ کے پاس کھڑی ہوگئی،

"میں بھی چلوں گی!"

امجد نے کہا۔

"بیٹی تم بھی چلو گی؟"

وہ بولی،

"ہاں تایا جی ضرور چلوں گی!"

امجد نے پھر ایک ٹھنڈی سانس لی، اور کہا۔

"چلو، ضرور چلو، یہ ایسا وقت ہے کہ کوئی ظالم بھی تمہیں نہیں روک سکتا آؤ، آؤ۔"

گھر ملازموں کو سونپا گیا، اور امجد، سلمیٰ، غزالہ ٹیکسی میں بیٹھ کر روانہ ہوگئے اب رات کے دس بج چکے تھے، سڑکیں سنسان پڑی تھیں، کہیں اکا دکا کوئی کتا بھونکتا نظر آجاتا تھا، امجد میاں ٹیکسی ڈرائیور کے پاس بیٹھے تھے، پچھلی نشست پر سلمیٰ اور غزالہ بیٹھی تھیں۔

کوئی گیارہ بجے رات کے قریب ایک دیہات کے پاس سے ٹیکسی گزری، ذرا آگے چل کر ایک باغ نظر آیا، یہ بڑا کشادہ اور وسیع باغ تھا۔ چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں کھنچی ہوئی تھیں، باغ کے پھاٹک پر جیسے ہی ہارن دیا گیا

وہ آغوشِ شوق کی طرح کھل گیا، ٹیکسی اندر داخل ہوئی، باغ کے وسط میں ایک عمارت سی نظر آ رہی تھی جیسے کوئی مختصر سی کوٹھی ہو، ٹیکسی جاکر پورٹیکو میں کھڑی ہو گئی، سلمیٰ اور غزالہ ایک دوسرے کو حیرت بھری نظروں سے دیکھنے لگیں۔ آخر غزالہ نے ہمت کر کے پوچھا۔

"تایا جی کیا خضر پور آ گیا ــــــ؟"

امجد میاں نے کہا،

"ہاں آ گیا!"

لیکن لب ولہجہ بدلا ہوا تھا، غزالہ نے پھر پوچھا۔

"کیا ہسپتال یہی ہے؟"

امجد میاں نے کہا،

"اب سارے سوال وجواب یہیں کر لوگی، اترو ــــــ اندر آؤ، سب کچھ معلوم ہو جائے گا ــــــ"

غزالہ سلمیٰ کی طرف دیکھنے لگی کہ اُترے یا نہ اُترے، معلوم ہو رہا تھا، دھوکا کیا گیا ہے، خضر پور اور ہسپتال کے بجائے یہ لوگ کہیں اور ہی پہنچا دیئے گئے ہیں، لیکن ٹیکسی میں بیٹھا رہنا بھی بیکار تھا، دونوں چپ چاپ اُتر آئیں،

امجد میاں نے آواز دی،

"مرتضیٰ ــــــ غوثیہ ــــــ"

مرتضیٰ اور غوثیہ سامنے آ کر کھڑے ہو گئے، امجد میاں نے پوچھا۔

"نسیم کہاں ہے؟"

غوثیہ نے کہا۔

"ابھی نہیں آئے؟"

امجد نے غوثیہ سے کہا۔

"دیکھو یہ سلمیٰ اور غزالہ ہیں انہیں پہچانتی تو ہوگی؟"

وہ مسکراتی ہوئی بولی،

"جی خوب اچھی طرح!"

امجد نے کہا۔
"انہیں اوپر لے جاؤ، کسی طرح کی انہیں تکلیف نہ پہنچے۔"
وہ ہنسنے لگی،
"بہت اچھا!"

گردشِ شام و سحر

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو؟

(۱)

سلمیٰ اور غزالہ کوٹھی کی بالائی منزل پر ایک کمرہ میں پہنچا دی گئیں، یہاں دو چارپائیاں بچھی تھیں، ان پر معمولی سا بستر لگا تھا، ایک طرف اسٹول پر صراحی اور دو گلاس رکھے تھے، ویسے تو ساری کوٹھی میں بجلی جگ مگ کر رہی تھی، لیکن اس کمرہ کا کنکشن کاٹ دیا گیا تھا، اور لالٹین ٹمٹما رہی تھی، تیل خراب تھا یا بتی ناقص تھی، روشنی بہت مدھم تھی، اور ذرا ذرا دیر کے بعد لالٹین بھق بھق کرنے لگتی تھی۔

ان دونوں کو غوثیہ اس کمرہ تک لے آئی تھی، سلمیٰ اور غزالہ نے کمرہ میں قدم رکھا، ادھر ادھر نظر ڈال کر اس کا جائزہ لیا، سلمیٰ تو چارپائی پر ایک آہ کر کے بیٹھ گئی، غزالہ نہیں بیٹھی، کبھی دیوار میں لگی ہوئی خالی الماری کا پٹ کھول کر اسے دیکھنے لگتی، کبھی کونہ میں رکھی ہوئی ایک گرد آلود میز پر کچھ کتابیں پڑی تھیں، ان کی ورق گردانی کرتے لگتی۔

سلمیٰ نے کہا۔

"آؤ بیٹی بیٹھ جاؤ ــــــ خدا غارت کرے ان کمینوں کو!"

غزالہ نے وہیں کھڑے کھڑے جواب دیا۔

"آتی ہوں !"

پھر میز کے پاس سے ہٹ کر کھڑکی کے پاس گئی، اور باہر کی طرف دیکھنے لگی، یکایک غوثیہ نے کہا۔

"آپ بیٹھ کیوں نہیں جاتیں؟"

غوثیہ کے لہجہ میں تحکم تھا، غزالہ کو غصہ آگیا،

"تجھے کیا؟ —— تو اپنا کام کر!"

غوثیہ نے آگے بڑھ کر کھڑکی بند کی، چٹخنی لگائی اور کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر نہایت گستاخانہ لہجہ میں کہا۔

"میرا کام دیکھ لیا آپ نے؟ —— پھر کہتی ہوں بیٹھ جایئے اپنی جگہ پر!"

غزالہ نے جھلائے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"نہیں بیٹھوں گی، اور اگر اب تو نے مجھ سے بات کی تو بہت برا ہوگا!"

غوثیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا آپ مجھے ماریں گی؟"

یہ سوال کر کے غزالہ کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، اس ہنسی میں کس غضب کا طنز تھا، اسے غزالہ نے محسوس کر لیا، لیکن اپنی بے بسی محسوس کر رہی تھی، خاموش رہی، غصہ پینا پڑا،

اب سلمیٰ کی طرف غوثیہ نے توجہ کی،

"کیوں بی بی راستہ تو اچھی طرح کٹا؟ کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

سلمیٰ بہت زیادہ متحمل اور صابر تھی، اس نے طنز کو محسوس کرتے ہوئے بھی اپنے لہجہ میں تلخی نہیں پیدا ہونے دی،

"موٹر میں تکلیف کا کیا سوال ہے؟"

غوثیہ بولی،

"یہاں بھی آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی،"

سلمیٰ نے کہا۔

"تکلیف کسے کہتے ہیں اور راحت کیا چیز ہے؟ اس بات پر ہم نے غور نہیں کیا، ہم پرائے بس میں ہیں، مجبور ہیں، بے بس ہیں، بدلہ نہیں لے سکتے، انتقام کا خیال دل میں نہیں لا سکتے، لیکن خدا دیکھ رہا ہے ——"

غوثیہ اس سے زیادہ نہ سن سکی، اس نے کہا۔

"بی بی مصلے لا دوں، اس پر بیٹھ کر اطمینان سے بد دعائیں دے لیجئے اگر گن گن کر کوسنا ہو تو تسبیح کا انتظام بھی ہو سکتا ہے!"

سلمیٰ نے حسرت اور بے بسی کے ساتھ غوثیہ کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گئی، بھلا ان باتوں کا اس کے پاس کیا جواب تھا؟ ذرا دیر کے بعد غوثیہ نے پھر کہا۔

"بی بی جی، رات بہت آ گئی ہے، اب سو رہیئے —— میری تو نیند کے مارے آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہیں!"

سلمیٰ نے کہا،

"تم جاؤ ہمیں نیند آئے گی تو سو جائیں گے!"

غوثیہ نے یاد دلایا،

"نہ کیوں آئے گی، وہ تو سولی پر بھی آ جاتی ہے!"

پھر وہ غزالہ سے کہنے لگی،

"یہاں کوٹھی میں ایک ریڈیو ہے، کہئے تو لا دوں؟"

غزالہ نے حقارت کی ایک نظر اس پر ڈالی اور خاموش رہی، لیکن شاید غوثیہ اس سے جواب لینے پر تلی ہوئی تھی، غزالہ کو خاموش پا کر اس نے پھر بڑے انداز سے خاکساری کی کیفیت اپنے اوپر طاری کرتے ہوئے کہا۔

"کافی کا انتظام تو اس وقت نہیں ہو سکتا، ہاں اگر کہیئے تو چائے لا دوں؟ —— لیکن بغیر دودھ کی ہوگی —— اور ٹھنڈی بھی!"

غزالہ کا چہرہ وفور غضب سے تمتما اٹھا، اس کیفیت سے لطف لیتی ہوئی غوثیہ کمرہ سے چلی گئی، اور دروازہ باہر سے بند کر لیا —— کہیں یہ مجرم بھاگ نہ جائیں!

---

(۲)

غوثیہ کے جانے کے بعد غزالہ سلمیٰ کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اُس نے کہا۔
"چچی جان یہ کیا ہوگیا؟ —— ایسا معلوم ہوتا ہے، تایا جی نے سارے انتظامات پہلے سے کر رکھے تھے؟"
سلمیٰ نے جواب دیا۔
"ہاں بیٹی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، نہ جانے مقصد کیا ہے ان لوگوں کا؟"
غزالہ نے کہا۔
"آپ اب تک مقصد نہیں سمجھ سکیں؟ —— مقصد صرف ایک ہے، مجھ پر قابو حاصل کرنا، مجھے تسنیم کے حوالہ کرنا اور اس طرح میری جائیداد و املاک پر قبضہ کر لینا، آپ سے انہیں خاص واسطہ نہیں ہے، دیکھ لیجئے گا آپ کو چھوڑ دیں گے، گرفتارِ قفس تو میں ہوں اور رہوں گی!"
سلمیٰ نے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔
ایسی یاس انگیز باتیں نہ کرو، جب تک میں زندہ ہوں، یہ تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے، ہاں میری لاش کو روندتے ہوئے جو چاہیں کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔!"
"نہیں چچی جان ایسا نہ کہیئے، آپ کو فرخ بھائی کے لئے زندہ رہنا ہے،

اس دنیا میں آپ کے سوا ان کا اور کون ہے ؟ احمد چچا کے انتقال کے بعد سے وہ بیچارے تکلیفیں ہی اٹھا رہے ہیں، اب وقت آیا ہے کہ آپ کا دامن ان کے لئے سکون اور اطمینان کا گہوارہ ثابت ہو !"

ان باتوں سے سلمیٰ چڑھ گئی،

"کیا تم سمجھتی ہو، فرخ مجھے تم سے زیادہ عزیز ہے، ایک نہیں دس فرخ تم پر نثار کر سکتی ہوں !"

عزالہ نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

" یہ آپ کی محبت ہے، لیکن چچی جان آپ میرے کام نہیں آ سکتیں، میرے کام صرف ایک ہی چیز آ سکتی ہے، اور وہ ہے موت !"

سلمیٰ سہم گئی،

"خدا نہ کرے میری بچی، میری بانو!"

استقلال و متانت کے ساتھ عزالہ نے کہا۔

"چچی اماں، یہی ایک آخری چارۂ کار ہے، میں نسیم کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی، نہ زندگی اس کے ساتھ نباہ سکوں گی، اور تایا جی کا کٹھور دل اس کے سوا کسی اور چیز پر رضامند نہیں ہو سکتا !"

" تایا جی کچھ خدا تو نہیں ہیں لیکن اس وقت تو خدائی اختیارات انہی کے ہاتھ میں ہیں !"

اتنے میں ایسا محسوس ہوا جیسے باہر سے دروازہ کوئی کھول رہا ہے۔ سلمیٰ اور عزالہ نے خاموشی اختیار کر لی اور انتظار کرنے لگیں کہ دیکھئے اب پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے ؟ —— لیکن جب دروازہ نہیں کھلا اور کوئی نہیں آیا تو معلوم ہوا صرف وہم تھا۔

(۳)

صبح ہوئی!
غوثیہ نے آکر دروازہ کھولا، اور ناشتہ لائی، چائے مکھن لگے ہوئے چار ٹوسٹ، دو انڈے۔ سلمٰی نے غزالہ کی طرف دیکھا، وہ بولی،
"غوثیہ یہ لے جاؤ!"
غوثیہ نے سراپا حیرت بن کر پوچھا۔
"کیا آپ ناشتہ نہیں کریں گی؟"
غزالہ نے جواب دیا،
"نہیں!"
غوثیہ نے کہا۔
"کب تک؟ ـــــــ ایک وقت دو وقت، چار وقت، آٹھ وقت، اس سے زیادہ تو ضبط کرنا انسان کے بس میں نہیں، آپ کو یہیں رہنا ہے، اس وقت نہیں تو اور وقت کھانا ہی پڑے گا!"
غزالہ نے نرم لہجہ میں جواب دیا۔
"تمہاری اس نصیحت کا شکریہ اس وقت تو بہر حال جی نہیں چاہتا، دوپہر کو پوچھ لینا، اگر بھوک ہوگی تو کہہ دوں گی!"
غوثیہ نے ٹرے اٹھائی اور چلی گئی، دوپہر کو وہ پھر خوان سر پر رکھے

نمودار ہوئی۔ اس میں سلمیٰ اور غزالہ کا کھانا تھا، غزالہ نے ایک سوگوار تبسم کے ساتھ پوچھا۔

"لے آئیں کھانا؟"

وہ بولی، اور اس وقت لہجہ بدلا ہوا تھا۔

"جی لے آئی بی بی جی، ــــــ کھا لیجئے بالکل گرم گرم روٹیاں ہیں، قیمہ بھی ابھی ابھی بھونا ہے!"

غزالہ نے کہا۔

"لیکن غوثیہ میں اس وقت بھی نہیں کھا سکوں گی، شام کو پوچھ لینا، اگر بھوک ہوئی تو کہہ دوں گی!"

غوثیہ کا چہرہ اُتر گیا، ایسا معلوم ہوا جیسے اُسے صدمہ ہوا ہے، اُس نے کہا۔

"رات بھی فاقہ سے گزری، صبح ناشتہ بھی نہیں کیا اب ــــــ"

غزالہ بول پڑی،

"تو کیا ہوا؟ ــــــ بہت سے لوگ ہیں جو کئی کئی وقت کا فاقہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔"

غوثیہ کے لہجہ میں اب خوشامد تھی، اس نے کہا۔

"دو لقمے کھا لیجئے سرکار!"

یہاں جب سے غزالہ آئی تھی، غوثیہ نے جب بھی بی بی جی کہہ کر اُسے مخاطب کیا تو اس تخاطب میں طنز تھا، استہزا تھا، احساس انتقام تھا لیکن اس سرکار کے لفظ میں ایسی کوئی جھلک نظر نہیں آئی، اس میں احساس ندامت تھا۔ غزالہ نے کہا۔

"غوثیہ میں شکر گزار ہوں کہ تم میرا اتنا خیال کر رہی ہو، لیکن مجبور ہوں ایک لقمہ بھی نہیں کھایا جائے گا!"

غوثیہ چلی گئی،

سہ پہر کو وہ چائے لے کر آئی، کچھ بسکٹ تھے، کچھ کیک کے ٹکڑے، اس

نے کہا۔

"سرکار چائے پینی پڑے گی، اب انکار نہ کیجئے گا۔"

غزالہ نے چائے پر نظر بھی نہیں ڈالی، کہنے لگی،

"غوثیہ اگر تمہاری کوئی بات میں پوری کر سکوں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی، میں تمہاری ہمدردی کی قدر کرتی ہوں، لیکن یہ بات نہ مان سکوں گی، چائے مجھے نہیں پینی ہے!"

غوثیہ پھر کچھ نہ کہہ سکی ٹرے اٹھائی اور چلی گئی، وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی۔ اس طرح کمرہ سے باہر نکلی جیسے کسی ہارے ہوئے جواری کے قدم اٹھتے ہیں، ناکامی کے بوجھ سے قدم نہ اٹھ رہے ہوں!

دن ختم ہوگیا،

رات نے ڈیرے ڈال دیئے،

ایک مرتبہ پھر سر پر خوان رکھے غوثیہ آتی نظر آئی، اس مرتبہ اس کے قدم جوش سے تیز تیز نہیں اٹھ رہے تھے، ناکامی کے اندیشہ سے آہستہ آہستہ اٹھاتی آرہی تھی۔ اس نے خوان میز پر رکھ دیا اور بھرائی ہوئی آواز میں گویا ہوئی۔

"میری سرکار میں ہاتھ جوڑتی ہوں کھالو، پھر پیٹ نہ سہی، دو لقمے ہی اپنے اوپر ترس نہیں کھاتیں تو (سلمیٰ کی طرف اشارہ کر کے) ان پر رحم کرو، ان بیچاری میں اتنا دم کہاں کہ ایسے کڑاکے کے فاقے برداشت کر سکیں، سرکار آئینہ دیکھو تمہارا منہ سوکھ کر کانٹا ہوگیا ہے، اور بی بی جی (سلمیٰ) تو ایسی نڈھال ہوگئی ہیں، جیسے نہ جانے کب کی بیمار ہیں!"

غزالہ نے جواب دیا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو غوثیہ، چچی جان کا مجھے خود بھی خیال ہے، برابر ان کی خوشامد کرتی رہی ہوں کہ کھالیں، مگر وہ اس پر بضد ہیں کہ جب تک میں نہ کھاؤں گی وہ بھی لقمہ نہیں توڑیں گی، انہیں میرے ساتھ مرجانا منظور ہے، میرے بغیر زندہ رہنا نامنظور، مجھے ان کی زندگی عزیز ہے، انہیں زندہ

رکھنے کے لئے میں بڑی سے بڑی قربانی کر سکتی ہوں، لیکن عزت اور ناموس کی نہیں بلکہ اس راستہ میں بے تامل فنا ہو جاؤں گی، اور اگر بچی کے مقدر میں بھی یہی لکھا ہے کہ اپنی بدقسمت بھتیجی کے ساتھ ایک ہی قبر میں سوئیں تو میں انہیں روک نہیں سکتی ——— ویسے تم اگر انہیں راضی کر سکتی ہو تو کر لو، میں تو کوشش کرتے کرتے تھک گئی؛"

سلمیٰ خاموش تھی، غزالہ بھی خاموش ہو گئی ——— غوثیہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے،

غوثیہ نے دوپٹہ کے آنچل سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"ہائے میرے اللہ کیا کروں، میرا بس چلتا تو میں بھگا دیتی آپ کو، لیکن ایسا کڑا پہرا ہے کہ چیونٹی تک بے اجازت نہیں جا سکتی۔"

غزالہ نے شفقت کے ساتھ غوثیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

"تم نے اپنا حق یہ کہہ کر ادا کر دیا، مجھے تم سے ذرا بھی شکایت نہیں ہے، اگر تھی بھی تو تمہاری یہ ہمدردی اور شرافت دیکھ کر رفع ہو گئی، اب تو میں اپنے دل میں تمہاری جگہ محسوس کر رہی ہوں، مجھے خدا پر بھروسہ ہے، کم از کم اتنا بھروسہ ضرور ہے کہ اگر وہ راحت کی زندگی مجھے نہیں دے سکتا، تو عذاب کی زندگی کو موت سے بدل دے گا ——— جاؤ غوثیہ اگر دیر تک ٹھہریں تو وہ لوگ تم پر بھی شک کرنے لگیں گے،!"

غوثیہ نے بے پروائی سے کہا۔

"بھاڑ میں جائیں، مجھ پر شبہ کر کے کیا کریں گے ——— اچھا سرکار میں بھی خدا کو حاضر و ناظر جان کر عہد کرتی ہوں، خدا نے صرف ایک ننھا سا بچہ مجھے دیا ہے اس کی قسم کھا کر کہتی ہوں، جب تک آپ کی نجات کی کوئی فکر نہ کر لوں گی میں بھی ایک دانہ نہیں کھاؤں گی حرام ہے مجھ پر ———"

غزالہ بیچ پڑی۔

"غوثیہ ———"

غوثیہ نے کہا۔

"میری سرکار، آپ اگر میری نہیں مان سکتیں تو مجھے بھی میرے ارادہ سے روکنے کی کوشش نہ کیجئے، ورنہ یہیں اس دروازہ سے سر پھوڑ کر مر جاؤں گی!"

یہ کہہ کر اس نے لاکھ لاکھ ضبط کرنے کی کوشش کی، مگر رونے لگی، عزالہ نے اٹھ کر اُسے گلے سے لگا لیا، پھر اس نے خوان اُٹھایا، اور چپ چاپ چلی گئی!

---

(۴)

غوثیہ کے جانے کے تھوڑی دیر بعد امجد میاں آئے، انہیں دیکھ کر سلمیٰ نے آنکھیں جھکا لیں، غزالہ نے منہ پھیر لیا، وہ کرسی پہ بیٹھ گئے، انہوں نے فرمایا۔

"غزالہ میں چند باتیں تم سے کرتے آیا ہوں!"

غزالہ نے کہا۔

"میں دھوکے باز اور عیار لوگوں سے بات نہیں کرتی!"

امجد میاں کو جلال آ گیا،

"میں دھوکے باز ہوں؟ ——— میں عیار ہوں؟"

غزالہ بولی،

"افسوس اس سے زیادہ سخت الفاظ مجھے یاد نہیں، ورنہ میں اتنے ہلکے الفاظ میں اپنا مفہوم بیان کرنے کی ناکام کوشش نہ کرتی!"

امجد میاں کھڑے ہو گئے۔

"بہر حال تمہاری خود سری کو میرے سامنے جھکنا پڑے گا!"

غزالہ نے استقلال کے ساتھ کہا۔

"وہ غزالہ کی لاش ہو گی، جس کا سر آپ جھکا سکنے میں کامیاب ہوں گے، غزالہ نے خدا کے سوا کسی کے سامنے جھکنا نہیں سیکھا ہے؟ ——— اور پھر اگر وہ جھکے گی تو ان نمک حراموں کے سامنے جن کی رگوں میں اس کا نمک

دوڑ رہا ہے؟ ان لٹیروں کے سامنے جنہوں نے عزیز اور بزرگ بن کر اُسے لوٹ لیا ہے؟ ان بگلا بھگت لوگوں کے سامنے جن کا ظاہر کچھ ہے، باطن کچھ؟"

امجد میاں کا پارہ اور چڑھ گیا، انھوں نے چیخ کر کہا۔

"بکواس بند کرو —— اور کان کھول کر سُن لو، تمہیں نسیم کے ساتھ شادی کرنا ہوگی، اس مختار نامہ پر دستخط کرنا ہوں گے، جس کی رُو سے وہ تمہاری جائیداد و املاک پر تصرف کا حق حاصل کر لے گا!"

غزالہ نے ڈپٹ کر کہا۔

"آپ کان کھول کر سُن لیجئے، یہ ناممکن ہے، میں نسیم سے نفرت کرتی ہوں، آپ سے نفرت کرتی ہوں، میں اپنی جائیداد کی خود مالک ہوں، اپنے ہوتے ہوئے کسی کو مختار نامہ کیوں دوں؟"

فیصلہ کن انداز میں امجد میاں نے کہا۔

"خیال کی دنیا سے نکلو، عمل کی دنیا میں آؤ، تم بھاگ نہیں سکتیں یہاں سے کوئی دوسرا تمہاری مدد کو نہیں پہنچ سکتا، نہایت اطمینان سے قاضی صاحب آئیں گے، وہ نکاح پڑھائیں گے، اگر تم انکار کرو گی، جب بھی نکاح ہو جائیگا، پھر تم کو اور نسیم کو میاں بیوی کی حیثیت سے کچھ دن یہاں رہنا ہوگا، پھر تم رحمت پور چلی جاؤ گی، اور نسیم فیروز آباد میں رہے گا؟"

غزالہ بولی،

"اگر خدا کا وجود ہے تو یہ کبھی نہیں ہو سکتا!"

امجد میاں نے ایک قہقہہ لگایا۔

"یہ دل بہلاوے کی باتیں ہیں —— فرخ کے حادثہ کی خبر سن کر سلمٰی کی وہ حالت نہیں ہوئی جو غزالہ خانم کی ہوئی، معلوم ہوا بجلی گر پڑی ہے، بیچاری پر، چہرہ فق ہوگیا، رنگ اڑ گیا، ہاتھ پاؤں کانپنے لگے، دل بھی ضرور دھڑکنے لگا ہوگا، اور مزا تو اس وقت آیا، جب سلمٰی خضر پور چلنے کے لئے تیار ہوئی تو غزالہ خانم بغیر پوچھے گچھے، بغیر سوچے سمجھے دھڑ سے آمادۂ سفر ہو گئیں "میں بھی چلوں گی۔" میں دل میں ہنس رہا تھا، کس آسانی سے غزالہ بیگم اسیر دام ہو رہی ہیں،

فرخ کے نام کی برکت کا قائل ہوگیا۔ اس نام نے چٹکی بجانے میں ساری مشکلیں آسان کر دیں، عزالہ خانم سلمیٰ سے پہلے موٹر میں بیٹھیں اور اس کوٹھی میں رونق افروز ہوگئیں ـــــ بہرحال ایک بات یاد رکھو فرخ جیتا ہے یا مرگیا۔ اس سے بحث نہیں، وہ تمہیں نہیں پا سکتا، تم اس کی نہیں بن سکتیں، تمہارا مقدر نسیم کے ساتھ وابستہ ہو چکا ہے۔ یہ تقدیر کا اٹل فیصلہ ہے، اس میں کسی طرح کی تبدیلی نہیں ہو سکتی، رہیں بی سلمیٰ تو تمہاری شادی کے ٹھیک ایک ہفتہ کے بعد جب دنیا اس حقیقت سے آشنا ہو جائے گی کہ تم نسیم کی بیوی بن گئیں، یہاں سے آزاد کر دی جائیں گی، اگر صمد لاج میں رہنا چاہیں تو غوثیہ والی کوٹھڑی ان کا استقبال کرے گی، ورنہ اپنا مکان خالی کرا کے اس میں چلی جائیں!"

سلمیٰ بہت کمزور اور نڈھال ہو رہی تھی، یہ باتیں سُن کر وہ ضبط نہ کر سکی۔ اُس نے کہا۔

"پاپی ـــــ"

اور پھر وہ کچھ نہ کہہ سکی، بیہوش ہوگئی۔

امجد میاں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"مگر ـــــ صرف مگر ـــــ خیر میں اس وقت جاتا ہوں، میری پیش گوئی سُن لو، میرے جانے کے بعد اسے فوراً ہوش آجائے گا، بہرحال میں تمہیں دن کی مہلت دیتا ہوں، آج منگل ہے، جمعہ کو تم دولہن بنو گی اور تمہاری شادی ہو جائے گی، غوثیہ کو گانا بہت اچھا آتا ہے، وہ بابل گائے گی!"

امجد میاں چلے گئے۔

عزالہ روتی ہوئی اُٹھی، اور سلمیٰ کو ہوش لانے کے لئے تدبیریں کرنے لگی۔ فوراً ہی غوثیہ بھی آگئی جیسے وہ دروازہ سے لگی کھڑی تھی، اس نے بھی ہاتھ بٹایا، ذرا دیر میں سلمیٰ کو ہوش آگیا۔

غوثیہ دوڑی دوڑی گئی اور پھر سر پر خوان رکھے ہوئے واپس آئی، اس

نے غزالہ سے کہا۔
" میری سرکار یہ کافی ہے، تھوڑی سی پی لیجیے، بی بی جی (سلمیٰ) کو بھی پلا دیجئے۔ وہ کمزوری کی وجہ سے بیہوش ہوئی تھیں، ذرا توانائی آجائے گی، اور میری سرکار، میری بات کا یقین کیجیے، اگر مجھے یقین نہ ہوتا کہ خدا آپ کو جلد از جلد اس مصیبت سے رہائی دلا دے گا، تو چاہے بی بی جی مر جاتیں، چاہے آپ کی جان پہ بن جاتی، میں اصرار نہ کرتی!"
غزالہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی، غوثیہ نے کہا۔
" اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتی، لیکن آپ کو یقین دلاتی ہوں، خدا نے آپ کی سن لی، ممکن ہے کل ہی ورنہ پرسوں یہ پاپی اپنے انجام کو پہنچیں گے، آپ فیروزہ آباد میں ٹھاٹھ سے اپنی زندگی بسر کریں گی!"
غوثیہ کے ان الفاظ میں اتنا اعتماد، اتنا زور اور اتنا اثر تھا کہ پھر غزالہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی، اپنے ہاتھ سے کافی بنانے لگی، بنا چکنے کے بعد اپنے ہاتھ سے اسے پلانے لگی، جھٹ غوثیہ آگے بڑھی اس نے کہا۔
" سرکار میں پلا دوں گی، آپ پیجیے۔"
غوثیہ نے پیالی چھین لی اور سلمیٰ کو اپنے ہاتھ سے پلا دی، اتنے میں غزالہ نے بھی پی لی، پھر ایک پیالی غوثیہ کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔
" لو ——"
غوثیہ نے انکار کیا،
" یہ بھی آپ پی لیجئے!"
غزالہ بولی،
" ضد نہیں کرتے غوثیہ، پی لو!"
اس نے پی لی، پھر وہ بولی،
" ذرا دیر میں کھانا لے آؤں گی ——"
غزالہ نے کہا۔
" اب اس وقت نہیں!"

غوثیہ نے صلح کا فارمولا پیش کر دیا۔

"اچھا۔ صبح صبح، لیکن اب انکار نہ کیجئے گا۔ بالکل بے فکر رہیے، خدا سب کچھ ٹھیک کر دے گا!"

غزالہ نے پوچھا۔

"غوثیہ تم بدل کیسے گئیں؟"

وہ بولی،

"سرکار پہلے تو میں یہ سمجھی تھی واقعی نسیم میاں آپ سے شادی کرنا چاہتے ہیں وہ محبت کرتے ہیں، آپ غرور کرتی ہیں، تکبر کرتی ہیں، لیکن جب امجد میاں اور نسیم میاں کے لچھن معلوم ہوئے اور کل یہ پتہ چلا کہ کوئی رنڈی ہے گلبدن، نسیم میاں اس سے وعدہ کر چکے ہیں، آپ اس کی لونڈی بن کر رہیں گی، تو مجھے نفرت ہو گئی ان سے اور پھر جب آپ کا صبر اور آپ کی شان میں نے دیکھی تو میرا دل پگھل کر موم ہو گیا ——— میں نے اپنی جان کی بازی لگا دی ہے، خدا لاج رکھے میرے قول کی ——— لیکن اتنا اطمینان دلاتی ہوں، جب تک میں زندہ ہوں، آپ تک نسیم میاں کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا!"

(۵)

ایک دن گزر گیا ـــــــ اب امجد کی دی ہوئی مہلت میں صرف دو دن باقی رہ گئے تھے،

غزالہ نے بے تاب ہو کر سلمٰی سے کہا۔

"چچی جان، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا ہو گا؟"

سلمٰی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔

"مجھے تو اب ایک نیا اندیشہ پیدا ہو رہا ہے، اتنے دنوں تک فرخ کا نہ آنا، نہ کوئی خط بھیجنا، اس بات کی دلیل ہے کہ یہ لوگ اس کے ساتھ بھی کچھ داؤں کھیل چکے ہیں!"

غوثیہ پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی اس نے کہا۔

"نسیم میاں نے میرے سامنے ایک دفعہ انہیں خط لکھا تھا کہ فی الحال فیروز آباد نہ آئیں وہی (مرتضیٰ) تو ڈاک خانہ میں ڈال آئے تھے اسے، اب یہ نہیں کہہ سکتی کہ وہ خط کس کی طرف سے تھا؟"

سلمٰی نے پوچھا۔

"لیکن یہ کیا بات ہے کہ فرخ نے نسیم کو تو خط لکھا ہماری بات بھی نہ پوچھی، ایک خط جو آیا ہو اس کا ہمارے نام!"

غوثیہ نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں بی بی جی جھوٹ نہیں بولوں گی، خدا کو منہ دکھانا ہے، ان کے کئی خط آپ کے اور سرکار کے نام آئے۔"

غزالہ نے پوچھا،

"فرخ بھائی کے؟"

وہ بولی،

"جی سرکار ـــــ مگر وہ پھاڑ دیئے گئے، جلا دیئے گئے، ایک بھی آپ تک نہیں پہنچنے دیا گیا!"

سلمٰی نے دریافت کیا،

"کیوں ری غوثیہ یہ گلبدن کون ہے، جس کا تو نام لے رہی تھی!"

وہ افسوس کے لہجہ میں گویا ہوئی۔

"بی بی جی وہ ایک رنڈی ہے کئی کئی دن اس باغ میں چھوٹے میاں کے ساتھ آ کر رہتی ہے، خوب خوب شراب کباب کے دور چلتے ہیں، آپ کے آنے سے ایک ہی دن پہلے تو گئی ہے، میرے سامنے ہی تو اس سے کہہ رہے تھے، توبہ توبہ غزالہ تیری لونڈی بن کر رہے گی! ـــــ بی بی میں ٹھہری نوکر، کون لونڈی بنتا ہے کون ملکہ، مجھے اس سے کیا سروکار؟ یہ مجھے اور انہیں (مرتضٰی کو) اسی لئے فیروز آباد لے گئے تھے کہ رتی رتی کی خبر آپ دونوں کی انہیں دیتی رہوں، اور میں نے ایسا کیا بھی، پھر ایک دفعہ سرکار (غزالہ) نے میری ایک بدتمیزی پر غصہ ہو کر مجھے جوتا کھینچ مارا اور دوسرے دن نکلوا دیا، میں بھی دشمن بن گئی اور پہلے سے زیادہ جوش کے ساتھ ان کا کام کرتی رہی اور انعام لیتی رہی، میرے سامنے جب گلبدن نے سرکار کو لونڈی بنانے کو کہا تو مجھے خوشی ہوئی تھی، پھر جب دوسرے دن یہاں دھوکہ سے لائی گئیں تو اور زیادہ خوشی ہوئی، پھر جب میں نے سرکار کو کاقی کا طعنہ دیا اور جس کھڑکی کے سامنے وہ کھڑی تھیں، اسے بند کیا، تو اپنی خوشی بیان نہیں کر سکتی، میں سمجھتی تھی میں نے انتقام لے لیا۔

لیکن جب سونے کے لئے بستر پر لیٹی تو نیند نہیں آئی اور پھر جیسے دل نے مجھ سے کہا، کیوں بی غوثیہ یہ انعامات جو تمہیں مل رہے ہیں کب تک ملیں گے اور

کب تک چلیں گے؟ جب کام نکل جائے گا، تو چھوٹے میاں اور بڑے میاں دونوں آنکھیں پھیر لیں گے، جب وہ سگی بھتیجی اور چچا زاد بہن کے نہ ہوئے تمہارے کیا ہوں گے؟ —— پھر ایسا معلوم ہوا، دل کہہ رہا ہے، کیوں بی غوثیہ کیا خدا کو منہ دکھانا نہیں ہے؟ کیا ہمیشہ جیو گی؟ کبھی نہیں مرو گی؟ اللہ میاں نے اگر پوچھا کہ عزالہ اور سلمیٰ نے تمہارا کیا بگاڑا تھا، جو تم ان کی جان اور آبرو کی گاہک ہو گئیں، تو کیا جواب دو گی؟

بی بی جی یہ سوچ کر میرا دل دہک دہک کرنے لگا، اور پھر میرے دل نے کہا، یہ انعام جو تجھے مل رہے ہیں، یہ بھی کس کے روپے سے، رحمت پور سے تو کچھ آتا نہیں، یہاں اور وہاں یہیں کا روپیہ خرچ ہو رہا ہے، اور بی بی جی یہ سوچتے سوچتے میرے سامنے سرکار کی تصویر آگئی، کتنی بھولی، کتنی معصوم، کتنی شاندار، اس مصیبت میں بھی وہی تمکنت، وہی شان اس بے بسی میں بھی وہی دبدبہ وہی رعب، اس فاقہ میں بھی وہی تیور، وہی رنگ، مجھ سے جو باتیں ہوئیں، امجد میاں سے جو گفتگو ہوئی، سب میں نے سُنا اور طے کر لیا، زندگی دو دن کی ہے، ساتھ دوں گی تو سرکار کا، چاہے اس راستہ میں انعام کے بجائے دُکھ اور مصیبت سے پالا پڑے، سب کچھ جھیل لوں گی، میری شہزادی، جب سب کچھ جھیل رہی ہے پھر میں تو اس کی باندی ٹھہری،

بس یہ سوچتے ہی میں اُٹھ بیٹھی اور ہاتھ پکڑ کر انہیں (مرتضیٰ کو) اٹھایا اور اپنے دل کی ساری باتیں سُنا کر بولی، یا تو میرا ساتھ دو، یا میرا ساتھ چھوڑ دو، اگر میرا ساتھ نہیں دیتے تو زندگی بھر منہ نہیں دیکھتے کی (شرماتے ہوئے) چاہتے بہت ہیں مجھے، کہنے لگے، میں تو تیری وجہ سے ان لوگوں کا ساتھ دے رہا تھا، سونے کی چمپا کلی وہی دے سکتے تھے، میں تو نہیں دے سکتا تھا، میں نے کہا بھاڑ میں جائے سونے کی چمپا کلی، مجھے کچھ نہیں چاہیئے، تم صبح ہوتے ہی شہر جاؤ، اور جس طرح بن پڑے، توکل سے مل کر کوئی بندوبست کرو، وہ سرکار کے گھر کا پُرانا اور وفادار نوکر ہے، —— ضرور ضرور کچھ نہ کچھ کرے گا —— ان کم بختوں نے فیروز آباد کے سب جاننے والوں کو اس دھوکے میں رکھا ہے کہ رحمت پور میں ہیں، آپ سب لوگ! ——"

(۶)

تیسرا روز شروع ہوگیا،
غوثیہ غزالہ کے پاس بیٹھی ہے۔
یکایک دروازہ کھُلا، امجد میاں تشریف لائے، انہوں نے چھوٹتے ہی غوثیہ سے پوچھا۔
"تو یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہے؟"
وہ مسکراتی ہوئی بولی،
"باتیں کر رہی ہوں!"
امجد میاں مطمئن ہوگئے۔
"وہ تو ٹھیک ہے بھئی، جتنی باتیں چاہو کرلو، لیکن آج کون سا دن ہے۔ یہ بھی معلوم ہے؟"
وہ بولی،
"کیوں نہیں معلوم جمعہ ہے؟"
امجد میاں نے کہا۔
"تو پھر باتوں میں وقت نہ ضائع کرو، دولہن کو نہلاؤ، دھلاؤ، کپڑے پہناؤ، عطر لگاؤ، خوشبو میں بسادو، دوسرے کمرہ میں اس کا سارا سامان آرائش رکھا ہے، سب استعمال کر ڈالو، غوثیہ آج جتنی محنت کروگی، اس کا پھل اُمید

سے زیادہ میٹھا پاؤ گی ۔۔۔۔"

وہ بولی،

"سب کچھ کر لوں گی آپ اطمینان رکھیئے !"

امجد میاں مطمئن ہو کر چلے گئے، سلمیٰ اور غزالہ نے درد بھری آواز میں غوثیہ سے کہا۔

" اب تک تو کچھ نہیں ہوا غوثیہ ؟"

وہ گویا ہوئی،

"سرکار ضرور کچھ نہ کچھ ہو گا آپ اسے (مرتضیٰ کو) جانتی نہیں، وہ آفت کا پر کالہ ہے، اور اگر خدا نخواستہ وہ کچھ نہ کر سکا تو دیکھ لیجئے گا، غوثیہ عورت ہو کر کیا کرتی ہے، کیا کچھ نہیں کر سکتی !"

اتنے میں امجد میاں پھر تشریف لے آئے، فرمایا،

"غوثیہ سنتی ہے، چار بجے کا وقت مقرر ہوا ہے نکاح کے لئے !"

غوثیہ نے کہا۔

"بڑی دیر باقی ہے ابھی ۔۔۔۔ اتنی دیر میں تو نہ جانے کیا کیا ہو سکتا ہے !"

آخری الفاظ پر امجد میاں چونکے،

"کیا مطلب ؟ ۔۔۔۔"

وہ بولی،

"مطلب کیا ہوتا ؟"

پھر ہنسنے لگی،

اتنے میں ایک ملازم آیا، اُس نے کہا۔

"ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔

امجد میاں کا چہرہ بدل گیا۔

"مجھ سے کون صاحب ملنے آئے ہیں ؟ انہیں کیا معلوم میں یہاں ہوں ؟ کس کی اجازت سے وہ باغ کے اندر داخل ہوئے ؟ پہریدار نے انہیں کیوں کوٹھی کے اندر گھسنے دیا ؟ ۔۔۔۔ کون صاحب ہیں وہ ؟"

ملازم نے جواب دیا،

"میں نہیں جانتا سرکار ——— وہ موٹر میں آئے ہیں، دو تین آدمی اور بھی ان کے ساتھ ہیں؟ بھلا موٹر کس طرح روکی جا سکتی تھی؟"

اب تو امجد میاں کے آئے گئے حواس غائب ہو گئے۔

"موٹر میں؟ ——— نسیم کے کوئی دوست ہوں گے، آج شادی ہے نا اس کی!"

"جی ہاں شاید یہی سمجھ کر اور موٹر میں بیٹھا دیکھ کر پہرے دار نے بھی نہیں روکا،"

"ٹھیک ہے، تو نسیم میاں سے ملا دو انہیں!"

"لیکن وہ تو آپ سے ملنے پر بضد ہیں!"

"ارے بھئی مجھ میں ایسے کون سے سرخاب کے پَر لگے ہیں کہ مجھی سے ملیں گے نسیم کیا کر رہا ہے؟"

"سرکار وہ تو حمام میں ہیں! ایک گھنٹہ سے کم میں ان کا غسل ختم نہیں ہوگا!"

اتنے میں دھکا دے کر کسی نے دروازہ کھولا، بے ساختہ غزالہ کے منہ سے خوشی کی چیخ نکلی!

"فرخ بھائی ———"

سلمیٰ اس کی طرف لپکی۔

"میرا بچّہ ———"

امجد میاں فرخ کو دیکھ کر سٹ پٹا گئے،

"تم؟ ———"

فرخ نے آگے بڑھ کر کہا۔

"جی ہاں میں ——— آپ کو اعتراض ہے کچھ میرے حاضر ہونے پر؟"

امجد میاں نے فرمایا۔

"پرائے گھر میں گھسنے کی اجازت تمہیں کس نے دی؟"

فرخ نے نہایت اطمینان سے کہا۔

"میرے ساتھ سپرنٹنڈنٹ پولیس اور انسپکٹر حلقہ بھی آئے ہیں، نسیم صاحب گرفتار ہو چکے ہیں۔ اب آپ کی باری ہے۔ مسلح پولیس کی ایک لاری باغ کی دیوار کے پاس کھڑی ہے، اگر آپ مقابلہ کرنا چاہیں تو یہ ہوس بھی پوری کر لیجئے دیکھ لیجئے، میں بھی (جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول نکالتے ہوئے) غیر مسلح نہیں ہوں اور تنہا کئی ایک کا مقابلہ کر سکتا ہوں ——— آپ نے مجھے دھوکے میں رکھا، مجھے فیروزآباد آنے سے غزالہ کا نام لے لے کر روکا، میرے خط جو میں نے اماں اور غزالہ کو لکھے آپ نے پھاڑ پھاڑ کر پھینک دیئے، دوکان کا سارا سرمایہ آپ نے برباد کر دیا، لاکھوں روپیہ آپ نے اڑا دیا، لاکھوں کا مال بیچ کر آپ کھا گئے، ہزاروں کی قیمتی اور گراں بہا چیزیں ٹرک پر رکھ کر آپ رحمت پور لے گئے، آپ نے میری ماں کو دھوکا دیا، اور ان دونوں کو خلاف قانون مقاصد کے لئے حبس بے جا میں رکھا، آپ نے غبن کیا، آپ نے چوری کی، آپ نے خیانت مجرمانہ کا ارتکاب کیا، اب میری باری ہے، میں بتا دوں گا غبن کی سزا کیا ہوتی ہے، خیانت کا انجام کیا ہوتا ہے، فریب کاری کا پھل کیسا ہوتا ہے اور ——— ایک معصوم لڑکی اور ایک بے بس خاتون کو حبس بے جا میں رکھنے کے نتائج کتنے ہولناک ہوتے ہیں، آپ کے ہاتھ پاؤں آپ کے خلاف بہت بڑا ثبوت جرم ہیں!"

امجد میاں کے بدن پر تھرتھری طاری ہو گئی، چہرے پر مردنی چھا گئی، آنکھوں کے نیچے اندھیرا آگیا، ایسا معلوم ہوا کہ تیورا کر گر پڑیں گے، کرسی کا اگر سہارا نہ لے لیتے تو گر ہی پڑے ہوتے، انہوں نے رکتے رکتے کہا۔

"میں زیر حراست ہوں نسیم گرفتار کر لیا گیا؟"

فرخ نے جواب دیا۔

"بدقسمتی سے آپ کا خیال صحیح ہے ———"

امجد نے اس طرح جیسے کوئی خواب میں بک رہا تھا۔

"اس بڑھاپے میں یہ دن بھی دیکھنا تھا، میرے منہ پہ کالک لگے گی، میں جیل جاؤں گا، میرے اور میرے بیٹے کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، پاؤں میں بیڑیاں

پڑیں گی، لوگ ہنسیں گے، مذاق اڑائیں گے، طنز کریں گے، میرا گھر ویران ہو جائے گا، میری جائیداد برباد ہو جائے گی ــــ بیٹے فرخ، کیا یہ نہیں ہو سکتا (نسیم کی سزا) بھی مجھی کو مل جائے اُسے رہا کر دو، میں اپنی اور اس کی سزائیں بھگت لوں گا، میرا کیا، آج مرا کل دوسرا دن، وہ ابھی جوان ہے، اسے ابھی زندہ رہنا چاہیئے، اس کا مستقبل برباد نہ کرو۔"

فرخ نے کہا۔

"افسوس اب معاملہ میرے ہاتھ سے نکل چکا ہے، اب میں کچھ نہیں کر سکتا۔ پولیس فیصلہ کر لے گی۔"

کرسی کی پُشت سے امجد میاں نے ٹیک لگالی۔

"مجھے عدالت کا ہر فیصلہ منظور ہے، کوڑے سے لے کر پھانسی تک لیکن اپنی جوانی کا صدقہ، اپنے مرحوم باپ کا صدقہ اپنی شریف ماں کا صدقہ نسیم کو رہا کر دو، میں اپنے لئے کوئی رعایت نہیں چاہتا، صرف نسیم کے لئے چاہتا ہوں، اس ٹھوکر سے وہ سنبھل جائے گا، اپنے باپ کے انجام سے وہ سبق لے گا، ــــ رحم کرو بیٹے خدا تم پر رحم کرے گا۔"

"یہ کہہ کر امجد میاں نے جیب سے رومال نکالا، منہ پر رکھا، اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے ــــ شاید زندگی میں آج پہلی مرتبہ وہ سچے دل سے روئے تھے۔

غزالہ آگے بڑھی اس نے فرخ سے کہا۔

"تایا جی کو اور نسیم کو ان کے کئے کی سزا مل گئی، اس کے بعد انتقام کی منزل شروع ہوتی ہے، میں انتقام لینا نہیں چاہتی، آپ آگئے، آپ مل گئے، ہم نے سب کچھ پالیا، ہمیں سب کچھ مل گیا، اس خوشی کے دن اس مبارک موقع پر انتقام کا خیال بھی اپنے دل میں نہیں لانا چاہتی ــــ"

فرخ نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھا اور پوچھا۔

"آخر تم کیا چاہتی ہو؟"

وہ کہنے لگی،

"تایا جی کو چھوڑ دیجئے اور نسیم کو رہا کرا دیجئے، نہ انہیں پولیس کی حراست میں

یہاں سے جانا چاہیئے، نہ اُن پر مقدمہ چلنا چاہیئے، نہ حوالات وغیرہ کا مرحلہ پیش آنا چاہیئے۔"

فرخ نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"لیکن پولیس ــــــ"

غزالہ نے کہا۔

"اگر پولیس یوں نہیں مانے گی تو میں بیان دے دوں گی کہ میں اپنی مرضی سے تبادلۂ آب و ہوا کے لئے یہاں آئی تھی، نہ کوئی مجھے دھوکا سے یہاں لایا، نہ حبس بے جا میں مجھے رکھا گیا، چچی جان آپ سے زیادہ مجھے چاہتی ہیں، وہ میرے بیان کی تردید نہیں کرسکتیں، وہی کہیں گی، جو میں کہوں گی، یقین نہ ہو تو پوچھ لیجئے!"

سلمٰی نے کہا۔

"ہاں بیٹے غزالہ سچ کہتی ہے، بہت ہو چکا اب اس معاملہ کو یہیں ختم ہو جانا چاہیئے!"

فرخ بے بسی کے ساتھ گویا ہوا۔

"اچھا کوشش کرتا ہوں (امجد سے) آپ یہیں تشریف رکھیئے، میں ابھی آیا!"

فرخ کے جانے کے بعد امجد میاں کی جان میں جان آئی، انہوں نے سلمٰی اور غزالہ سے کہا،

"میرے منہ پر تھوکو، مجھے جوتے لگاؤ تو شاید میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو۔!"

غزالہ نے کہا۔

"تایا جی ایسی باتیں نہ کیجئے، بے شک آپ نے جو کچھ کیا، اچھا نہیں کیا، لیکن میں اُسے بھول جانا چاہتی ہوں، آپ بھی فراموش کر دیجئے ــــــ!"

اتنے میں فرخ نسیم کو ساتھ لئے ہوئے آیا، اس نے غزالہ سے کہا۔

"بھئی معاملہ طے ہو گیا، اب نسیم صاحب آزاد ہیں!"

امجد نے اُٹھ کر فرخ کو گلے سے لگا لیا، اس کی پیشانی چومی،

"بیٹا زندگی بھر اس احسان کو یاد رکھوں گا!"

فرخ نے کہا۔

"تایا جی ایمان کی بات یہ ہے کہ اگر یہ احسان ہے تو غزالہ کا ہے، میرا دل تو نہیں چاہ رہا تھا! ــــــ لیکن اب سوچتا ہوں تو مجھے خوشی ہوتی ہے، بہرحال آپ ہمارے بزرگ ہیں!"

پھر اس نے سلمٰی اور غزالہ سے کہا۔

"اب چلنا چاہیئے!"

غزالہ اُٹھ کھڑی ہوئی،

"آؤ غوثیہ ــــــ تایا جی اگر آپ اجازت دیں تو غوثیہ اور مرتضٰی کو میں لے جاؤں؟"

تایا جی کو کیا عذر ہو سکتا تھا،

"شوق سے میری بیٹی، شوق سے (غوثیہ سے) کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہے جا!"

غوثیہ مسکراتی ہوئی ساتھ ہو گئی،

ایک کار میں سلمٰی اور غوثیہ بیٹھیں، آگے کی سیٹ پر مرتضٰی اور ڈرائیور، دوسری پر غزالہ اور فرخ!

(۷)

آج غزالہ کی سالگرہ ہے، بہت دنوں کے بعد آج پھر صمد لاج کا ویرانہ رشکِ گلستان نظر آرہا ہے، غزالہ کی سہیلیاں صبح ہی سے آگئی ہیں، طرح طرح کے دلچسپ پروگرام بن رہے ہیں، غزالہ بہت خوش ہے، اسے خوش دیکھ کر اسکی سہیلیاں بھی خوشی سے پھولی نہیں سماتیں، ریڈیو، موسیقی اور فلمی تبصرہ کے بعد غزالہ کے دور ابتلا پہ باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، بلقیس نے کہا۔

"کیوں غزالہ اگر واقعی تمہاری شادی زبردستی نسیم کے ساتھ کر دی جاتی تو تم کیا کرتیں ؟"

غزالہ نے جواب دیا۔

"زہر کھا لیتی! ——— میں نے فیصلہ کر لیا تھا!"

خورشید آرا نے پوچھا،

"خیر وہ تو جو کچھ ہونا تھا ہو گیا یہ بتاؤ، تم نے فرخ صاحب کو انعام کیا دیا؟ اگر وہ عین وقت پر نہ پہنچ جاتا تو کیا ہوتا؟ کیا تم ان کی شکر گزار نہیں ہو؟"

غزالہ کہنے لگی،

"کیوں نہیں ہوں؟ میرا رواں رواں ان کا شکر گزار ہے!"

روبینہ نے کہا۔

"تو پھر ان سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟ ——— آخر کسی نہ کسی سے

کرنی ہی ہے شکر یہ بھی ادا ہو جائے گا اور کام بھی بن جائے گا !"
غزالہ نے جواب دیا،
"گر تو لوں ـــــ لیکن تم پر رحم آتا ہے !"
بلقیس نے سوال کیا،
"کیوں روبینہ پر رحم آنے کی وجہ ؟"
غزالہ بولی،
"یہ بیچاری اس غم میں خودکشی کر لے گی !"
سب سہیلیاں ہنسنے لگیں، روبینہ بگڑ گئی ۔
"واہ یہ بھی کوئی مذاق ہے ؟ اگر کوئی سُن لے تو کیا ہو ؟"
غزالہ نے جواب دیا،
"پھر تو مشکل آسان ہو جائے گی، یعنی بہت جلد تمہاری مراد بر آئے گی !"
نجمہ نے پوچھا،
"فرخ صاحب ہیں کیسے آدمی ؟"
روبینہ بول پڑی،
"بڑے اچھے، ـــــ جی چاہتا ہے بس دیکھتے ہی رہو ! ـــــ وہ حسن ہیں تام خدا اور ہی کچھ ہے"
بلقیس نے دوسرا مصرعہ پڑھ دیا ـــــ انداز نرالا ہے ادا اور ہی کچھ ہے ـــــ کیوں غزالہ ـــــ ؟"
غزالہ نے کہا،
"ابھی بلائے لاتی ہوں، جی بھر کے ان کے حسن و جمال اور انداز و ادا کا نظارہ کر لو، میرے پیچھے کیوں پڑی ؟ میرے نزدیک تو وہی ہیں جو تھے !"
روبینہ نے پوچھا،
"کیا تھے ؟"
بلقیس بولی،
"جو ہیں !"

روبینہ نے سوال کیا،

"کیا ہیں ؟"

بلقیس نے جواب دیا،

"جوتھے۔"

پھر سب سہیلیاں زور سے ہنس پڑیں،

رات کو بڑی دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا، پھر سب سے پہلے بلقیس اُٹھی،

"بہت دیر ہوگئی بھئی!"

اس کے ساتھ روبینہ اور خورشید اور نجمہ بھی اُٹھ کھڑی ہوئیں،

"ہاں بھئی اب چلنا چاہیئے!"

سہیلیوں کو رخصت کرنے کے بعد غزالہ اپنے کمرہ میں آئی، جیسے چودھویں کا چاند جیسے نئی نویلی دولہن ــــــ وہ آئینہ کے سامنے کھڑی اپنے جلوۂ بے محابا کا نظارہ کر رہی تھی کہ کسی کی آہٹ محسوس ہوئی، اس نے مڑ کر دیکھا تو فرخ کھڑا تھا، فرخ کو دیکھ کر وہ شرما سی گئی، اس نے تپاک کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا۔

"آیئے ــــــ آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں ؟"

فرخ آکر بالکل اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا، اس نے ایسے لہجہ میں جو درد اور سوز سے بھرا ہوا تھا، کہا،

"غزالہ آج میں اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے آیا ہوں اور وہ تمہارے ہاتھ میں ہے، تم اندازہ نہیں کر سکتیں، میں کیسی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوں؟ بعض وقت تو ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے میرے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی ــــــ میں تمہیں چاہتا ہوں، لیکن چاہت کا اظہار نہیں کر سکتا، میں تم سے محبت کرتا ہوں لیکن یہ لفظ زبان پر نہیں لا سکتا، تم میری زندگی ہو لیکن اتنی مجال کہاں کہ یہ بات کہہ سکوں!"

غزالہ ہنس پڑی ــــــ "سب کچھ تو کہہ چکے، پھر بھی کچھ نہیں کہہ سکتے، ــــــ نہ جانے یہ بھولا پن ہے یا ہوشیاری؟"

فرخ نے بڑی بے بسی کے ساتھ کہا۔

"تم بھی ہنستے ہو میرے حالِ زار پر، رونا ہے یہی!"

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں آب گوں ہو گئیں، غزالہ بیتاب ہو کر آگے بڑھی اس نے کہا،

"آخر آپ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ دل صرف آپ کے سینہ میں ہے — اس سے آگے غزالہ کچھ نہ کہہ سکی، خود بخود اس کی آنکھیں جھک گئیں، اس کا چہرہ تمتما اٹھا،

یہ منظر دیکھ کر فرخ کی جان میں جان آ گئی اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"غزالہ تم نے مجھے نئی زندگی بخشی ہے!"

وہ بولی، — "ایسا نہ کہئے نئی زندگی آپ نے مجھے دی ہے، اگر ان ظالموں کے پنجہ سے آپ مجھے نہ چھڑاتے تو آج میں قبر میں ہوتی! — آپ نے مجھے نئی زندگی دی ہے، اب میں زندگی سے پیار کرتی ہوں، اب میں زندہ رہنا چاہتی ہوں، اب مجھے زندگی میں دلکشی محسوس ہوتی ہے، اتنا کچھ آپ سے پانے کے بعد بھی اب میں تو کسی چیز کو اپنا نہیں سمجھتی، آپ ہی مالک ہیں ہر چیز کے!"

بیقراری اور خوشی کے عالم میں فرخ نے کہا، — "غزالہ!"

اور پھر وفورِ جذبات نے اس کی زبان بند کر دی، وہ کچھ نہ کہہ سکا!

وہ واپس جانے کے لئے مڑا دونوں کی آنکھیں ایک مرتبہ پھر ملیں، اس طرح کہ دونوں نے اپنی اپنی جگہ محسوس کر لیا۔

تم ہمارے ہم تمہارے ہو گئے، — دونوں کے دلوں میں محبت کی چنگاری سلگتی رہی، سلگتی رہی، رفتہ رفتہ وہ شعلہ بن گئی، اور یہ اسی شعلہ کی آنچ تھی، جس نے غیرت کا پردہ جلا کر رکھ دیا!"

چند اچھے ناول

آبلہ پا (آدم جی انعام یافتہ) رضیہ فصیح احمد
متاعِ درد ——— "
تپتی چھاؤں ——— "
سدرہ ——— زبیدہ سلطانہ
جوہر ——— "
نذرانہ ——— "
فیروزہ ——— "
طاہرہ ——— "
ابرِ بہاراں ——— "

چند اچھے ناول

ہمسفر ـــــ قمر نقوی
کشید بہار ـــــ "
ہمنوا ـــــ "
مسافر ـــــ "
چیتوں کی وادی ـــــ "
رازداں ـــــ راشدہ قمر
ندیا کو بہنے دو ـــــ فریدہ چوہدری

عظیم تاریخی ناول

القاہرہ	محمد سعید
بغداد	"
مدینۃ الیہود	"
اشبیلیہ	"
اطلس	"
ہمایوں	"
بحری عقاب	"
اکبر اعظم	"
پاکستان کا سٹالن گراڈ	"
الموت	"